

فہرست مضامین

| نمبر شمارہ | عنوانات | صفحہ نمبر |
|------------|---|-----------|
| ۱ | اضافی سرورق | ۱ |
| ۲ | فوٹو سید العلماء سرکار سید علی نقی صاحب قبلہ | ۲ |
| ۳ | انتساب بقیدت | ۶ |
| ۴ | حالات زندگی علامہ نقن صاحب از ذی الاجتہاد کی قبلہ | ۷ |
| ۵ | سرکار سید العلماء کراچی میں! | ۹ |
| ۶ | پیغام از علامہ نقن صاحب قبلہ بنام وصی خاں | ۱۲ |
| ۷ | پیغام کا اصلی عکس | ۱۳ |
| ۸ | کتاب کے بارے میں! | ۱۵ |
| ۹ | تقدیم از علامہ شیفتہ صاحب | ۱۷ |
| ۱۰ | کربلا کا تاریخی واقعہ | ۲۵ |
| ۱۱ | حرم رسول سے سفر اور حرم خدا میں پناہ! | ۲۹ |
| ۱۲ | شہادت حسین کے اسباب | ۳۷ |
| ۱۳ | مقصد حسین | ۶۹ |
| ۱۴ | عزائے مظلوم | ۵۸ |
| ۱۵ | حیات ابدی | ۶۲ |
| ۱۶ | حسینی اقدام کا پہلا قدم | ۶۸ |
| ۱۷ | عزائے حسین کی اہمیت | ۷۵ |
| ۱۸ | معراج انسانیت | ۸۱ |

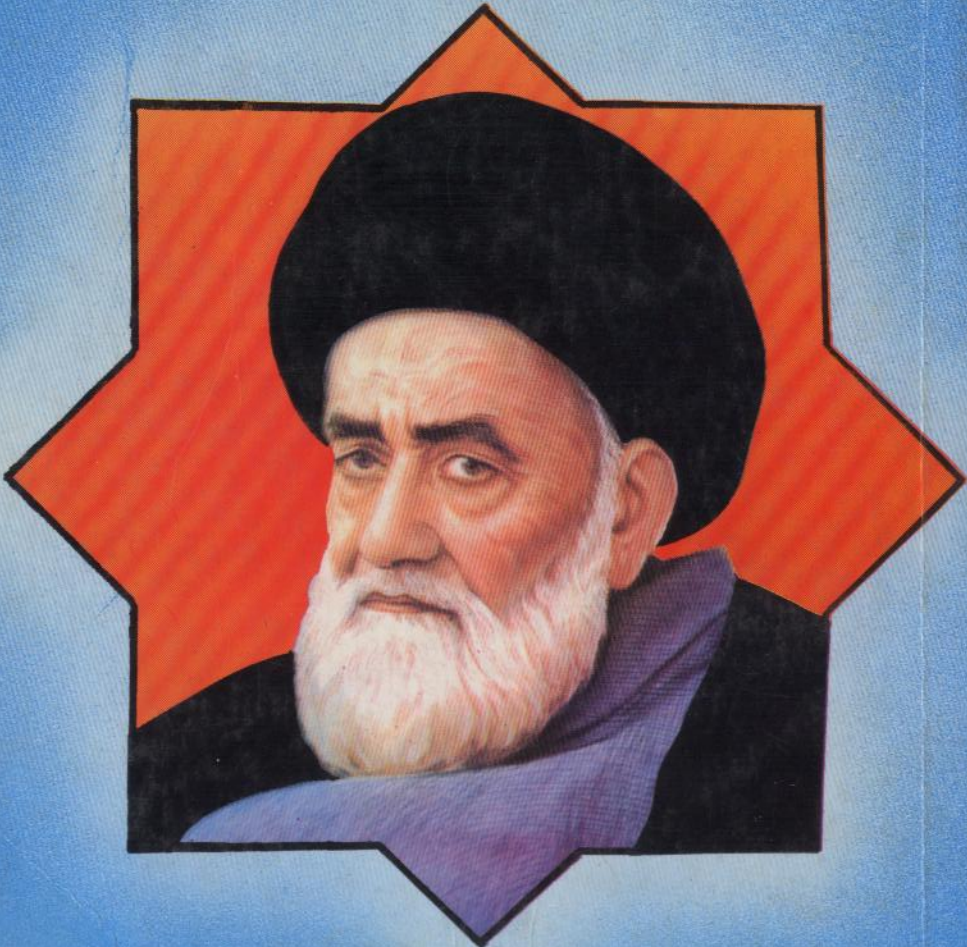
| نمبر شمارہ | عنوانات | صفحہ نمبر |
|------------|---|-----------|
| ۱۹ | بین الاقوامی شہید العظیم | ۸۷ |
| ۲۰ | مسلمانوں کی حقیقی اکثریت | ۹۴ |
| ۲۱ | خاندان ہاشم کی قربانیاں | ۹۸ |
| ۲۲ | توحید اور امام حسین علیہ السلام | ۱۰۲ |
| ۲۳ | قتیل العبرۃ | ۱۰۴ |
| ۲۴ | زندہ جاوید کا ماتم | ۱۰۹ |
| ۲۵ | اگر واقعہ کربلا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ | ۱۲۶ |
| ۲۶ | ڈوبے کو تنکے کا سہارا | ۱۳۷ |
| ۲۷ | انتقام خون حسین | ۱۴۷ |
| ۲۸ | واقعہ کربلا اور پردے کی اہمیت | ۱۵۲ |
| ۲۹ | اسلامی نظریہ حکومت اور حسین ابن علی | ۱۵۸ |
| ۳۰ | سجاد بزرگ کربلا | ۱۷۵ |
| ۳۱ | شہید کربلا کی خاندانی خصوصیات | ۲۲۶ |
| ۳۲ | حسین اور اسلام | ۲۴۹ |
| ۳۳ | حسین کا اقدام عمل خالص تبلیغی شان رکھتا تھا | ۲۶۳ |
| ۳۴ | شہادت زار کربلا | ۲۷۹ |
| ۳۵ | امام منتظر | ۲۸۶ |

بیان تسکین زینب حصہ اول و دوم سلسلہ وار مجالس
کابے مثال مجموعہ ایک ذایاب تحفہ ہے۔ (فاستر)

عظمت حسینؑ

مقالات سید العلماء

علامہ سید علی نقی نقوی



انتساب عقیدت!

دل کی تمام گہرائیوں، دماغ کی تمام وسعتوں، رُوح کی تمام بالیدگیوں اور عقیدت و شوق کی تمام ایمانی کیفیتوں کے ساتھ یہ ہدیہ دلا اور نذرانہٴ عقیدت امام آخر صاحب العصر و زمان وارث رسول کی خدمت بابرکت میں پیش کرتا ہوں اور انھیں جناب کے نام ناجی و اسم گرامی سے معنون کر کے مستدعی ہوں کہ اس ہدیہ حقیر فقیر عاصی پر معاصی کو شرف قبولیت بخشا جائے تاکہ قبول عام ہو اور مجھ گنہگار کی آخرت کا توشہ ہو کہ مغفرت کے کام آئے۔ آخر میں اپنے مولا کی بارگاہ سے اپنے والد بزرگوار جناب محمد کبریٰ خاں مرحوم کی مغفرت کے لئے دست بردعا ہوں۔ (محمد وحی خان)

نام کتاب _____ عظمت حسین یعنی مقالہ سید العلماء
 ناشر _____ رحمت اللہ بک اچینسی بمبئی بازار کراچی
 قیمت کتاب _____ روپیے۔ لعداد طباعت _____ ۱۱۰۰ کتاب

مرتبہ محمد وحی خان

کنہ طباعت _____ ستمبر ۱۹۸۰ء۔ طباعت _____ سندھ آفسٹ پریس

کتابت :- سید محمد یوسف رهنوی

کتاب ملت کا پتلا

- (۱) محفل ہیدری ناظم آبادیہ کہ اچھی
- (۲) احمد بکٹ پو رهنویہ سوسائٹی "
- (۳) محفوظ بک ڈپو امام بارگاہ مارن روڈ "

آیت اللہ صدر المجتہدین سرکار سید العلماء سید علی نقی صاحب قبلہ مدظلہ العالی کے تالیفات

سرکار صدر العلماء علامہ سید ذکی الاجتہادی ارشدی عالم بقیہ روحانی کے قلم سے!
 ولادت - ۲۶ / رجب ۱۳۲۳ھ

نسب - علی نقی ابن ممتاز العلماء مولانا سید ابوالحسن ابن حجر الاسلام مولانا سید محمد امیر ایٹم فردوس مکان، ابن ممتاز العلماء مولانا سید محمد نقی جنت مآب ابن سید العلماء مولانا سید حسین علیین مکان ابن خضران مآب مولانا سید دلدار علی نقوی نصیر آبادی۔

ساتھ ہی تین سال کے تھے سفر عراق میں اپنے والد کے ہمراہ ہوئے۔ پانچ برس کی عمر میں زید قبہ حضرت امیر المؤمنین بسم اللہ ہوئے۔ اور اس کے بعد ہندوستان واپس آئے تو لکھنؤ اور الہ آباد کی یونیورسٹیوں سے اعلیٰ درجات حاصل کیں جسکی تفصیل یہ ہے۔

سند الافاضل - صدر الافاضل جامعہ سلطانہ
 فاضل - ممتاز الافاضل ناظمیہ کالج
 فاضل ادب لکھنؤ یونیورسٹی
 عالم الہ آباد یونیورسٹی
 دوبارہ سفر عراق ۱۹۲۶ء (۱۳۴۵ھ)

اس دور کے جید علماء سے استفادہ حاصل کیا۔ اور درس خارج کی سلسلے میں سرکار آقا میرزا حسین قاسمی۔ سرکار آقا سید ابوالحسن اصفہانی اور سرکار آقا ضیاء عراق۔ اور درس سطحی کے لئے آقا میرزا ابوالحسن مشکینی اور آقا سید ابوالقاسم قبلہ کے سامنے زائے ادب تہ کرنے کا شرف حاصل کیا۔
 ۱۹۳۲ء (۱۳۵۰ھ) تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہی سے جاری

تھا واق سے والیسی پر محافظہ سندھ سے اہل ہندوستان کے قلوب کو حرارت ایمانی سے گرماتے رہے۔

۱۳۵۱ھ میں امامیہ مشن لکھنؤ کی بنیاد ڈالی۔

۱۹۳۳ء میں لکھنؤ یونیورسٹی میں لیکچرار کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی اور ۱۹۵۹ء تک اپنے علم و ادب کی روشنی سے طالبان علم و ادب کے دل و دماغ کو منور کرتے رہے۔ نامور شاگردوں میں مولانا لیتھرائٹ صاحب، مولانا سعید مجتبیٰ حسن صاحب کامر پوری، جناب حیات اللہ الفزاری طریقی (آواز لکھنؤ) بہت مشہور ہیں۔

۱۹۵۹ء میں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ (شعبہ دینیات شیعہ) سے وابستہ ہوئے۔ اور ۱۹۶۷ء تک اپنی خدمات سے علی گڑھ یونیورسٹی کو سرفراز فرماتے رہے۔

۱۳۵۹ھ میں آپ نے ادارہ سینزدہ سالہ یادگار حسینی لکھنؤ کی بنیاد رکھی۔

اب علامہ موصوف نے علیگڑھ میں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے اور اپنے علم سے ستمع علم کے پروانوں کی خدمت میں منہمک ہیں۔

آپ کی تصانیف بے شمار ہیں۔ اپنے اپنی تحقیق اور زور قلم سے تعلیمات اہلیت کی تشہیر بے مثال طور پر فرمائی ہے۔ اور آپ کے پناہ مقبولیت بلاشبہ لازوال نخب اہلیت کا نتیجہ ہے۔ پاکستان میں ان کے شاگردوں میں سب سے اہم شخصیت مفتی جعفر حسین صاحب قبلہ ہیں۔

سرکار سید العلماء کریم جی میں

تقریباً ۱۴ سال کے بعد آیت اللہ سرکار سید العلماء علامہ سید علی تقی صاحب مدظلہ العالی عرف نقی صاحب قبلہ دوبارہ پاکستان تشریف لائے۔ ۱۴۰۰ھ کا چھ ماہ گذرنا نزد محفل خراسان علی متقی جعفری کے گھر میں بٹھا۔ اس کے بعد عشرہ ثانی مسجد و امام باہگاہ آل عبا فیڈرل بی ایمریا میں پڑھا۔ اور بہت شہداء کر بلا کے ماتم داروں اور اہلبیت اطہار کے نجاتیوں کی طرف سے استعداء کا سلسلہ شروع ہوا تو پھر کراچی کی ہر مشہور امام باہگاہ اور تقریباً ہر شیعہ مسجد میں انتہائی یادگار مجلسیں پڑھیں۔

علامہ موصوف کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ پابندی کے ساتھ ان کی مجلسوں میں شریک ہونے والا بھی ان کی تقریر سے سیر نہیں ہوتا بلکہ خود کو تشہیر تقریر ہی محسوس کرتا ہے سچی اسلوب بیان اور فصاحت و بلاغت تقریر کی کامیابی ہے اور یہ وہ ذرات ہے جس سے علامہ موصوف کو قدرت نے مالا مال کر دیا ہے۔

علامہ موصوف ان چند بلند شخصیتوں میں اس وقت سرفہرست ہیں جن کے بیان دل افزوں سے کچھ حصہ تقریر دل دماغ میں بٹھ جاتا ہے اور سننے والا معلومات کا ذخیرہ دامن میں بٹور کر اٹھتا ہے۔ محمد و آل محمد کی تعلیمات پر کار بند رہنے کا عہد و پیمانے انداز سے تجدید کی منزل کرنا ہے۔ ایمان کی پیرمردگی تازگی سے بدل جاتی ہے۔ اور بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ نقی صاحب قبلہ آج کی دنیا میں یقیناً "عالم بالمل" کی صف میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔

علامہ نقی صاحب کی مجلسوں میں سچی عقیدے کے لوگ بڑی کثرت سے شریک ہوتے اور بڑی عقیدت سے مجلس کے اختتام تک پوری توجہ سے تقریر کا ایک ایک لفظ سننے اور اپنی کتابت اور دلی کا بیوت فراہم کرتے ہوئے کہتے

کہ عالم ہو تو ایسا۔! اگر مسلمانوں کے دو عظیم گروہوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کو اپنا اسلامی فریضہ سمجھے۔ اور اپنی شکر بری کی خاطر اپنے سخت الفاظوں سے دو بھائیوں کے درمیان اختلاف کی خلیج کو وسیع بنانے سے گریز کرے۔

میں نے علامہ نقی صاحب قبلہ کی مجلس کے اختتام پر ایک صاف گوشتی دوست کو یہ بھی کہتے ہوئے سنا کہ — ”یہ شیعہ عالم بلا مبالغہ ہمارے نزدیک شیعہ سنی اتحاد کے لئے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کہ اچھی میں سکونت پذیر علماء کو اگر اتحاد بین المسلمین سے محبت ہے تو انھیں انتہائی صفائی قلب کے ساتھ آیت اللہ سرکار علامہ سید علی نقی صاحب قبلہ مدظلہ العالی کے اسلوب بیان کو اپنا کردار کی سبب اہم ضرورت شیعہ سنی اتحاد، کو زیادہ سے زیادہ استحکام بخشنا چاہیے۔ اور یہ ان کا اسلامی فریضہ ہے۔“

علامہ موصوف نے دوران قیام، کراچی کے ایک صاف سمقرے علاقے گلشن اقبال میں ایک مسجد کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس کے بعد عالم آباد قردوس کالونی کے عقب حسن کالونی میں امام بارگاہ ام البنین کی رسم تہنیت ”سنگ تعمیر“ معرفت جناب آغا جواد حسین صاحب قبلہ بتاریخ ۲۲/ ۱۲/ ۱۳۸۵ھ میں ادا فرمایا۔ مذکورہ امام بارگاہ ام البنین کے بانی جناب سید غفور حسین نقوی ہیں انھیں اس تقریب میں سید العلماء کو قریب سے نہ صرف دیکھنے بلکہ گفتگو بھی کرنے کا موقع ملا۔ مجھے بھی اس موقع پر دیگر مواقع سے کچھ زیادہ گفتگو کے لئے وقت ملا۔ میں نے سید العلماء سے عرض کیا کہ آپ کے اہم تبلیغی مضامین سے ہمارا عقیدہ اور ہمارا قومی وقار و البتہ ہے جو پاکستان کے رسالوں اور اخبارات میں وقتاً فوقتاً چھپتے رہے ہیں ان سے سب کو جمع کیا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں تمام مضامین

کو یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کر دوں کیونکہ ان مضامین کی زیادہ سے زیادہ تشریح سے قومی امنگوں میں قابل قدر حد تک اضافہ ہوگا۔ اور واقعات کو بلائیں نیز امام حسین علیہ السلام اور ان کی عظیم قربانی کے اثرات کی سچی داستان کے مطالعہ سے نوجوانوں کے دلوں میں دینی خدمات انجام دینے کی ایسی تڑپ پیدا ہوگی جو وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اس وقت بہت ضروری ہے تو انکا چہرہ و فوٹو مشر سے متمنا تھا۔ فرمایا تم نے خوب بہتر طور پر حالات کا جائزہ لیا ہے۔ اور میری طرف سے پوری پوری اجازت ہے۔

اور — اب — یہ کتاب جو آیت اللہ سرکار سید العلماء، السید علی نقی صاحب قبلہ مدظلہ العالی کے انتہائی اہم مقالات پر مشتمل ہے بغرض (فادہ مومنین وذاکرین پیش خدمت ہے۔

● کاش! علامہ سید العلماء کے مقالات پر مشتمل کتاب ”عظمت حسین“ کے مطالعہ سے قومی حمیت و غیرت کی مردہ رگوں میں جوش عمل کا جنون اکیسا بھر پیدا ہو جائے۔ اور ہم شہداء کے کہ بلا کے پیغام حیات پر مرٹنے کو اپنا مقصود زندگی تصور کر لیں۔ آمین!

جناب سید غفور حسین نقوی نے سرکار سید العلماء کو امام بارگاہ ام البنین کی رسم تہنیت سنگ کے اختتام پر ایک عبا اور عمامہ بطور نذرانہ شکر پیش کیا جسے علامہ نے خندہ پیشانی سے قبول فرماتے ہوئے اپنی دعاؤں سے نوازا۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں آیت اللہ، سرکار سید العلماء کی تقابیر بصیرت اور ذمہ سے بار بار مستفید ہونے کے لئے علامہ موصوف کو زیادہ سے زیادہ طویل زندگی عطا فرمائے۔ آمین!

محمد وصی خاں
صدر مرکز تنظیم عرب (جسٹریٹ) کراچی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ



پیغامِ نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم

صدر مرکزی تنظیم عزاہ حبشہ کراچی

بعضی خدمت، والاہر تبت، کیوال نفعت، بر جیس حشمت، کہ کب
تابندہ بخت فصاحت۔ باہ درخشندہ جبین بلاغت، نیز اعظم سپہر خطابت
تاجدار ذی وقار، اقلیم طلاق، سلطان التکلمین، صدر المجتہدین الہادی والاعتمادی
سرکار سید العلماء سید علی نقی صانہ اللہ البادی الہادی نے مقالات سید العلماء
کی اشاعت کے سلسلے میں مرتبہ مقالات جناب محمد وحسی خاں کو بذریعہ خط
علیگڑھ سے ایک پیغام ارسال فرمایا ہے۔
مجتہد العصر سرکار علامہ نقی صاحب قبلہ مدظلہ العالی نے لکھا ہے کہ

۱۶/ ستمبر ۱۹۰۰ء
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سلام مسنون!

آپ نے مضامین کا جو انتخاب فرمایا ہے وہ موزوں و مناسب ہی ہوگا
اور اس سلسلے میں آپ نے خدمت دین و ملت کی نیت سے جو کوشش فرمائی ہے وہ
قابل قدر ہے۔ خداوند عالم جزائے خیر عطا فرمائے۔

میرے لئے اصل چیز عادل حکیم کا انتخاب ہے اگر کوئی ایک جملہ کسی ایک
مضمون کا بھی اس کے معیار رضایہ پر پورا اترے تو وہ میرے لئے ذخیرہ
آخرت بن سکتا ہے۔
واللہ ذی التوفیق
علی نقی نقوی

• اصلی تحریر متذکرہ بالا کا عکس سنو ۱۳ بملاحظہ فرمائیے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

۱۶/ ستمبر ۱۹۰۰ء

جناب محمد وحسی خاں کے صدر مرکز تنظیم عزاہ

سلام مسنون۔ آپ نے مضامین کا جو انتخاب فرمایا

وہ موزوں و مناسب ہی ہوگا اور اس سلسلے میں آپ نے

خدمت دین و ملت کی نیت سے جو کوشش فرمائی ہے

قابل قدر ہے

خداوند عالم جزائے خیر عطا فرمائے

میرے لئے اصل چیز عادل حکیم کا انتخاب ہے اگر

کوئی ایک جملہ کسی ایک مضمون کا بھی اس کے معیار

رضایہ پر پورا اترے تو وہ میرے لئے ذخیرہ آخرت بن سکتا ہے

واللہ ذی التوفیق

علی نقی نقوی

متذکرہ بالا سطور کو آپ نے بہتر اور واضح بنا دیا ہے۔

میرے لئے اصل چیز عادل حکیم کا انتخاب ہے اگر کوئی ایک جملہ کسی ایک

مضمون کا بھی اس کے معیار رضایہ پر پورا اترے تو وہ میرے لئے ذخیرہ

آخرت بن سکتا ہے۔
واللہ ذی التوفیق
علی نقی نقوی

کتاب کے بارے میں

زیر نظر کتاب "عظمتِ حسینؑ" تحت الاسلام، سید العلماء علامہ سید نقی عرف لفق صاحب قبلہ النقیوی دام ظلہ کے زبرد قلم کا نیتجہ ہے آپ کی شخصیت اعلیٰ صفات محتاج تعارف نہیں۔ دینِ حقا اور عقیدہ اہلبیت اطہار کے سلسلے میں آپ کی دینی و تبلیغی نگارشات بے مثال امامیہ مشن کھنڈ اور لاہور کے ذریعہ نشر و اشاعت کی منزلیں طے کر کے منظر عام پر آتی ہیں اور سنی رسالت کے پر والوں اور تعلیماتِ امامت پر مڑ مڑنے والوں سے جی کھول کر خراجِ تحسین و آفرین حاصل کرتی ہیں۔ ہم نے انتہائی کاوش اور عرق ریزی سے ان کچھ بے ہوئے بجا ہر ریزوں کو جو بلا مبالغہ اہل علم کے لئے بیش قیمت ہیں زیر نظر کتاب "عظمتِ حسین" میں یکجا کر دیا ہے تاکہ مومنین اور ذاکرین اہلبیت اطہار استفادہ حاصل کریں اور میں اپنی بے بضاعتی و کم مائیگی کے باوجود کسی حد تک اجر رسالت کی ادائیگی کے فرض سے سبکدوش ہو سکوں۔

● اس کتاب میں شامل مضامین میں علامہ موصوف نے "اسلام حقیقی" اور "سچے اسلام" کی تبلیغ کے متعلق تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ بہت سے اہم مقامات پر سے دروغ گوئی اور مبالغہ آمیزی کی مکروہ چادروں کو کھینچ کر ان واقعات اور عوامل کی نشان دہی انتہائی واضح اور مختصر انداز میں فرمائی ہے جن سے صاف طور پر ثابت ہے کہ اسلام کی صحیح شکل اور اس کے سچے عقیدے پر کامزن رہنے کے لئے ضروری و لازم ہے کہ تعلیماتِ آلِ محمد یعنی اہلبیت اطہار کے عقائد کی بھر پور پیروی ہی "مومن" کا مقصود زندگی ہونا چاہیے۔
ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سچے اسلام، کو پہچاننے اور



سید العلماء عالم شباب میں



حقیقی اسلامی اھولوں کی پیروی کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین!

● زیر نظر کتاب سرکار علی نقی قبلہ کی مخصوص طرز نگارش کا ایک ایسا آبدار آئینہ ہے جس میں دشمنان اہلبیتؑ اور یزیدیت کے پرستاروں کے لکھنؤ والی گندگی و غلاظت میں لٹ پٹ کر دار کا مکہ وہ چہرہ — اور آل محمدؑ کی سچی پرستی کی سچی تصویر انتہائی نمایاں طور پر آپ کے متاہد میں اس انداز سے آئیگی کہ آپ بیساختہ بیکار اٹھیں گے۔

شاہ ہست حسین، بادشاہ ہست حسین
دیں ہست حسین۔ دیں پناہ ہست حسین
سرداد نہ داد، دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لالہ ہست حسین

● بحجت الاسلام حضرت علامہ سرکار السید علی نقی النقیوی مدظلہ العالی کی بلاغت دل میں اچھبھ جائے دلی عام فہم مثالیں۔ روزمرہ کی زبان کا لطف، اردو زبان کا لوح اور چاشنی کا تذکرہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ سبوح کہ چراغ دکھانا کیونکہ ہم اس دور میں موصوف نقن صاحب کو ایک عظیم سرپرست اور دور کہیں تو ہرگز غلط نہ ہوگا کیونکہ لکھنؤ اگر کہو اور ہے تو اس کہو اور اردو کی عظمت اور وقار کو بھار کے موجودہ اردو دشمن دور میں اس حقیقت سے انکار کر سکی جرات نہیں ہے کہ اس کے لئے باعث صداقت علامہ موصوف کی ہی شخصیت ہے ان کے ہی علم دینی، نے عظمت اہلبیت اطہارؑ کی روشنی سے دشمنان اہلبیت کی آنکھوں میں چمکا چوند پیدا کر دی ہے۔ بلاشبہ سرکار علی نقی مدظلہ العالی کی ذات گرامی ہماری قوم کے لئے سرمایہ مدافعتی ہے مرجع تقلید ہے میری دعا ہے کہ سید محمد رسول اللہ محمدؐ کے ایک سایہ ہمارے سر پر قائم و دائم رہے۔ آمین!

خادم اہلبیت محمد وصی خاں۔ صدر انجمن نامہ الزوار جسر طر
صدر مرکز تنظیم زوار جسر طر

باسمہ سبحاننا

لقد کم!

استاد محترم محقق عصر عالی مرتبت پروفیسر علی حسنین شیفتہ ایم اے تاج الافاضل

سید الشہداء امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی راہ حق میں عظیم الشان قربانی، وفدِ نیاہ بنی عظیم کی عملی وواقعی تفسیر ہے آپ کی شہادتِ عظمیٰ کو جس حیثیت سے بھی دیکھئے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک بے مثال ثابت ہوتی ہے۔ اللہ کی راہ میں پیش کی جانے والی قربانیوں کو عقلی اعتبار سے چار معیاروں پر پرکھا جاسکتا ہے۔ پہلا معیار یہ کہ جس نے قربانی دی وہ خود کتنا بلند و بال عظمت بندہ پروردگار تھا۔ دوسرا معیار یہ کہ جس مقصد کے لئے قربانی دی وہ کتنا عظیم تھا۔ تیسرا معیار یہ کہ قربانی کی راہ میں کتنے مصائب اور کتنی مظلومیت سے گزرنا پڑا۔ اور چوتھا معیار یہ کہ جس مقصد کے لئے قربانی دی گئی اس میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی۔

پس سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کی شہادتِ عظمیٰ کو اگر پہلے معیار سے دیکھنا چاہیں تو معلوم ہوگا کہ آپ اپنے جد و پدر اور ماد پروردگار کے بعد اسلامی نقطہ نظر سے ساری کائنات کے افضل ترین بندہ پروردگار تھے۔ کیونکہ تمام مسلمانوں کے نزدیک یہ بات متفقہ طور پر تسلیم ہے کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جملہ مخلوقات خدا میں افضل ترین مخلوق ہیں۔ اور آدمؑ نبی آدمؑ کو جو کچھ شرف حاصل ہوا وہ آنحضرتؐ ہی کے طفیل اور ان ہی کے واسطے سے ملا۔ اس لئے کہ قرآن مجید کی تصریح

کے مطابق جناب رسالت مآب ہی رحمتہ اللعالمین بھی ہیں اور جملہ عالمین کو
 غلاب الہی سے ڈرانے والے بھی ہیں اس طرح اللہ نے جملہ عالمین پر آپ کی
 اطاعت کو فرض قرار دیا ہے اور جملہ عالمین پر آپ کو لائق و اقتدار
 عطا فرمایا ہے جب آنحضرت کی یہ شان معلوم ہو گئی تو قرآن مجید پی کی
 ایک دوسری آیت محکمہ یعنی آیت مباہلہ کی تلاوت کیجئے تو امام حسین
 علیہ السلام کے اُس عظیم الشان مقام کا علم حاصل ہو گا جو اللہ نے اُن کے
 جَد و پدرا اور مادر و پردار کے علاوہ عالمین میں کسی کو بھی عطا نہیں فرمایا
 واضح رہے کہ آیت مباہلہ یعنی فَمَنْ حَبَّابَةَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ
 مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَى أَنْتُمْ أَنْبَاءُ خَالِدَاتٍ وَأَنْبَاءُ كِهْرٍ وَأَنْبَاءُ خَا
 لِدَاتٍ كِهْرٍ وَأَنْبَاءُ خَا لِدَاتٍ كِهْرٍ وَأَنْبَاءُ خَا لِدَاتٍ كِهْرٍ
 اللہ علیٰ الْكَافِرِينَ "اُن آیات محکمہ میں سے ہے جس کی تفسیر و تاویل
 میں جملہ مسلمانوں کی تسلیم شدہ کتب حدیث و تفسیر وغیرہ کے اعتبار
 سے ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہے۔ آیت کرم کا اردو ترجمہ یہ ہے کہ "پس
 اے رسولؐ اب اگر آپ سے کوئی عیسیٰ کے بارے میں کج بختی کرنے کے بعد
 اس کے کہ آپ کے پاس اُن کے بارے میں علم آچکا ہے تو آپ کہہ دیجئے
 کہ اہرم اپنے بیٹوں کو بلا تے ہیں اور تم اپنے بیٹوں کو، ہم اپنی عورتوں
 کو اور تم اپنی عورتوں کو، اور ہم اپنی جانوں کو اور تم اپنی جانوں کو، پھر ہم اور
 تم آپس میں مباہلہ کریں۔ اور اللہ کی لعنت کا ذمہ اُن کے گروہ پر قرار
 دیں۔" یہ آیت محکمہ بجز انی عیسائیوں کے وفد کو دعوت مباہلہ دینے کی
 غرض سے نازل ہوئی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کو دعوت مباہلہ
 دے کہ دوسرے روز صبح اپنے بیت الشرف سے یوں برآمد ہوئے
 تھے کہ لفظ انباءؑ کی عملی تفسیر پیش کرتے ہوئے امام حسن اور امام حسین
 علیہما السلام کو اپنے ساتھ لئے ہوئے تھے۔ لفظ "انباءؑ" کی تفسیر

کے لئے حضرت فاطمہ زہرا علیہما السلام کو بھی ساتھ لے لیا تھا جو سر تا قدم
 چادر میں ملبوس آپ کے پیچھے پیچھے چل رہی تھیں اور لفظ "انفسنا"
 کی تعبیر میں حضرت علی مرتضیٰ علیہ افضلۃ والسلام کو اپنے اس مختصر قافلے
 میں شامل کر لیا تھا جو حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہما کے پیچھے چل رہے تھے۔
 غالباً اس لئے کہ خاتونِ خاندانہ نبوت کو نبوت و امامت کی حفاظت
 میں لے چلیں اور غالباً اس لئے بھی کہ آیت کرمہ میں الفاظ کی جو ترتیب
 تھی وہ عملی تفسیر میں بھی قائم رہے۔

محدثین و مفسرین اسلام کا اس امر پر اتفاق ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ
 علیہ وآلہ وسلم اس موقع پر مذکورہ ہستیوں کے ہوا کسی اور کو اپنے
 ساتھ مباہلہ کرنے کے لئے نہیں لے گئے۔ اور ان مبارک و برگزیدہ ہستیوں
 کو دیکھ کر عیسائیوں کے وفد نے اپنی شکست قبول کر لی اور مباہلہ نہیں
 کیا۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ عیسائی وفد کے ساتھ صرف مرد تھے
 نہ اُن کی عورتیں اُن کے ہمراہ تھیں نہ اُن کے بچے۔ اور یہ حقیقت ہر ایک کو
 معلوم تھی۔ لیکن اللہ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ اپنے بیٹوں، اپنی عورتوں
 اور اپنی جانوں (یعنی ایسے لوگ جو تمہاری جان کے برابر ہوں) سب کو
 ہمراہ لے کر مباہلہ کے لئے نکلو۔ ظاہر ہے کہ اس حکم سے اللہ کا بس یہی مقصد
 تھا کہ فرزندانِ نبوت و رسالت، خاتونِ خاندانہ نبوت و رسالت اور
 نفسِ رسول کا ہمیشہ کے لئے تقارف ہو جائے اور اپنے پرانے سب ہی
 یہ دیکھ لیں کہ امام حسن اور امام حسین علیہما السلام فرزندانِ نبوت
 و رسالت ہیں، جناب صدیقہ طاہرہ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہما خاندانہ
 نبوت و رسالت کی خاتون ہیں اور امیر المؤمنین حضرت علی مرتضیٰ علیہ
 السلام و سلمہ علیہ نفس رسول ہیں۔

کتاب و سنت رسول کے اس متفقہ فیصلے کے مطابق امام حسین

علیہ السلام فرزند رسول ہیں یعنی اس رسولِ عالمین کے فرزند ہیں جو تمام عالمین کا سید و سردار ہے لہذا وہ اپنے جد و پدر اور مادر و برادر کے بعد تمام عالمین سے افضل و برتر اور اپنے دورِ امامت میں تمام عالمین کے حاکم و مولیٰ تھے۔ پس اُن کی شہادت اُن کی شخصیت کے اعتبار سے یقیناً پورے عالمین میں سب سے بڑی شہادتِ عظمیٰ ہے۔

مخصوصاً اس لئے کہ رسول اللہ نے اُن کے خون کو اپنا خون فرمایا تھا اور اُن کو اپنی ذاتِ مطہرہ کا جزو قرار دیا تھا۔ برادرانِ اہل سنت کے عظیم الشان محدث جناب شاہ عبدالعزیز دہلوی نے اپنی مشہور کتاب ”سُرُ الشہادَاتین“ میں امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کی شہادتوں کو درحقیقت جناب رسالت مآب کی شہادت قرار دیتے ہوئے فہرستِ جناب رسالت مآب کا تذکرہ تسلیم کیا ہے۔

جہاں تک دوسرے معیار یعنی مقصدِ شہادت کی عظمت کا تعلق ہے تو سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کی شہادتِ عظمیٰ کا مقصد اُس صحیح و حقیقی دینِ اسلام کو باقی و زندہ رکھنا تھا جس کی تبلیغ و تعلیم میں حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت خاتمِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں کی زندگیاں صرف ہوئی تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر پورے عالمین میں کوئی اور مقصد نہیں ہو سکتا۔ یزید بن معاویہ دینِ اسلام کو غیر مسلم کی حیثیت سے نہیں بلکہ مسلمان بن کر مسخ و تباہ کر رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو حکومت کا سربراہ ہی تصور نہیں کرتا تھا بلکہ وہ اپنے کو غلط طور پر اللہ کے اس دینِ برحق کا سربراہ ظاہر کر رہا تھا جسے امام حسینؑ کے جدِ مجد رسول اللہ نے تجلیل کی حد تک پہنچایا تھا۔ یزید اُس حکومتِ الہیہ کا عہدیدار تھا جو صرف اللہ کی طرف سے اُن کے مقرر کئے ہوئے نمائندوں یعنی نبی و امام مخصوصِ مین اللہ ہی کو ملتی ہے۔ اس طرح یزید اپنے بے باکانہ طرزِ عمل سے دینِ اسلام کے

صنیا دی اھو لوں کو لڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی لئے اُس نے وارثِ رسول فرزند نبوت و رسالت حضرت امام حسین علیہ السلام سے اپنی بیعت کا مطالبہ کیا تھا۔ ایسے موقع پر اگر امام حسین علیہ السلام خاموش رہ جاتے یا بغرض محال اُس کی بیعت کر لیتے تو دینِ اسلام کی حقیقتیں انسانیت کا نگاہوں سے اوجھل ہو جاتیں اور سارے انبیاء و مرسلین کی محنتوں پر پانی پھیر جاتا۔ لہذا امام حسین علیہ السلام نے اس شانِ مظلومی سے انکارِ بیعت کیا اور سخت ترین مصائب کو برداشت کر کے اس طرح اپنی اور اپنے سارے اصحاب و اولاد کی شہادت کو پیش کر دیا کہ قیامت تک آنے والے انسانوں کو ادنیٰ سے تدبیر و تفکر کے بعد معلوم ہو جائے کہ صحیح و حقیقی دینِ اسلام میں حکومتِ الہیہ کا کیا تصور ہے اور یہ کہ اللہ کے مقرر کئے ہوئے نمائندوں یعنی مخصوصِ مین اللہ اماموں نے کبھی بھی کسی کی بیعت نہیں کی یعنی ہرگز کسی کو اپنا ہادی و امام نہیں تسلیم کیا کیونکہ اللہ نے جس کو خود ہادی و امام بنایا ہو وہ اپنے دور میں کسی دوسرے کو ہادی و امام تسلیم ہی نہیں کر سکتا۔ لہذا معلوم ہوا کہ سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کے سامنے جو عظیم الشان مقصد تھا اُس سے بڑھ کر کوئی اور مقصد ہو ہی نہیں سکتا۔

جہاں تک تیسرے معیار یعنی کثرتِ مصائب و شدتِ مظلومیت کا تعلق ہے تو ذرا تاریخِ اسلام اور تاریخِ انسانیت پر نظر رکھنے والوں کے لئے روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔ امام حسین علیہ السلام نے اللہ کی راہ میں کیا کیا مصیبتیں نہیں اٹھائیں۔ عالمِ غربت میں اپنے پورے گھرانے کے ساتھ دریا کے کنارے ہوتے ہوئے کبھی تین دن کی بھوک پیاس میں عاشورہٴ محرم کی صبح سے لے کر وقتِ عصر تک بچے بوڑھے اور کڑھیل جو انوں کا شہید ہونا دیکھتے رہے۔ ایک ایک کی لاش میدان سے لاتے رہے

یہاں تک کہ ششما ہے بیچے علی الصغر کی شہادت بھی اپنے ہاتھوں پر دیکھی اور
آئینہ کار شہر ملعون کے تیز سے سجدہ الہی میں گزر دن گنا کہ شہادت عظمیٰ
کی منزل پر فائز ہو گئے۔ لیکن آل رسول پر مصائب و مظالم کا سلسلہ جاری
رہا۔ شہادت کے بعد جسم اطہر کھوڑوں کے سسوں سے پامال ہوا اور کس
اقدس کو نیزے پر چڑھا کر بے مقنع و چادر سیدائشوں کے پیراہ کو ذرہ و ستام
کے بانڈروں میں پھیرا گیا اور ابن زیاد و یزید کے درباروں میں پیش
کیا گیا۔

میں معلوم ہوا کہ اس معیار سے بھی امام حسین علیہ السلام پورے عالمین
میں سید الشہداء ہیں اور آپ کی شہادت، شہادت عظمیٰ ہے۔

اس کے بعد جہاں تک چوتھے معیار یعنی مقصد شہادت میں کامیابی
کا تعلق ہے تو جس طرح امام حسین علیہ السلام کو اپنے مقصد یعنی صحیح و حقیقی
دین اسلام کی بقا میں حاصل ہوئی اسی طرح زاہد خدا کے کسی اور شہید
کو نہ آپ سے پہلے کامیابی حاصل ہوئی نہ آپ کے بعد کسی کے لئے ممکن
ہے۔ یہ سید الشہداء علیہ السلام کی ان کے مقصد میں کامیابی ہی کا نتیجہ
ہے کہ آج لوزع بشر کے لئے صحیح و حقیقی دین اسلام کو سمجھنے کے راستے
کھلے ہوئے ہیں۔

امام حسین علیہ السلام اپنے اصحاب و اقارب کے ساتھ شہید
ہو گئے لیکن ان کے نانا کی سچی تعلیم کو زندہ رہنے کا موقع مل گیا
امام حسین علیہ السلام کی شہادت اور آل رسول کی اسیری و مظلومی کا
یہ ائمہ ہوا کہ اس وقت کی اسلامی دنیا ایک شدید صدمہ کے ساتھ جرت
و غفلت کی گہر کانینہ سے چونک اٹھی اور اس وقت سے لے کر آج تک
اور قیامت تک لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ آخر فرزند رسول نے
اتنی عظیم الشان قربانی کس مقصد کے لئے پیش فرمائی۔ اور اسی بحث میں

حقیقی اسلام تک پہنچنے کی راہیں کھلتی ہیں۔

امام حسین علیہ السلام کی شہادت عظمیٰ بیک وقت وجود خدا کی بھی
دلیل ہے اور یوم قیامت کی بھی علامت ہے۔ آپ کی شہادت آپ کے
نانا، ان کے دین اور ان پر نازل ہونے والی کتاب قرآن مجید سب کی
تصدیق و تائید کے لئے کافی ہے۔ دیکھیے ایک آزاد خیال شاعر
حضرت جوش ملیح آبادی کی سیخو بھورتی کے ساتھ اس حقیقت کو بیان
فرماتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔

ہاں وہ حسین جس کا ابد آشنائیاں
کہتا ہے گاہ گاہ حکیموں سے بھی یہ بات
یعنی درون پر وہ صدر نگ کا ثبات
اک ذی شعور ذہن ہے اک کار ساز ذات

سجدوں سے کھینچتا ہے جو مسجد کی طرف
تنہا جو اک اشارہ ہے مسجد کی طرف

اور یہ بیخبر منہ کے مشہور و معروف صوفی بزرگ جناب خواجہ حسین الدین
چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ نے امام حسین علیہ السلام کے مقصد کی کامیابی
کو یوں بیان فرمایا ہے۔

شاہ است حسین ، بادشاہ است حسین
دین است حسین ، دین پناہ است حسین
سر دادند اد دست درد دست بہ تہ لیلہ
حقاً کہ بنا کے لالہ است حسین

معلوم ہوا کہ اس معیار سے بھی امام حسین علیہ السلام سید الشہداء
ہیں، آپ کی شہادت، شہادت عظمیٰ ہے اور وہی تفسیر ذبح عظیم ہیں۔
نہیں نظر کتاب جناب سید العلماء علامہ سید علی نقی کھنوی مظلوم العالی

کے اُن مضمائین پر مشتمل ہے جو امام حسین علیہ السلام کی شہادتِ عظیمیہ پر آپ نے مختلف اوقات میں کتب فرمائے۔ فاضل مولف جناب محمد وضی خاں صاحب نے ان متفرق مضامین کو جس خوبصورتی کے ساتھ سلسلہ وار جمع فرمادیا ہے وہ آپ کے علم اور حسن ذوق کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اس طرح جناب محمد وضی خاں صاحب نے ایک طرف تو حضرت سید الشہداء روحی لہ الفدا کی بارگاہ میں اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کیا ہے۔ اور دوسری طرف جناب سید العلماء مدظلہ کے لئے بھی اپنی بے اندازہ محبت کا ثبوت دیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اہل علم اُن کی محنتوں کی داد دیں گے۔ اور بارگاہ نبوت و امامت میں اُن کی یہ کوشش سچی مشکوٰۃ قرار پائے گی۔ داکٹر دینار ان الحمد للہ رب العالمین و صلی اللہ علی محمد وآلہ الطاہرین:-

دستخط

علامہ علی حسنین شفیقہ

۲۹ اگست ۱۹۸۰ء

کراچی



کربلا کا تاریخی واقعہ

واقعہ کربلا کی وہ تاریخی حیثیت جو سطحی نظروں سے دیکھنے میں چند سطروں کے اندر ختم ہو جاتی ہے اور زیادہ اختصار سے کام لیا جائے تو شاید چند جملے اس عظیم حادثہ کو بتلانے کے لئے کافی ہوں۔ افسوس اس ہے کہ اسلامی تاریخوں نے اس واقعہ کو نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

کربلا کا واقعہ نہ زم بزم سوزہ و گدازہ کے تاثرات کا مجموعہ نہیں بلکہ انسانی کمالات کے جتنے پہلو ہو سکتے ہیں اور نفسانی امتیازات کے جو بھی امراہ حکم ہیں ان سب کا ختمینہ دار ہے۔ علم تہذیب الاخلاق کلبرطے سے بڑا ماہر اور قانونی تمدن و معاشرت کا کامل ترین عالم ان واقعات سے اسی طرح سبق حاصل کر سکتا ہے جس طرح حقائق لائبرٹ کا بڑا محقق اور فلسفہ مترجمیت و انکام کا فقیہ منتہی۔

حسین اور ان کے انصار نے روز عاشورہ صبح سے عصر تک کی قلیل مدت میں وہ کام کیا ہے جس کی نظیر عالم میں نہ ان سے قبل ممکن ہوئی اور نہ ان کے بعد ہو سکتی ہے کہ نہ وہ صرف اپنے جسموں کو مخالف فوج کی خون آلود تلواروں کی نذر نہ کر کے اپنی جانیں نثار کر رہے تھے لیکن حقیقتاً انھوں نے عالم انسانیت کو مسح کر لیا اور دنیا کے علم و عمل دونوں پر قیامت تک کے لئے سکہ قائم کر گئے انھوں نے اس دن زندگی کے ہر شعبہ کی تکمیل کی اور کمال انسانیت کا کوئی باب ایسا نہیں تھا جس کا نمونہ پیش نہ کیا ہو۔ علم الاخلاق کے جامع ترین کتابوں کا مطالعہ کر جاؤ۔ علم النفس کے حقائق و امراہ کے کسی مسلم استاد سے تعلیم حاصل کرو، اجتماعی و معاشرتی آداب اور انسانی فضائل کی مشق پورے اُمعیانہ ترقی پر پہنچا دو اور

معرفت الہیہ و حقائق الہیہ کو تسلیم کرنا اور اس پر حاویہ کرنا اس کے بعد نہ کہ بلا کی اس چند گھنٹے کی تحقیقات کا ایک محققانہ نظر سے جائزہ لے لو تم کو وہاں وہ سب مل جائے گا جو ان تمام کمالات کا حاصل اور نتیجہ کہا جاسکتا ہے تم دیکھو گے جو کچھ مانتا تھا وہ لفظیں تھیں اور ان کے معنی یہ ہیں۔ سید الشہداء اور ان کے جانشین سپاہیوں کا ہر طرز عمل اور اس دن ایک اسماء و رمود کا خزانہ تھا کہ جس میں اخلاقی تمدن و معاشرتی اجتماعی نفسانی خصوصیات و کمالات کے نامعلوم کتب پہلو مضمون تھے۔ ان کے کسی ایک فعل کو سامنے رکھ کر مشکل سے مشکل مسائل علم النفس کے حل کئے جاسکتے اور بلند ترین انسانی کمالات حاصل کئے جاسکتے ہیں۔

نجات قدم، استقلال، خودداری، صدق و امانت، صفائی و اخلاص، صبر و ضبط، حق پرستی و حق پروری، عدل و انصاف، رحم و مروت، جذبہ کرم و یاریابی، سخی ترین وقت پر عبور و عبودیت کے مخصوص دوا بط کی نگرداشت و تکرار و تخیل، نوع بشر کی خیر خواہی، مساوات و ہمدردی و عفو و کرم سخاوت و سخاوت اپنے مقدس اور سچے لقب العین کی آرزو و وقت تک حمایت تمام حجت، مواظب و نصیحت، تبلیغ و دعوت، نفس کی عالی حوصلگی، بلند ہمتی اگر صرف چند حرفی لفظوں کا نام نہیں بلکہ ہر ایک ان میں سے فلسفہ اخلاق یا علم النفس، حقائق الہیہ یا اسرار و تشریح کا ایک مستقل اور مفصل مبسوط باب ہے تو یقیناً کربلا کے واقعات محقق نہیں بلکہ بہت طوفانی ہیں اور اگر ان کے تاسخ و اسباب پر غائر نظر ڈالی جائے تو وہ یقیناً چند صفحات میں لکھنے کے نہیں بلکہ دفتر کے دفتر اور کتابوں کی کتابوں کے لئے لازم ہیں۔

وہ وقت کہ جب ہاشم اور امیہ میں عبید مناف کے انتقال کے بعد نزاع ہوئی اور فیصلہ ہاشم کے حق میں امیہ کے خلاف ہوا، اسی زمانہ سے عداوت و فساد کی آگ تھکی جو امیہ کے دل میں مجبوری دلا جا رہی کے پردے میں سگ رہی تھی اور وہی وراثت اولاد تک پہنچی دشمنی اور

عداوت کی آگ مشتعل ہوتے ہوئے کسی ایک فریق کی ظاہری ترقی اور رفعت و بلندی دوسرے فریق کے لئے گرتی ہوئی بجلی کا کام دیا کرتی ہے۔ وہ تھے کہ جس کے باطن دو کجیت و یک دل دوستوں میں اختلاف پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ چہ جائیکہ عداوت پہلے سے موجود ہو اور اس وقت کوئی ایک فریق کسی بلند مرتبہ تک پہنچا ہوا دکھائی دے تو اس وقت عداوت کے شعلوں کا سینے میں بھڑک کر دہن سے نکلتا اور اس کے تاہیک و تار دھوئیں سے آتش کیوں کے سامنے عالم کا سیاہ ہو جاتا کوئی یقین نہیں ہی امیہ کے لئے ہاشمی خاندان کی وہ عورت و وجاہت جو ملک عرب میں پائی جاتی تھی آتش حسد کے مشتعل کرنے کے لئے کیا کم تھی کہ خالق حکیم نے اپنی خدائی کے محتار کل اور دنیا و آخرت کے عظیم فرمانروا سر کائنات نبی آخر الزماں کی ولادت کے لئے ہاشمی خاندان کو منتخب کیا۔

رسالت کی تحریک کی روز افزوں ترقی اور اس کے آخری نتیجہ کو ہی امیہ کے بزرگ خاندان ابوسفیان کی نظر میں پہلے ہی روز سے ناگہنی تھیں اسی وجہ سے اس نے اپنی راحت و آرام سے ہاتھ دھو کر پوری قوت کے ساتھ اس تحریک کے مقابلہ کی ضرورت سمجھی اور تمام قبائل عرب میں دورہ کر کے ان سب کو آنے والے خطرات سے آگاہ کر دیا اور ان کی ہمدردی کو اپنے لئے حاصل کر لیا۔ لیکن اس کو کیا معلوم تھا کہ اسلامی ترقی کسی ظاہری سانہ و سامان یا خارجی طاقت اور قوت کا نام نہیں ہے بلکہ روحانی قوت کا نتیجہ ہے، اسلامی ترقی کا نور روکنے کے لئے اس کی تمام فوجی طاقتیں اپنے سانہ و سامان سمیت ایسی ثابت ہو رہی تھیں کہ جیسے سیلاب کے زور کو ہتھیلی سے روکا جائے یا آفتاب کے طلوع ہوتے وقت نقطہ مشرق کے سامنے ایک پردہ ڈال دیا جائے کہ چند ہی منٹ میں آفتاب کی روشنی بڑھ کر اس پردہ کے چاروں طرف محیط ہو جائے گی۔

بلکہ وہ آفتاب و احزاب پھر صلح حدیبیہ اور اس کے بعد کے واقعات ہر مرتبہ جان توڑ کر کشش اور نتیجہ میں ناکامی سب کے آخر میں مجبوری

سرتیم ختم کرنے کی ضرورت پڑنا اور دل کی تمام تلاطم خیز عداوتوں کے باوجود اپنے تمام سرمایہ حیات، عزت و آبرو کو دشمن رسالت مآب کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا یہ واقعات ایسے نہ تھے جو دل کی آگ کو خاموش ہو جانے دیتے۔ یہ تمام تاثرات و واقعات اس آگ کے لئے چھینٹوں کا کام دے رہے تھے لیکن پانی کے چھینٹے نہیں بلکہ مٹی کے تیل کے چھینٹے، رسالت مآب کی وفات کے بغیر اس میں پورے ہی ہونا ناگزیر تھی، خلافت کے دوسرے دور میں اسی جماعت کا برسر حکومت آنا ایک بار پھر تاریخ کے اوراق منقلب ہوا تھا اس تخت پر بی بی ہاشم کی سربراہی اور وہ تاریخ پرستی امیرالمومنین کا آجانا اور صفین کا میدان ظاہری معاہدہ اور اس کی خلافت درزی علی ابن ابی طالب کی اولاد سے جو ہمیشہ اس کے مبلغ تھے باطل کو شمش حکومت و سلطنت کو پلینہ خطرہ کا احساس ہونا اور ان تمام کایتیجہ وہ تھا جو کہ بلا میں بی بی امیہ کے ہاتھوں خاندان رسالت کے ظاہری خاتمہ تک منہ نہری ہوا لیکن کیا معلوم تھا کہ جس کو وہ خاتمہ سمجھ رہے ہیں وہ اس خاندان کے حقیقی فروغ کا پہلا دن ہے۔



حرم رسول سے سفر اور حرم خدا میں پناہ

ولید سے گفتگو کے بعد (جس میں اس نے بیعت یزید کا مطالبہ کیا تھا) امام نے مدینہ کو ترک کرنا ہی اپنے لئے ضروری سمجھا یہ خیال کرنا کہ آپ مدینہ ہی میں قیام فرماتے تو مدینہ والے آپ کی حفاظت میں کوئی دقیقہ اٹھانہ نہ رکھتے۔ تاریخ کے مسلسل واقعات سے بے خبری یا ان کے تنازع سے غفلت کا مظاہرہ ہو گا۔

وفات رسول خدا کی کے بعد سے مدینہ پر کچھ ایسے اثرات چھلے ہوئے نظر آتے ہیں جن کی بنا پر یہ تو قعات غلط ثابت ہوئی ہیں۔ آخر یہ مدینہ ہی تو تھا جہاں وفات رسول خدا کے بعد ہی حضرت فاطمہ زہرا پر مصائب کی یونٹیں تھیں مگر اہل مدینہ کی طرف سے ان کے ساتھ ہمہ بردی کا کوئی مظاہرہ نہیں تاریخ میں نظر نہیں آتا۔ پھر وہ مدینہ ہی تھا جہاں حضرت علیؑ نے گونا گوں دشمن حالات کا چپیس برس تک مقابلہ کیا مگر اہل مدینہ نے ان کے ساتھ کسی بھی محبت و علم خوادری کا ثبوت نہیں دیا۔

اس کے بعد اسی مدینہ میں وہ موقع آنکھوں کے سامنے آیا کہ حضرت امام حسن کے جنازہ کو روضہ رسول پر لے جانے میں مزاحمت کی گئی مگر مدینہ کے لوگوں نے ذمہ بھر بھی اس پر احتجاج نہیں کیا کیا یہ واقعہ ایسا اہم

نہ تھا۔ مدینہ کے جسم میں اگر روح ہوتی تو اس میں حرکت پیدا ہوتی اور کسی قسم کے احساس کا مظاہرہ کیا جاتا۔ یہ تو کہہ بلا کے پوسے کے کچھ نمونے ہیں اور خود اس وقت میں حیرت انگیز مگر ناقابل انکار صورت سے اہل مدینہ کی خاندان رسول کے بارے میں بے حسی کا ثبوت یہ ہے کہ حضرت امام حسینؑ جب شہید ہو گئے اور آپ کے دردناک مصائب و مظالم کا بتفصیل اہل مدینہ کو حال معلوم ہو گیا تب بھی اہل مدینہ نے خون حسینؑ کے انتقام کے لئے کسی بے چینی کا مظاہرہ نہیں کیا اور باوجودیکہ عراق میں مظلوم ہو رہا تھا۔ لیکن حجاز اس بارے میں بالکل خاموش تھا۔

وہ تو امام حسینؑ کی قربانی کا طبعی اثر تھا کہ یزید کی بد اعمالیوں پر نگاہیں متوجہ ہو گئیں اور پھر دوسرے سال یزید نے افعال و اعمال کے تفصیلی حالات معلوم ہونے کے بعد انھوں نے اعلان مخالفت کر دیا جس کے نتیجے میں واقعہ حرمہ ظہر پزیر ہوا جسکی اجمالی تفصیل اپنے محل پر بعد کو آئے گی مگر خود قتل حسینؑ کا جرم ان کو اتنا اہم معلوم نہ ہوا کہ وہ اس کی بناء پر یزید کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہو جاتے۔

پھر اس کے بعد واقعات کا ایک طویل سلسلہ ہے جس میں سادات بنی فاطمہؑ پر بنی امیہ کے آخری دم تک اور پھر بنی عباس کے دور حکومت میں کیسے کیسے ہولناک مظالم ہوتے رہے مگر اہل مدینہ نے کبھی ان کی بڑی امداد نہیں کی۔

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام سے لے کر امام علی نقی علیہ السلام تک تمام وہ مقدس ہستیوں جو اپنے وقت میں خاندان رسولؐ کی حقیقت پر حیرت اور تعلیمات اسلام کی محافظ تھیں اپنے اپنے ابتدائی دور حیات میں اسی مدینہ میں مقیم تھیں پھر میں کسی کو زیر دیا گیا۔ کسی کو مقید کر کے جلا وطن کیا گیا۔ کسی کو ہجر مدینہ سے بلا یا گیا مگر کبھی اہل مدینہ نے اسکی حفاظت کی کوشش نہ کی اور نہ اس پر اہل مدینہ کی کبھی نہیں!

کیا ان ماقبل اور بعد کے واقعات کو پیش نظر رکھنے کے بعد پھر یہ تصور صحیح ہو گا کہ امام حسینؑ مدینہ میں قیام فرماتے تو مدینہ والے آپ کی حفاظت میں جان لٹا دیتے ہرگز نہیں! عام طور سے اہل حجاز کے متعلق ذات مند ان عرب کی رائے یہی تھی کہ وہ مشکلات میں ثابت قدم بہت کم رہ سکتے ہیں۔ بینا کو جب معاویہ نے ابن الکواثر سے مختلف عرب ممالک کے متعلق رائے دریافت کی اور اس میں اہل حجاز کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا "فتنہ انگیزی میں سب سے آگے مگر اس کے نتائج کے برداشت کرنے میں بہت کمزور اور مہمات کے سہ کرنے میں ناکارہ" لے

اس صورت میں حالات اور بعد کے واقعات بتلاتے ہیں کہ اگر امام حسینؑ عاقبت اندیشی کر کے مدینہ رسولؐ کو خالی نہ کر دیتے تو مروان جس نے ولید کو قتل حسینؑ کا مشورہ دیا تھا اور ولید کے اس مشورہ پر عمل نہ کرنے سے سخت برہم ہوا تھا وہی ولید کے ملائم طرز عمل کی اطلاع پر یزید کو دیتا اور اس وقت یزید کا خطاب نامہ ولید کے پاس آتا تو یا تو خود ولید ہی کو پھر عمر سعد کی طرح باوجود اپنے صہنہ کی مخالفت کے مال و جاہ دنیا کی طمع اور سطوت حکومت کے خوف سے حسینؑ کے خلاف اقدام کرنا پڑتا یا کوفہ کے نعمان بن بشیر کی طرح اس کو معزول کر کے مروان بن الحکم یا اسی کے مثل کسی دوسرے سفاک اور سخت ترین دشمن اہلبیت کو مدینہ کا حاکم مقرر کیا جاتا اور فرزند رسولؐ کے خون سے مدینہ کو رسولؐ کی زمین کو گل رنگ بنا دیا جاتا۔

یہ خطرہ بالکل یقینی تھا اور اس نے فعلی حیثیت اختیار کر لی تھی اس خط سے جو ولید نے یزید کے نام لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ "خليفة المسلمين يزيد في خدمت میں ولید بن عقبہ کی جانب سے

گزارش ہے کہ حضرت بن علیؓ آپ کی خلافت کو تسلیم نہیں کرتے اور نہ وہ آپ کی بیعت پر تیار ہیں اب آپ کی جو رائے ہو۔ اس کے جواب میں زید نے لکھا: "اس میرے خط کی تعمیل جلد کرنا تاکہ ان ممتاز افراد کی جنہوں نے میری بیعت کر لی ہے اور جنہوں نے نہیں کی ہے مکمل فہرست جلد بھیجی لیکن اس جواب کے ساتھ حسین بن علیؓ کا سر موجود ہو۔" اس حکم کی گنجی کے مقابلہ میں ولید کہاں ٹھہر سکتا تھا؟ وہ تو اتفاق سے اس خط کے آنے سے پہلے ہی حضرت حسین مدینہ سے روانہ ہو چکے تھے اس لئے ولید تعمیل حکم سے مجبور رہا بلکہ اس کے بعد بھی ولید محبوت ہونے سے نہیں بچا اور ماہ رمضان میں اسے معزول کر کے عمرو بن سعید کی جگہ بھی تک حاکم مکہ تھا مدینہ کا بھی حاکم مقرر کر دیا گیا۔ پھر اگر حضرت امام حسین مدینہ میں شہید ہوتے تو کیا آپ کی شہادت اسی بنا یاں حیثیت کے ساتھ ہوتی جس طرح کہ بلا جا کر ہوتی؟ سیاست حکایت کا یہ تقاضا ہرگز نہ ہوتا بلکہ اسے طرح طرح کے لباس پہنائے جاتے یا تو امام حسن کی شہادت کی طرح کوئی "جمعہ بنت اشعث"، فراہم کی جاتی یا حضرت علیؓ کی طرح کوئی "ابن لمج"، کی طرح کا خابجی جس کے بعد بھی حکومت دمشق کا دامن اس الزام سے بھری ہی ثابت کیا جاتا اس صورت میں حسین واقعتی قتل ہوتے یعنی وہ دنیا سے جاتے بھی اور سلطنت دمشق کے چہرہ پر اسلام و انسانیت کی نقاب پھر بھی پڑی رہتی۔

حضرت امام حسین اس کے لئے ہرگز تیار نہ تھے۔ تادمیر کا اقتضا تھا کہ مدینہ میں قیام اسی وقت کیا جاتا جب مدینہ میں قیام ممکن ہو اور جب بیعت نہیں کرتا تھی تو اپنے رسول، اپنے مقصد اور اپنی قربانی کو اسی افریقہ پر لے جا کر پیش کرنا چاہیے تھا کہ جس پر آپ کو بلا کے میدان میں اٹھائیں لے جا سکے بیٹیک یہ سفر کوئی معمولی سفر نہ تھا وہ کہ بلا کی منزل کا پہلا مرحلہ یا آخرت کے سفر کا پہلا قدم تھا اس لئے یہ رات حضرت امام حسین نے پوری جاگ کر بسر کی۔ اور اسے اپنے نانا (حضرت رسول خدا) ماں (حضرت فاطمہ زہرا) اور بھائی (حسن مجتبیٰ) کے مقدس حرارات سے رخصت ہونے میں صرف کیا۔

کی رات خیمہ ہوئی کھلی آپ مدینہ سے روانہ ہو گئے مدینہ کی صبح آج کے وقت تھی اس لئے کہ حقیقی آفتاب اس آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا اور رسول کی قبر بے چراغ تھی اس لئے کہ رسول کا نذر دیدہ آج صبح کے عزت میں گامزن تھا۔ ۱۰ ماہ رجب کی اٹھائیس تاریخ التذکرہ کی رات تھی جب امام حسین مدینہ سے روانہ ہوئے تھے

اس وقت آپ کی زبان پر یہ آیت تھی

فخرج منها خائفًا يترقب قال سببنا نحن من الظالمين

اس آیت میں موسیٰ کا ذکر ہے اس وقت کا جب وہ فرعون کے ظلم و

تشدد سے بزار ہو کر مہر سے باہر نکلے ہیں۔ روانگی کے بعد امام حسین شاہراہ عام سے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ حالانکہ ابن زبیر اس کے پیلے شاہراہ عام کی چوڑی گریز معروف راستوں سے مکہ کی طرف روانہ ہو چکے تھے۔ یہی مشورہ آپ کو بھی دیا گیا مگر آپ اپنی مدینہ سے روانگی کو فرار کی حیثیت دینے کو تیار نہ تھے آپ نے اس مشورہ پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ نہیں میں تو اسی راستے سے جاؤں گا۔ پھر خدا کو جو منظور ہو۔

آپ نے اپنے دادا ابوطالب کی تمام اولاد کو اپنے ساتھ لیا جن میں آپ کی دو بہنیں حضرت زینب اور ام کلثوم بھی تھیں۔ اس کے علاوہ سب بھائی بھتیجے اور متعلقین آپ کے ساتھ تھے۔ سوا احمد بن حنظلہ کے تھے۔ جو کسی تجوری یا مصلحت سے مدینہ میں چھوڑ دیئے گئے اور

آہانی بنت ابوطالب پیرانہ سالی کی وجہ سے نہ جاسکی تھیں بس ان کے علاوہ اولاد ابوطالب میں سے کوئی بھی حسین کے ساتھ سے جدا نہیں ہوا۔ اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حسین کے ساتھ سبھی ہاشم میں سے ہوا اولاد ابوطالب کے کسی اور سلسلہ کا ایک شخص بھی میدان کر بلا میں نظر نہیں آتا۔

۱۰ طبری ج ۶ ص ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷،

اس طرز عمل سے بھی کہ آپ نے صرف ایسے گھر والوں کو ساتھ لیا ہوا ہے
نمایاں تھا کہ آپ جنگ کے انداز سے روانہ نہیں ہو رہے ہیں مدینہ سے
باہر نکلنے کے بعد امام حسین نے مکہ معظمہ کی طرف رخ کیا۔ اس لئے کہ مکہ میں یزید
کی قدیم روایات نیز اسلام کے محفوض تعلیمات کی بناء پر کسی جاؤر تک کا
قتل بلکہ گھاس تک کا اٹھا کر ناجائز نہیں ہے

امام حسین نے یہاں پہنچ کر اپنے کو ظاہری طور سے ایک محفوظ آنکوش کی پناہ
میں ڈال دیا اور یہاں رہ کر آپ خالصتاً ہی کی زندگی گزارنے لگے نہ امور سلطنت
سے غرض اور نہ مہاجرت ملکی سے کوئی تعلق آپ نے مکہ پہنچ کر بھی نہ کہیں تعلق و
رسائل روانہ کئے اور نہ مختلف اطراف و جوانب سے لوگوں کو اپنی نصرت کی طرف
دعوت دی یہ بھی آپ کے مقصد کے تخمین کے لئے آپ کے کہ داد کا ایک اہم
جز ہے آپ کا مکہ میں ورود مستحب جمہور مشہور سنا ہے کہ یوں ہے

اس وقت آپ کی زبان پر قرآن کی یہ آیت تھی **ولما نوحنا**
تلقا ہمدین والعیسیٰ ربی ان ینھدینی سوا العیبیل لے
یہ بھی حضرت موسیٰ کے واقعہ سے متعلق ہے جب انھوں نے مدین میں پناہ
کی تھی۔

آپ نے مکہ میں پہنچ کر منصب عالی میں قیام کیا۔ عبداللہ بن زبیر آپ سے
دو ایک دن پہلے پہنچ چکے تھے ان کے مکہ میں اچانک پہنچنے کے ساتھ لوگ
ان کے گرد جمع ہونے لگے اور انھیں ایک مرکز بیت سی خواہل ہو گئی تھی
لیکن نصرت امام حسین کے مکہ میں پہنچنے کے ساتھ ہی لوگوں نے عبداللہ بن
زبیر کو چھوڑ دیا اور اب وہ بھرت امام حسین کے گرد و پیش رہنے لگے اس
بات سے عبداللہ بن زبیر کو گونہ ناگوار ہی پیدا ہوئی۔ اور انھیں اندازہ ہو گیا
کہ حسین کی موجودگی میں ان کا کوئی اثر قائم نہیں ہو سکتا۔ مصلحت
وقت کی بناء پر وہ بھی صبح وقت م دوڑوں وقت امام حسین کے پاس آئے جانے لگے

۱۱ صحیح بخاری ج ۲ ص ۲۱۳
۱۲ صحیح مسلم ج ۱ ص ۲۳۹
۱۳ طبری ج ۴ ص ۲۱۵ وارشاد
۱۴ طبری ج ۶ ص ۲۱۲ لے قرآن مجید سورۃ قصص آیت ۲۲ ص الاحبار الطوال
۱۵ ص ۲۳

جب معاویہ کی وفات ہوئی ہے تو مدینہ میں ولید بن عقبہ بن ابی سفیان
کی حکومت تھی اور مکہ میں یحییٰ بن حکیم بن صفوان بن امیہ اور کوفہ میں نعمان
بن بشیر انصاری اور بصرہ میں عبداللہ بن زیاد کو نہ تھا۔ لے
معلوم ہوتا ہے کہ حکومت دمشق کو یحییٰ بن امینان نہ تھا چنانچہ امام حسین
کے مکہ میں پہنچنے کے بعد یحییٰ بن حکیم کو معزول کیا گیا اور عمرو بن سعید
بن عاص بن امیہ کو نہ مقرر کیا گیا ہے پھر جب ولید کے طرز عمل کی اطلاع
اور سنا یہ مردان کی طرف سے بدورٹ یزید کو پہنچا تو ولید کے بجائے

اسی عمرو بن سعید کو مقرر کیا گیا مگر یہ بعد کی بات ہے بعد میں یہ بھی ظاہر ہو گیا
کہ کوفہ کے گورنر کی پالیسی بھی حکومت دمشق کو ناگوار ثابت ہوئی اور
وہاں بھی تبدیلی کی ضرورت پیش آئی اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ امام حسین
کے معاملہ میں یزید کا طرز عمل اتنا غیر منصفانہ اور جاہ حاکم تھا
کہ اسے اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے آدمی نہ ملتے تھے۔ اور خود اس کے گورنر
اس کے احکام کی تعمیل اس کی خواہش کے مطابق نہ کر سکتے تھے۔ عہدیت
حال سے ظاہر ہے کہ بحال حکومت میں سے جو بھی حسین کے ساتھ ذرا
مراعات برتنے کا رجحان ظاہر کرتا تھا وہ فوراً اڑھا دیا جاتا تھا۔ تلاش
تھی ایسے لوگوں کی جو اہلبیت رسول کے ساتھ کسی مراعات کی جگہ
اپنے دل میں نہ رکھتے ہوں اس کے بعد کبھی کیا کہا جا سکتا ہے کہ حضرت
امام حسین کے ساتھ جو کچھ بھی تسلط ہوا اس کی ذمہ داری یزید پر
ہے بلکہ بحال حکومت نہ تھی۔ ؟

اس وقت امام حسین کا مکہ معظمہ میں قیام، ایک پناہ گزین کی حیثیت
سے تھا اور یہی مشورہ تھا جو آپ کو مدینہ سے روانگی کے وقت آپ کے
بھائی محمد بن الحنفیہ نے دیا تھا جسے آپ نے پسند کیا تھا۔ مکہ میں حالات
کے ناسازگار ہونے کی صورت میں کیا ہوگا؟ اس کے متعلق محمد بن حنفیہ

کی رائے یہ تھی کہ اگر وہاں حالات آپ کے موافق نہ ہوں تو آپ نکل جائیے گا
ریگ تانی صحراؤں اور پہاڑوں کے ڈامن میں اور ایک شہر سے دوسرے
شہر میں منتقل ہوتے رہیے گا۔ یہاں تک کہ لوگوں کے حالات کا آخری
نتیجہ سامنے آئے اور اس وقت کوئی قطعی رائے قائم کیجئے۔

آپ کا قیام مکہ میں ظاہری طور پر مستقل حیثیت رکھتا تھا
اور کوئی خاص مقصد آپ کے پیش نظر نہیں تھا سیرا ایک پُر امن زندگی
کے "جیو اور جینے دو" ہی کے لفظوں میں ادا کیا جاسکتا ہے۔ یہاں
آپ نے نہ لڑا اپنی موافقت میں کوئی عسکری طاقت فراہم کی اور نہ
جہاد کو مزید کے خلاف متغزل کیا۔ تقریباً اور کچھ کہہ کر ہی حیثیت سے بھی
ایسی کوئی کوشش ثابت نہیں کی جاسکتی۔ (از شہادت انیت)
(بجوالہ پیام عمل اگست ۱۹۷۷ء)



علامہ ذکی الاجتہادی المرشقی نے سید العلماء کے اجراء میں ایک استقبالیہ دیا جس میں
مولانا شمس باقر صاحب، مولانا علی سرکار نقوی صاحب صدر آل پاکستان ڈاکٹرین ایسوسی ایشن
اور دیگر حضرات نے شرکت کی۔

شہادتِ حسین کے سبب

آپ کو معلوم ہے کہ حسین حضرت محمد مصطفیٰ کے لڑا سے تھے اور حضرت
محمد اس انقلاب کے مرکز تھے جن کا نام ہے اسلام!

"اسلام" سے پہلے عرب کی معاش اور معاشرتی دنیا جس قدر تاریک
تھی اس کا آپ تاریخ میں مثال دے کر کہہ سکتے ہیں۔ مساوات انسانی کوئی چیز
نہ تھی اور غلبہ طاقت اور قتل و کرب و کشتی تھا اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ تھی
کہ ایک بڑے آدمی کے قتل ہو جانے پر صرف اس کے قاتل کو قتل نہ کیا
جاتا تھا بلکہ فریق مخالف کے سینکڑوں آدمی مار ڈالے جاتے تھے تب
سمجھا جاتا تھا کہ خون کا اس کے بدلہ لیا۔ اس کے برخلاف اگر بڑے آدمی
کے ہاتھ سے کوئی چھوٹا آدمی قتل ہو جاتا تھا تو اس کا خون معاف
یہ بڑے اور چھوٹے کی تفریق ہزاروں تمدنی گناہوں کی سرچشمہ
تھی اور انسانیت کے پرچے اڑا رہی تھی ان سب کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے
مادیت کو اپنا معبود سمجھ لیا تھا۔ ماوراء المادہ کا تخیل باقی نہ رہا تھا
اس لئے مادنی امتیاز ہی ان کے نزدیک سب کچھ تھا۔

"اسلام" جو ایک عظیم انقلاب کا حامل بن کر آیا تھا۔ اس نے سب سے
پہلے اس کا اصلی سبب دور کرتے ہوئے لوگوں کی نگاہ کو مادیت کے
احاطے سے آگے نکال کر ایک غیبی طاقت کی جانب متوجہ کیا۔ جس کے لحاظ
سے تمام افراد انسانی یکساں حیثیت رکھتے تھے اور پھر اس نے سابق
کے تمام تفریق اور بلندی کے امتیازات کو مٹا کر نیا امتیاز قائم کیا کہ جو
شخص فریق انسانی کو سب سے زیادہ انجام دیتا ہو وہ سب سے بہتر ہے۔
(ان اکرم مکر عند اللہ القاکم) اس اصول کے ماتحت غلبہ طاقت

اقتدار، قوم و قبیلہ کی زیادتی اور تعداد کی اکثریت یہ تمام باتیں کچھ نہ ہیں اس نے کہا کہ ہر انسان دوسرے کے برابر ہے جب تک کہ انسانیت کے اوصاف میں اپنے تپس اس سے بہتر نہ ثابت کرے۔

اس سے معاشرتی معاشرتی اور تمدنی حالات میں بڑی تبدیلیاں ہو گئیں اسلام نے اس انقلاب کے پیدا کرنے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی بہت سے بلند خاندانوں کے افراد کی شادی کی گئی ان خاندانوں میں جو قدیم زمانہ سے لپیٹے جاتے تھے ایک بلند مرتبہ شخص کے قاتل کے بدلے یہ امر ناممکن ہو گیا کہ سوائے اس کے کوئی دوسرا شخص قتل کیا جائے بہت سی چیز اقوام اور پر دسی انسانوں کو جو اس کے پہلے جانوروں کے برابر سمجھے جاتے تھے ان کے انسانی اوصاف کی بدولت وہ عزت حاصل ہو گئی جو بڑے بڑے خاندانی عربوں کو نہ تھی اور اکثر ہم میں عرب قوم کو سرداری قبول کرنا پڑی ان لوگوں کی جنہیں وہ نسلی حیثیت سے اپنے برابر سمجھتے تھے یا غلبہ اور اقتدار کے لحاظ سے جنہیں وہ کمزور خیال کرتے تھے۔

ہر انقلاب کے بالکل متوازی ایک اور انقلاب شروع ہو جاتا ہے جو انقلاب سے پیدا ہونے والے امتیازات کو مٹا دینا چاہتا ہے اور رجعت پسندی یا قدامت پرستی کے امتیازات کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ اسلام کو اس حیثیت سے ان تمام قبائل کا مقابلہ کرنا پڑا جو اس کے پہلے اپنے تپس غلبہ و اقتدار کا حقدار سمجھے تھے خواہ نسلی تفرق کی بناء پر، خواہ مال و دولت کی بناء پر اور خواہ اپنے قوم و قبیلہ کی بناء پر۔ حضرت محمد مصطفیٰ کو اس سلسلے میں کئی لڑائیاں لڑنا پڑیں جن میں بدر، احد اور احزاب بہت مشہور لڑائیاں ہیں۔

ان میں بنی امیہ کا سردار ابوسفیان بہت آگے آگے تھا اور وہ مخالف جماعت کا سرگروہ تھا۔

ان مقابلوں میں اگر کچھ کامیابی اسلام کو ہوئی مگر ہر کامیابی مخالف کے دل میں

ایک جذبہ انتقام پیدا کرتی تھی اور اس لئے ظاہری فتوؤں کے تو اذن میں سلام اگرچہ سب سے وزنی طاقت بن گیا مگر اس کے خلاف مخالف کا جذبہ باطنی طور پر بہر سنگین تر ہو گیا یہاں تک کہ ایک وہ وقت آیا جب فریق مخالف کی شکست نے ختمہ طور پر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا اور مخالف جماعت کے لوگ یہاں تک کہ خود ابوسفیان اور اس کے خاندان والے اسلام لے آئے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ دبی ہوئی اور شکست خوردہ قوموں کے کچھ نفسیات ہوتے ہیں اسلام سے شکست خوردہ جماعت یعنی بنی امیہ اور ان کے ہواخواہ جب اسلام لے آئے تو ان کی نفسیاتی حیثیت یہ تھی کہ وہ برابر موقع کے منتظر تھے کہ کس طرح ہم اسلام کو نقصان پہنچا دیں اور اگر اس کو ختم نہ کر سکیں تو کم از کم اس کے مقصد کو تبدیل کر کے ان امتیازات کو مٹا دیں جو اسلام نے قائم کئے ہیں۔ اور اس کے پر وہ ہمایں سہی، ان امتیازات کو قائم کر دیں جو اسلام کے پہلے عرب میں قائم تھے۔

پیغمبر اسلام کی زندگی میں ان کے اس مقصد کی تکمیل مشکل تھی مگر پیغمبر کے بعد ان کو اپنے مقاصد کی کامیابی کی کافی توقع تھی۔

پیغمبر اسلام کے بعد اسلامی انقلاب کے محافظ پیغمبر کے درتہ دار ان کے گھرانے والے لوگ تھے جنہیں وہ برابر اپنے کاموں میں شریک رکھتے تھے اور جنہیں انہوں نے اپنے مقاصد سے پورے طور پر مطلع کر دیا تھا اور ان کی عملی تربیت اس طرح کر دی تھی کہ وہ اپنے اقوال و افعال سے ان مقاصد کے ترجمان اور محافظ بن سکیں۔

ان میں اور اس کے متوازی دوسرے انقلاب کے علم برداروں میں کشمکش لازمی تھی اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر دفعہ آزمائش کے وقت آل رسول کے ساتھی کم نکلے۔ اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہا اس کے چہرہ اقتصادی بھی ہیں۔ اور سیاسی بھی۔ نفسیاتی بھی اور ملی بھی!۔

آپ کو پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام قدیم امتیازات کو مٹا کر مساوات کا پیغام لے کر آیا تھا اور اس نے امتیاز صرف فرارکفن انسانی کی بناء پر قرار دیا تھا

مال اور دولت کی اس طرح تقسیم کہ جس میں جانبداری اور عدم مساوات پیدا ہو جائے اسلام کے اصول کے خلاف تھی اور اس کے مخالفین بھی اس کے قریب جاسکتے تھے اس لئے آل رسول کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ خزانہ میں نہ وہ یہ جمع کر کے دولت مند بنیں اور خصوصیت سے ان لوگوں کو نہ وہ جو اہر سے مالا مال کریں جن سے ان کو اپنے اقتدار کے قوی بنانے میں فائدہ کی امید ہو۔ یہاں تو یہ عالم تھا کہ حضرت علیؑ سے ان کے بھائی عقیل تک برگشتہ ہو گئے۔ اس بنا پر کہ وہ چاہتے تھے کہ ان کو تمام مسلمانوں سے زیادہ کچھ دیا جائے اور حضرت علیؑ اس کے لئے تیار نہیں ہوئے پھر جب خاص اپنے بھائی کا یہ عالم تھا تو دوسروں کا کیا ذکر! اس کے برخلاف دوسری جماعت کے لوگوں کو اس کی پرواہ نہ تھی وہ اپنے اقتدار کے قائم رکھنے کے لئے خزانہ کا منہ کھول دیتے تھے اور جس کو اپنے مطلب کی سمجھت تھے اس کو مالا مال کر دیتے تھے اس کے علاوہ اسلام نے ان تمام مقتدرہ ریشیوں اور جماعتوں کے امتیازات کو ختم کر دیا تھا جو اس کے پہلے برسر اقتدار تھیں اور بالکل ایک الگ معیار قائم کیا تھا وہ مقتدرہ جماعتیں آپس میں کتنی ہی رقیبانہ چٹھا کر رکھتی ہوں لیکن اسلام سے زخم خوردہ سب ہی تھیں اس لئے اسلام کے حقیقی مقصد اور قائم کردہ امتیاز کو مٹانے میں ان میں سے ہر ایک کے اقتدار کا قیام مخمور تھا۔ پھر یہ بھی ہے کہ سابق کی شکستوں کا ان سب پر دل پر اثر تھا اور سب ہی میں جذبہ انتقام پایا جاتا تھا اور پھر اتفاق کی بات یہ ہے کہ رسول کے مسلک کے محافظ تمام ایک خاص خاندان (بنو ہاشم) کے لوگ تھے جن سے اکثر بڑے خاندانوں کو پہلے سے حسد اور عناد تھا اس لئے وہ نسلی تعصبات بھی مخالفت پر آمادہ کرتے تھے اور چونکہ عرب میں قبائلی نظام بڑی قوت کے ساتھ قائم تھا ہر قبیلہ کے سردار وہ اور بڑے افراد ان جذبات کی بنا پر جو ابھی بیان ہوئے ہیں جس راستے پر جاتے تھے عوام اور پست افراد اہل قبیلہ ان ہی کی پیروی کرتے تھے کیونکہ عوام کا کوئی نظریہ نہیں ہوتا

نہ ان کی کوئی رائے خصوصاً یہاں کہ جہالت بھی ان میں اس حد تک تھی کہ جو ان ہی کے ساتھ مخصوص تھی۔

بنو امیہ کا اقتدار مسلمانوں میں بحدیث ایک صوبہ دار حاکم کے شروع ہوا انھوں نے اپنے دور حکومت کی ابتداء ہی سے اپنی سیاسی روش مولوکانہ شان و شوکت کی حامل رکھی۔ مسلمانوں کے اقتدار اعلیٰ کی جانب سے اس پر انتہاء ہوا لہذا ایک چالاک اور شاطر سیاست دان کی طرح یہ کہہ کر تسکین کر دی گئی کہ چونکہ شام کی سرحد قیصر روم کے ملک سے ملی ہوئی ہے اس لئے یہاں اسلام کی عظمت قائم رکھنے کے لئے اس طرح کے جاہ و جبروت کی ضرورت ہے اس کے معنی یہ تھے کہ اسلامی انقلاب کی جگہ قدامت پرستانہ انقلاب فوج پانے لگا اور اسلام کی مقررہ حدود کے بجائے دوسرے حدود امتیازات قائم ہو گئے۔

حضرت علیؑ کی خلافت کا مختصر دور تمام تر اسی اموی اقتدار کے مقابلہ میں صرف ہوا جس میں حضرت علیؑ کو بہت محروم کامیابی حاصل ہو سکی۔

حضرت علیؑ کی زندگی ختم ہونے کے ساتھ اس اقتدار میں اور اضافہ ہو گیا یہاں تک کہ حضرت امام حسنؑ کو صلح پر مجبور ہونا پڑا اور اس طرح اپنے مخالف طاقت کے جاہلانہ اعمال کو شراٹھ صلح کے ذریعہ سے محدود بنانے کی کوشش کی مگر حضرت امام حسنؑ کو نہ ہر دے کہ شہید کر دیا گیا اور شرائط صلح کی خلاف ورزی کی جانے لگی اور سیاسی اقتدار کی جرات و بیباکی اس حد پر پہنچی کہ حجر بن عدی اور ان کے بہت سے ساتھیوں کو جو بڑے عابد و زاہد متقی اور نیاں ساتھی تھے بہ تیغ کو دیا گیا اور عمرو بن العاصؑ کا جو اسلامی نقطہ نظر سے بڑا درجہ رکھتے تھے سر قلم کر کے یزید پر بلند کیا گیا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اسلام کا نظریہ روحانیت و ولہیت فنا ہونے لگا اور مسلمانوں میں بھی طاقت حق ہے کا عملی طور پر کلمہ بڑھا جانے لگا حق پرستی ختم ہوئی۔ آزادئی ضمیر رخصت ہوئی ایمان اور اعتقاد دروپیلا اور سہارے سکوں پر بیجا

جلنے لگا اور مادی اقتدار کے طاقت کی پرستش ہونے لگی۔
یہ حالات کبھی بھی برداشت کئے جانے کے قابل تھے اگر معاویہ کی جانب سے اس شرط کی مخالفت نہ ہوتی کہ ان کو اپنے بعد کسی جانشین کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔

امام حسین نے بڑی عاقبت اندیشی اور انجام بینی سے یہ شرط قرار دی تھی مگر اموی سیاست اپنے مقاصد کے لحاظ سے ناممکن رہتی اگر اس شرط پر عمل کر لیا جاتا اس لئے معاویہ نے اپنے بعد کے لئے اپنے بیٹے یزید کو ولیعہد بنایا اور صرف تاہر نہ ہی نہیں کیا بلکہ تمام عالم اسلام سے بڑی کوشش کے ساتھ یزید کی بیعت حاصل کی گئی۔

یزید کے افعال و اعمال اگر وہ نہ کبھی ہوتے جو عام طور سے ہر شخص کو معلوم تھے تب بھی اس کو ولیعہد بنانا شرائط صلح نامہ کے خلاف ہونے کی بنا پر ناجائز تھا مگر مسلمانوں میں اقتدار و طاقت سے مراد بیت اس درجہ بڑھ گئی کہ کسی کو اس پر توجہ نہ ہوئی اور توجہ ہوئی بھی تو اظہار کی جہارت نہ تھی۔

اہل بیول میں اس وقت بزرگ ہستی حضرت امام حسین کی تھی۔ آپ بنو امیہ کے طرز عمل کو شہرت سے محسوس کر رہے تھے کہ وہ کس طرح اسلام کے بنیادی مقاصد کے خلاف ہے اور کس طرح دنیا کو رجعت پسندی اور قدامت پرستی کی طرف لے جا رہا ہے۔ پھر بھی وہ اس کے متوقع تھے کہ شاید یہ صورت حال معاویہ کی زندگی کے اختتام کے ساتھ ختم ہو جائے مگر یہ اس انقلابی سیاست کی آخری چال تھی کہ شاہان خود مختار کی طرح اپنے بعد کے لئے اپنے بیٹے کو بغیر اس کے اوصاف کا لحاظ کئے ہوئے نامزد کر دیا آپ نے اس کو شہرت سے محسوس کیا اور اندازہ کیا کہ آپ پر کیا فرض عائد ہوتا ہے۔

معاویہ بھی سمجھتے تھے کہ اس معاملے میں سب سے زیادہ متعلق النہام حسین ہیں اس لئے انھوں نے آپ کو ملانے کی پوری کوشش کی مگر نتیجے

میل ناکام ہونا پڑا۔ یہ بنی امیہ کے اقتدار کو بڑی کاری ضرب تھی جسے معاویہ کی قوت و فراست سمجھ چکی تھی۔ اسے حسین بن علی کا ایک بڑا مدبر سمجھنا چاہیے کہ آپ نے اپنے عمل کے سکوت کو لڑنے میں انتہائی تدبیر سے کام لیا جس سے لئے آپ تیار تھے مگر آپ یہ نہ جانتے تھے کہ آپ کی طرف کسی جارحانہ اقدام یا بغاوت دستور میں الزام عائد کیا جائے۔

معاویہ بڑے جہاندیدہ انسان تھے وہ حسین کے اس سکوت کو اپنے اقتدار کی شکست کا مترقی سمجھ کر بے چین تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ اگر ہم سختی کریں گے تو وہ اس شکست کی انتہائی تکمیل ہوگی اس لئے حسین چاہتے تھے کہ میں خاموش رہوں۔ اور حریف تشدد سے کام لے اور معاویہ کا مطلب کھاکہ ہم تشدد سے کام بظاہر نہیں اور حسین کی خاموشی کبھی قائم نہ رہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ کربلا کی جنگ ہمیں سے شروع ہوئی ہے مگر ایک ہبر آندہ اور روحانی کشمکش تھی جو نہ معلوم کب تک جاری رہتی اگر معاویہ کا رشتہ مرقطع نہ ہوتا اور نہ عمر ناچر بہ کار، زور سلطنت سے بدمست یزید تخت سلطنت پر نہ بیٹھتا۔

حسین کی بیعت سے علیحدگی اور خاموشی معاویہ کو بھی اتنی ہی شاق تھی جتنی یزید کو مگر معاویہ کو نظاہر تشدد کے نتیجے کا اندازہ تھا اور یزید کو نہ تھا۔ یزید نے حسین کی خاموشی کو طاقت و اقتدار سے لڑنا چاہا اور جبکہ آپ سے بیعت لینے کی خواہش کی۔

دکھ بن غنہ جو مدینہ میں اس کا گورنر تھا اسے وفات معاویہ کی اطلاع کے ساتھ ہی یہ پیغام بھیجا کہ جلد سے جلد حسین بن علی سے میری بیعت لو اگر بیعت نہ کریں تو ان کا سر قلم کر کے بھیج دو۔ یہ کفارہ پہلا اقدام تشدد کا جو یزید کی طرف سے اٹھایا گیا اور اگر ولید اس حکم کی پوری تعمیل نہ کرنا چاہتا تو مدینہ ہی کہ بلا بن جاتا۔ امام کے سامنے اس مطالبہ کا اس طرح پیش ہونا کہ یا حسین مدبر کی پہلی فرخ اور اموی سیاست

کی ابتدائی شکست تھی اس نے سمجھا تھا کہ حسین کی بیعت سے علیحدگی ایک وقتی بات ہے جو اس دہمکی سے فزدا قبول بیعت میں تبدیل ہو جائے گی اور حسین نے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ سوچ سمجھ کر اس کے تمام آخری نتائج کا اندازہ کر لینے کے بعد اختیار کیا تھا وہ دیکھ رہے تھے کہ اسلامی مقاصد حدود و امتیازات میں کس طرح تبدیلی ہو گئی ہے مگر اس پر ابھی تک ظاہری اسلام کا پردہ بڑا ہوا ہے۔ اس لئے عام اشخاص اس کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ حسین چاہتے تھے کہ فریق مخالف کو تشریح کے آخری اصول پر پہنچا کر اس کے غیر انسانی جذبات کو اس طرح نمایاں کرنے کا موقع دے کہ پورا اس کا قوی احساس پیدا ہو جائے۔ اور آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹ جائیں۔

امام حسین کے لئے اپنے مقصد کے حصول کا سوائے اس کے کوئی ذریعہ ہی نہ تھا۔ یہ تو ممکن تھا کہ وہ اپنی جان بچا لیتے مگر جان کو بہر حال بچانا ہوتا تو وہ شروع ہی سے بیعت سے انکار نہ کرتے جان کا بچانا انھیں مد نظر تھا اسی حد تک کہ ان کے اصول اور مقصد کا بھی تحفظ ہوتا لیکن اگر مقصد کا تحفظ جان کے دینے پر موقوف ہو تو پھر ان کے نزدیک جان کا دے دینا آسان امر تھا۔ مقصد کے لئے صرف دو طریقے ہو سکتے ہیں ایک فریق مخالف سے مل کر شرائط صلح کے ذریعہ دوسرے جنگ کر کے فتح و غلبہ حاصل کر کے یہ دونوں طریقے امام کے لئے ناممکن تھے صلح کی منزل خود امام حسن طے کر چکے تھے اور شرائط صلح کی مخالفت ہی اب وہ صورت حال تھی جو امام حسین کے سامنے تھی حالانکہ معاویہ اپنے کردار کے ذریعہ سے بہ نسبت یزید کے کہیں ادب بجا درجہ رکھتے تھے۔ پھر جب معاویہ کے ساتھ مصالحت نتیجہ میں ناکام ہوئی تو یزید کے ساتھ مصالحت کے کیا معنی؟ جب کہ یزید کے افعال وہ تھے جو کھلم کھلا اسلامی اصول و قوانین کے ساتھ جنگ رکھتے تھے۔ یہاں اسلام کے ظاہری رسوم کا نہ روزہ وغیرہ کا بھی پتہ نہ تھا اور نکاح و ازدواج کے اصول و قوانین کی بھی مراعات نہ تھی اور اسلام کے مہنیاات

مثلاً تہاب وغیرہ کا ظاہر لفظ ہر اہل کتاب تھا اور اس کے ساتھ اسلامی خلافت کا دعویٰ تھا۔ موجودہ حالات میں اگر حسین بھی جو کہ اسلامی تمدن کے محافظ تھے یزید کی بیعت کر لیتے اور مصلحت سے کام لیتے تو یاد رہے کھنا چاہیے کہ اسلام کا تمدن و تہذیب اور اصول معاشرت مستقل طور سے سچی دستور بنیاد کے جس طرف بنی اُمیہ کی سیاست لئے جا رہی تھی اور جس کا یزید اپنے وقت میں بہترین نمونہ تھا۔

کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ حسین کے واقعہ شہادت کے بعد بھی تو بہت سے سلاطین انہی افعال کے مرتکب ہوتے رہے جن کا یزید اہل کتاب کرتا تھا مگر یاد رہے کھنا چاہیے کہ حسین نے مقادمت نے اسلام کے تمدن و اصول کو اتنا نمایاں کر دیا کہ اب اس کے خلاف جو افعال ہوتے تھے وہ بالکل انفرادی اور شخصی سہرا کم کی حد تک رہ گئے ہیں اور ان کا کوئی ذہنی اثر افراد جامع پر نہیں پڑتا۔ یہ خطرہ اب ہمیشہ کے لئے دور ہو گیا ہے کہ اسی کو اسلام کا مستقل اصول اور طریق معاشرت سمجھ لیا جائے کیونکہ حسین اور ان کے ساتھیوں نے اسلام کے حقیقی اقدار کا گرہلا میں نہ ملنے والا نمونہ پیش کر دیا۔ اور اس کی آئینی اہمیت کو انتہا درجہ واضح کر دیا ہے۔ اب اگر اسلام کے دامن پر دھبہ لگانے کے لئے سلاطین بنی اُمیہ و بنی عباس کی مثال پیش کی جائے تو فزدا اسلام کی جانب سے صفائی پیش کرنے کے لئے حسین کا اقدام تاریخ کے صفحات پر سامنے آجاتا ہے۔

یزید اور امام حسین کے مقاصد بالکل مختلف اور متضاد تھے وہ جاہلیت کے مادی دور کے پلٹانے کا علمبردار حسین روحانیت اور انسانیت کو قائم کرنے کے ذمہ دار۔ وہ طاقت و اقتدار کا سکہ چلانے کا ذریعہ اور حسین حق و راستی کا علم بلند کرنے پر آمادہ۔ وہ اسلامی حدود و امتیازات کو مٹانے پر تلا ہوا اور حسین اسلامی امتیازات کو باقی رکھنے پر مکرر استقامت! پھر کھلا بتلائیے کہ امام حسین اور یزید میں صلح کیوں نہ ہو سکتی تھی۔

دوسری صورت یہ تھی کہ آپ طاقت کا مقابلہ طاقت سے کرتے اور فتح و غلبہ حاصل کر کے یزید کو شکست دیتے مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ طاقت کے مقابلے میں آل رسول کے ساتھی بہت کم نکلتے تھے۔ اس طرح کا بجز یہ لہرے طور پر حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کے وقت میں ہو چکا تھا۔

پھر دنیا کی ذہنیت اتنی ماؤف ہو چکی تھی کہ اگر آپ فوج و لشکر جمع کر کے جنگ بھی کرتے تو جو اس کی واقعی حیثیت تھی اس کے بچنے والے بہت کم اور یہ سمجھنے والے زیادہ ہوتے کہ یہ حکومت و سلطنت کی عرش سے دو باد شاہوں کی جنگ ہے۔ اور سیاسی حیثیت سے یزید کا پلہ گہرا رہتا اس لئے کہ وہ بادشاہ تسلیم کیا جا چکا تھا اور حسین کا پلہ سبک ہوتا اس بنا پر کہ وہ ایک باغی کی حیثیت رکھتے تھے اگر اس صورت میں آپ کو فتح حاصل بھی ہوتی جو بظاہر ناممکن تھی تو اس کا اثر ایک وقتی انقلاب سلطنت کی صورت سے ہوتا جس کا اثر دیر پا نہیں رہتا۔

اور بنی اُمیہ پر جو ظاہری اسلام کا پردہ تھا وہ اب بھی اسی طرح بڑا رہتا جیسے اس کے پہلے تھا اور کچھ لوگ حسین کو حق پر سمجھتے بھی ہوتے تو فریق محارب کو حفاظت اجتہادی کا سائٹیفیکٹ دے دیتے جیسا کہ اس کے پہلے صحیفین کی جنگ میں ہوا۔ اس صورت میں بنی اُمیہ کے باطنی حالات کا اس درجہ انکشاف کہ جو ان سے ہمدردی کا کوئی گوشہ انسانیت کے دل میں باقی نہ رکھے ہرگز نہیں ہو سکتا تھا اور جب تک ان سے نفرت انتہائی درجہ پر پیدا نہ ہوتی اس وقت تک ان امتیازات و حدود کی مکمل شکست نہیں ہو سکتی تھی جنہیں بنی اُمیہ نے عملی طور پر قائم کرنا چاہا تھا۔

معلوم ہوا کہ صلح بھی ناممکن اور جنگ بھی!

پھر اب تیسرا واسطہ کون سا تھا؟ وہی جسے حسین نے اختیار کیا اور اگر حسین اختیار نہ کرتے تو اس کا تصور بھی ہمارے لئے دستاویز ہوتا۔

آپ نے اقتدار کا مقابلہ لے لی سے، کثرت کا مقابلہ و وحدت سے اور ظلم کا مقابلہ مظلومیت کے ساتھ کیا اور یہ بھی وہ طریقہ جنگ تھا جس کا

مشاہدہ اس کے پہلے دنیائے نہیں کیا تھا۔ آپ کی نظر میں فتح و شکست کا مفہوم بالکل جدا گانہ تھا فتح کے معنی یہ نہ تھے کہ آپ دشمن کی فوجوں کو ہار کر کے اس کے ملک پر قبضہ کر لیں اور شکست کے یہ معنی نہ تھے کہ آپ کے ساتھ والے سب ختم ہو جائیں اور آپ بھی قتل ہو جائیں۔

آپ کے نزدیک فتح کے یہ معنی تھے کہ کہاں تک آپ اپنے اصول کی حمایت میں مصائب کا زیادہ مقابلہ کرتے ہیں اور کہاں تک آپ کا دشمن اپنے مقاصد کے تحفظ میں زیادہ تشدد سے کام لیتا ہے دشمن کے تشدد کا ہر قدم ایک موڑ پر تھا جسے حسین فتح کرتے تھے اور اس انتہائی متشدد و نازاقدام حسین کی اپنے مقصد کے لحاظ سے ایک مکمل فتح تھی۔

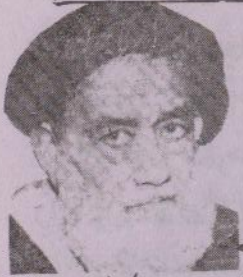
اسی اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے حسین نے اپنے ساتھ بڑا سامان کیا تھا طاقت کا مقابلہ طاقت سے کرنا ہوتا تو فوج و لشکر کی تعداد میں اضافہ کرتے انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ تعداد کو تو حتی الامکان زیادہ سے زیادہ مختصر بنایا۔

مگر انھوں نے اپنے ساتھ ایسے عابد و زاہد، متقی اور یار سالوگوں کو لیا جن کی نیکی اور پاک دامنی زہد اور تقویٰ کا سارے ملک میں کلمہ پڑھا جاتا تھا۔

انھوں نے ایسے جو ان کے اپنے ساتھ لئے جن کے شباب اور زین و جمال کا نظیر نہ تھا۔ اور کچھ ایسے بچے بھی ساتھ لئے جن کے ہاتھوں میں تلوار اٹھانے کی طاقت نہ تھی بلکہ گہوارے میں لیٹے ہوئے شیر خوار بچہ تک کہ اپنے ساتھ لیا اور پردہ نشین عورتوں کو جو رسول اللہ کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور جن میں رسول کی حقیقی نواسیاں بھی موجود تھیں اپنے ساتھ لیا۔

تم اس سانڈ و سامان سے سمجھ سکتے ہو کہ حسین کا مقصد کیا تھا اور وہ کس طرح اپنے مخالف سے جنگ کرنا چاہتے تھے۔ یاد رکھو کہ حسین کے ساتھ یہ وہ مشین گین تھیں جن کو حسین بنی اُمیہ کے قصر استبداد

کے تباہ کرنے کا انتہائی طاقتور ذریعہ سمجھتے تھے اور بیشک ان کا خیال صحیح تھا۔ امام حسینؑ کے لئے بہترین اور مفید ترین یہی راستہ تھا اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ نہ تھا۔



مَقْصِدِ حُسَيْنِ عَلِيِّ السَّلَامِ

پھولوں کی سیج پر آرام کی نیند سونا آسان ہے مگر کانٹوں پر بیترنگائے رکھنا مشکل۔ خوشی کو ہر ایک کی طبیعت ڈھونڈتی ہے مگر غم کے ساتھ نباہ بہت دشوار ہاتھ میں لگی ہوئی پھانسی کو جب تک نکل نہ لے سچیں نہیں آتا۔ پھر دل میں چپے ہوئے کانٹے کو سینہ سے لگائے رکھنا کہاں ممکن ہے اسی لئے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ بلا کا واقعہ بس ایک درد کھری کہانی نہیں تھا بلکہ اس میں انسانی زندگی کے جراثیم مضمحل تھے جب یہی انسانوں کی دنیا میں اس کا بیج چاہو، رہا اور پھیلتا رہا۔

اس وقت جبکہ ہم حسینؑ کے مقصد کو سمجھنے اور سمجھانے کھڑے ہوئے ہیں دنیا کے بہت سے حصوں میں حسینؑ کا نم منایا جا رہا ہے اور اللہ میں کہ بلا کی سر زمین پر جو قرآنی دی گئی ہے اس کو آج تیرہ سو اسی برس ہو چکے ہیں اور اب ایک برس کے بعد ۱۹۷۷ء کا حرم آگے گا اس لمبی مدت میں نہ ماننے لگتی کہ وہ نہیں لیں۔ آندھیاں چلیں اور نہ نکل لیں سیلاب آئے اور گزر گئے مگر حسینؑ کی یاد تازہ اور زندہ رہی اور آج بھی زندہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ حسینؑ کے نام اور ان کے کام نے نوزع انسانی کے دل میں گھر کر لیا ہے۔ لب پر حسینؑ کا نام، ہر دل میں حسینؑ کی یاد اور دماغ کو حسینؑی مقصد کی تلاش ہے۔ شخصی اور ذاتی مقصد نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو کسی کو کیا پٹری تھی کہ زندگی اس کی یاد میں صرف کرے کسی مصیبت کے ستارے کو دیکھ کر نگاہ مڑ جانا یا دل میں سہمہ دی سے کسک پیدا ہونا بالکل ایک وقتی چیز ہے مگر اسے کوئی مستقل حیثیت نہیں مل سکتی۔ حسینؑ کا مقصد نوزع انسانی سے وابستہ تھا اور اجتماعی حیثیت رکھتا تھا



صدر آل پاکستان ذاکر بن ایوب سی ایس جناب مولانا علی سرکار نقوی امر دہوی نے اپنے دولت کردہ سرکار سید العلماء سید علی نقی صاحب کے اعزاز میں استقبالیہ دیا جس میں مفتی اعظم پاکستان جناب سید محسن نقوی، مولانا سراج الحسن اجتہادی، مولانا علی کرار نقوی نمایاں نظر آئے ہیں۔

اس لئے انسانیت نے اپنا دل چیر کر اس کی یاد کو محفوظ کر لیا۔

اب آپ چاہتے ہیں گے کہ میں اس مقصد کو کھلے لفظوں میں بیان کر دوں اچھا ٹھننے! مگر آپ کو میرے ساتھ کھوٹے دو در تک چلنا پڑے گا۔ آپ کو یہ تو معلوم ہو گا کہ حضرت محمد مصطفیٰ نے تمدن اور معاشرت اور آئین زندگی میں ایک انقلاب کا پیغام پہنچایا جس کا نام تھا اسلام! اسلام نے زندگی کے ہر حصے میں بہت اہم تبدیلیاں کیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نزع النسانی کو برادری اور برابری کا سین بڑھایا وہ حدود و امتیازات جو ان لوگوں میں قائم ہو گئے تھے جن سے خدا کی مخلوق اوجھے اور نیچے کے دو درجوں میں تقسیم ہو گئی تھی ان تمام امتیازات پر اسلام نے قلم چھیر دیا۔ اور تمام آدمیوں کو ایک اکیلے خدا کی پرستش کی دعو

دی۔
کون نہیں جانتا کہ دنیا میں "طاقت حق ہے"، کا کلمہ ہمیشہ پڑھا گیا اور رہتا ہے کہ آج جبکہ دنیا تمدن اور تہذیب میں بڑے اونچے درجے پر تبتلائی جاتی ہے آج بھی طاقت ہی کا بول بالا ہو رہا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ نزع النسانی کے پرچے اڑ رہے ہیں اور انسانیت کے دامن کی ڈھجیاں ہوا میں تتر بتر دکھائی دیتی ہیں۔

عرب میں عس و بیت یعنی قوم و نسل کے امتیاز کا خیال بڑا غالب تھا وہ اپنے سامنے غیروں کو انتہائی ذلیل سمجھتے تھے اور خود آپس میں قانونی احکام اور فوجداری کے قوانین و تقریات تک میں بڑے اور چھوٹے کا فرق قائم کر لیا تھا۔ بڑے آدمیوں کی جانیں بہت مہنگی تھیں اور چھوٹے آدمیوں کی سستی جانیں توڑ میں ان کے برابر نہیں سمجھی جاتی تھیں ان میں مال و دولت، قوم و قبیلے کی کثرت، خاندانی جاہ و ہمت وہ چیزیں تھیں جو عورت کا معیار سمجھ کی گئی تھیں اور جو لوگ ان چیزوں سے محروم تھے ان کے ساتھ جانوروں کا سا سلوک کیا جاتا تھا۔ یہ طاقت کی پوجا ہزاروں طرح کے اجتماعی گناہوں کی نیو تھی اور

بہت سی خرابیوں کے سہارے اسی ایک سرچشمہ سے کھوٹا رہے تھے۔

حضرت محمد مصطفیٰ نے آکر پہلی ہی دفعہ ان حدود و امتیازات کو ختم کیا اور بڑائی کا ایک نیا تصور دنیا کے سامنے پیش کیا انھوں نے کہا کہ آدمی سب ایک ہیں۔ فرق ہے نزع النسانی فرائض کے ادا کرنے کے ساتھ، جو ان فرائض کو سب سے زیادہ ادا کرتا ہے وہی سب سے بڑا آدمی ہے یہ کوئی معنوی بات نہ تھی اس سے تمام ان لوگوں کے اقتدار کا وہی ضرب لگی۔ جو عورت و اقتدار کے بڑاڑے میں پہلے کافی حصہ رکھتے تھے انھوں نے ڈٹ کر اسلام کا مقابلہ کیا اور پیغمبر کو ان کے ہاتھوں بڑی تکلیفیں اٹھانا پڑیں اس سلسلے میں بدر، احد اور خندق کی لڑائیاں مشہور ہیں اور یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ ان لڑائیوں میں رسول کے مقابلے میں قبیلہ بنی امیہ کا لیدر ابو سفیان آگے آگے تھا۔ پیغمبر کو فتح ہوئی اور یہ لوگ ناکام ہوئے آخر میں ان کو ہتھیار ڈال دینا پڑے اور حضرت محمد مصطفیٰ کے سامنے سر جھکا دینا پڑا۔ پیغمبر کے زمانے میں کسی کو یہ موقع نہیں مل سکتا تھا کہ وہ اسلام کے اصول میں کوئی تبدیلی کر سکے۔ آپ اپنے مشن کے بڑی سختی کے ساتھ خود پابند بھی تھے اور دوسروں کو پابند بناتے بھی تھے اس وقت جب عرب کے تمام قبیلوں کی طرف سے روپیہ بھیج بھیج کر آپ کے پاس آتا تھا اور ہزاروں آدمی آپ کا حکم ماننا اپنے لئے فخر سمجھتے تھے اس وقت بھی اپنے فقروں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، پھٹے پڑے کپڑے پہننا اور رطلنے والوں سے برابری کا برتاؤ کرنا نہیں چھوڑا آپ نے اپنی مسجد کا مؤذن ایک حبشی کو بنایا تھا جسے عرب لوگ بہت ذلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے مگر رسول نے اس کو بڑی عزت دے رکھی تھی۔ آپ نے اپنی چھوٹی زاد بہن کی شادی ایک آزاد کئے ہوئے غلام کے ساتھ کر دی۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ آپ نے اسی غلام کے لڑکے کو بڑے اونچے خاندان والے عربوں کا سردار بنا دیا اس پر لوگ بہت جڑ بڑھوئے۔ مگر آپ نے ایک نہ سنی اور اپنی بات پر قائم رہے۔ جن لوگوں کی آپ بڑی تعریف کرتے تھے اور انتہائی عزت کرتے تھے

بہت سے ان میں سے عزیز کمزور اور بے لسی لوگ تھے۔ مسلمان فاسق بھی
 ایران کے رہنے والے تھے۔ رسول کے ساتھ اتنی خصوصیت رکھتے تھے جو کسی
 دوسرے کو مشکل سے حاصل تھی یہ سب اس لئے تھا کہ ذہنیت میں تبدیلی
 پیدا ہو اور انسانیت میں چاندی کے گنگا جمنی طوق اور زنجیروں کی
 قید سے آزاد ہو۔

انہوں نے کہ پیغمبر کی زندگی نے زیادہ ساتھ دیا اور آپ دُنیا
 سے رخصت ہو گئے۔ آپ کا من اس حیثیت سے مکمل ہو گیا تھا۔ آپ
 نے اس کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا اور کچھ لوگ سخی طور سے اس
 کے پابند ہو گئے مگر آپ کو معلوم ہے کہ جمہور کی ذہنیت کی تبدیلی اور اس
 تبدیلی کے راسخ ہونے کے لئے بہت بڑی مدت درکار تھی۔ رسول
 کے بعد ابھی تھوڑے دن گزرے تھے کہ بنی امیہ کے اقتدار کی بنیاد قائم
 ہوئی۔ یہ شروع شروع میں ایک ہوہر کے گورنر کی حیثیت سے تھی مگر رفتہ
 رفتہ اس کے اثر اور نفوذ میں ترقی ہوتی گئی۔

شام میں اس خاندان کا اقتدار بالواسطہ اس جماعت کا اقتدار تھا جو
 ہمیشہ پیغمبر اسلام سے لڑتی رہتی تھی اور آخر میں بے بسی سے سہرا طاعت
 جھکانے پر مجبور ہوئی تھی۔

اس کا فیصلہ ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ اس جماعت کے منہویے اپنے
 برسر اقتدار آنے کے بعد کیا ہونے چاہئیں؟ معموری دل و دماغ بھی
 کہے گا کہ ان ہی امتیازات کو واپس لانا جنہیں پیغمبر اسلام نے مٹا دیا
 تھا اور جن کا اثر اس جماعت کے اقتدار پر بہت گہرا پڑا تھا، مگر چونکہ
 اس جماعت کا اقتدار اب اسلام کے سائے میں اسلام کی بنائندگی میں حاصل
 ہوا تھا اس لئے ضرورت تھی کہ یہ اس پر دہری میں اپنے منہویوں کی تکمیل
 کریں اور یہ اس سے زیادہ خطرناک تھا کہ یہ طہل کر ایک دشمن کی حیثیت
 سے اپنے مقاصد کا اعلان کر دیتے۔

سچنے والوں نے سمجھا کہ اسلام کی سادگی اور اسلام کی مساوات کے

جگے ملکیت اور جہانبانی کی نشان پیدا ہو رہی ہے اور سرمایہ داری کی بنیاد پڑ رہی
 ہے۔ اس پر احتجاج بھی ہوا اور احتجاج کا نتیجہ تھا ابوذر غفاری کا جلا وطن
 کیا جانا۔ ریزہ کے جنگلی میں بھجھا جانا اور رسول کے اس صحابی کا اکیلے
 دم توڑنا اور دنیا سے گمراہ جانا یہ ابتدا ہے اس جنگ کی جس کی تکمیل
 کر بلا میں ہوئی۔

زمانے نے ایک کمر وٹ ایسی بدنی کہ شہنشاہی حضرت علی کو حاصل
 ہوئی آپ کو سیاسی اقتدار حاصل ہونا اس سادگی اور مساوات کے
 اھول کے نئے سرے سے عملداری ہو جانا تھی جو رسول اسلام نے قائم کیا
 تھا اسی لئے مخالف جماعت نے بغاوت کی اور تباہ توڑ کی سترہ ستروں اور
 لڑائیوں میں آپ کو ایسا اٹھا یا گیا کہ آپ ان مقاصد کو پورا نہ کر سکے جو
 آپ کے سامنے تھے آخر مسجد میں علی کا سر تلوار سے دو ٹکڑے ہو گیا
 اور اسلامی مساوات کا وہ مشنری دنیا سے رخصت ہو گیا۔

آپ کے بیٹے حضرت حسن کو زمانہ وہ ملاحظہ شام کی حکومت
 کو بڑی فہمت حاصل ہو چکی تھی، آپ نے جنگ کے ذریعہ سے کامیابی کی
 کوئی صورت نہ پائی تو صلح کے مخالفانہ کی جادو خانہ کار وایوں کہ اھول
 کے شکبہ میں قید کیا اور آپ نے دوراندیشی سے کام لے کر یہ بڑی شرط
 رکھی کہ شام کے حاکم کو اپنے بعد کسی کے جانشین بنانے کا حق نہ ہوگا
 بلکہ اس کے بعد حکومت بنی ہاشم کی طرف واپس آئے گی۔ یہ ایسی شرط تھی
 جس نے مستقبل کو کسی حد تک محفوظ کر دیا تھا۔ مگر سیاست کی دنیا میں
 سچائی اور وعدے کی پابندی تو کوئی چیز ہے نہیں۔ وعدے کئے جاتے
 ہیں توڑنے کے لئے اور معاہدے کھے جاتے ہیں ردی کی ڈگری میں
 پھینکنے کے لئے۔ وہی ہوا جو اس طرح کی سیاست کا تقاضا تھا انہیں
 کہاں کی اور کیسا معاہدہ۔ حضرت امام حسن کی زندگی آخری مقاصد میں
 لڑکھٹ پیدا کر رہی تھی۔ آپ کو پراسرار طریقہ پر نہر سے شہید کر دیا گیا
 یہ بھی ایک قربانی تھی جو اسلامی تمدن کی قربان گاہ پر نذر ہو گئی۔

اب ان لوگوں میں جو اسلامی تمدن کے محافظ ہو سکتے تھے صرف حسین ذات باقی تھی۔ ظاہری طور پر اب آپ کو قدم آگے بڑھانے کا کوئی موقع نہ تھا وہ پورا جتھا جس کو ساتھ لے کر شام کی طاقت سے مقابلہ کیا جاسکتا تھا امام حسین کی صلح کے بعد بکھر چکا تھا اور اب اس کے اکٹھا ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ سیاست حاضرہ کی بیز اسلامی چال دیکھ کر دم کھٹتا تھا مگر آپ منتظر تھے کہ معاویہ اپنے بعد کے لئے کیا ہمدرد اختیار کرتے ہیں۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس مدت میں حق کے بجا رہی بالکل چب رہے ہیں اس سخت اندھیرے کی رات اور اس کے سناتے میں کبھی کبھی ادھر ادھر سے چیخ کی آواز سنائی دے جاتی تھی مگر وہ آواز اسی طرح دبا دی جاتی تھی جس طرح آپ سُننے میں کہ بہ طور لینے ملک میں ہر مخالف کی آواز کو دبا دیتا تھا۔ عمرو بن الحمزائی اور حمر بن عدی اور ان کے دس گیارہ ساتھیوں کا انجام تاریخ میں آپ کے سامنے ہے۔ یاد رکھئے کہ ان لوگوں کو حاکم شام سے کوئی خاندانی عدالت نہ تھی وہ صرف اصول کا اختلاف تھا جس نے کائینات کی اس وسیع فضا میں ان کے لئے جگہ باقی نہ رکھی۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے ان واقعات پر احتجاج ضرور کیا مگر پھر بھی آپ دیکھ رہے تھے کہ آخری شرط کا کیا انجام ہوتا ہے۔ لیجئے کیا وہ وقت کہ امیر معاویہ نے اپنے بعد کے لئے اپنے بیٹے بزرگ کو جانشین بنا دیا یہ اس مفاد کی آخری پامالی تھی جسے معاہدہ کے شرائط میں محفوظ کیا گیا تھا۔

بزرگ کے افعال بھی ایسے تھے جو اسلام کے احکام سے کھلم کھلا بغاوت کے مترادف تھے۔ امام حسین نے اس کوشش کے ساتھ احساس کیا۔ معاویہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ اس معاملے میں سب سے زیادہ متعلق ہستی حسین کی ہے اس لئے انھوں نے کوشش کی کہ آپ کو ملا لیا جائے مگر یہ کوشش ناکامیاب ہوئی۔ امام حسین نے صاف کہہ دیا کہ میں اس کاروائی سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ امیر معاویہ نے آپ کے ساتھ اس

انکار پر زیادہ سختی نہیں کی مگر معاویہ کا انتقال ہو گیا اور بزرگ تخت حکومت پر بیٹھا تو اس کے سامنے سب سے پہلے ہی مسئلہ تھا کہ حسین سے بیعت لو۔ نہیں تو انھیں قتل کر دو۔ یہ پہلا ہی تشدد کا قدم تھا جو حسین کے خلاف اٹھایا۔ حسین اس کے لئے بالکل تیار تھے انھوں نے کہا کہ میری جان جلے تجھے گوارا ہے مگر میں اس سلطنت کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کروں گا۔

وقت وہ تھا جب احساسات بالکل مر چکے تھے فضا میں کامل سناٹا تھا جس لوگوں سے مخالفت کا اندیشہ ہو سکتا تھا ان میں کچھ کا گلا گھونٹا جا چکا تھا اور کچھ کے صبر خرید کر ان کی زبانوں کو بند کر دیا گیا تھا۔ سنہری تلوار کی چھنکار اور سویرا شہر کی کھنک نے بڑے بڑوں کے دل ڈال ڈال کر دیئے تھے اس وقت حسین اس آخری اقدام کے لئے تیار ہو رہے تھے جو بنی امیہ کے استبداد کے قہر کو زمین پر گرا دے۔

امام حسین کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ طاقت کا مقابلہ طاقت سے کرتے انھوں نے جنگ کا ایک نیا طریقہ نکالا جو ان سے پہلے دنیائے نہیں دیکھا تھا۔ وہی ان کے مقصد کے لئے زیادہ مفید اور کارگر بھی تھا وہ جانے تھے کہ مسلمانوں کی آنکھوں پر پردے بڑھ گئے ہیں ان میں ذہنی جو پیدا ہو گیا ہے ان کے احساسات پر نشی چھا گئی ہے ان میں یہ شعور باقی نہیں رہا کہ بنی امیہ کے افعال و اعمال اسلامی طریقہ کے خلاف ہیں۔

بڑا سبب اس کا اسلام کے نام کی وہ نقاب ہے جو ان کے پہروں پر پڑی ہوئی ہے حسین چاہتے تھے کہ ایک ایسا تشدد چھینٹا دیں کہ ان کے احساسات بکھر سیریلے کر ہوش میں آجائیں اور چہرے کی یہ نقاب ہرٹ جائے اور اس کے اصلی خط و خال سامنے آجائیں اور دنیا دیکھ لے کہ اس ملوکانہ سیاست کے انتہائی قدم کہاں تک جاسکتے ہیں انھوں نے اس کے لئے فوج اور لشکر جمع نہیں کیا انھوں نے وہ عابد و زاہد اور متقی لوگ ڈھونڈے جن میں کاہر شخص اپنے اخلاق و ادب کی بلندی سے سچے اسلام کا نمائندہ تھا اور ملک میں جس کے زہد اور پارہ سائی کا ہر شخص

کو اعتراف تھا۔ انہوں نے رسول کے خاندان کے جوان اور بچے، یہاں تک کہ دودھ پیتا بچہ تک ایسے ساتھ لے لیا اور رسول کے گھر انہی معزز لوگوں میں جن میں خاص رسول اللہ کی حقیقی نواسیاں موجود تھیں اپنے ہمراہ لیں۔ حسین نے اپنے دشمن کی فطرت کو خوب پہچان لیا تھا وہ اس کے تشدد کے امکانات میں کافی اضافہ کر رہے تھے دنیائے دیکھ لیا کہ حسین نے جو سامان اپنے ساتھ لیا تھا وہ حسبِ مصلحتی مقصد کی تکمیل میں صرف ہوا۔

بوڑھے قتل ہو گئے۔ جوان قتل ہو گئے۔ بچے قتل ہو گئے۔ دشمن کے تشدد کا آخری تیر باقی تھا۔ حسین نے اس کے لئے بھی نشانہ ڈھونڈ لیا تھا۔ رباب کی گود سے کچھ مہینہ کا بچہ لے لیا سب سے آخر میں اپنی گودن کو بھی پیش کر دیا۔ شاہزادوں کو قید ہونے کے لئے اپنے بعد چھوڑا۔ یہ سب ہوا اور کچھ لوگ سمجھ گئے کہ ہوا۔ حسین اپنے مقصدِ نبی کا میاب ہو گیا۔ مسلمانوں کی آنکھیں کھل گئیں اور یزیدیت اور کفر اسلام دو الگ الگ چیزیں ہو گئیں۔ حسین کا مقصد بھی بس یہی تھا وہ چاہتے تھے کہ اسلامی تمدن پر جو اموی شہنشاہیت کا رنگ چڑھ رہا ہے جس سے الگ کے حدود امتیازات ملتے جلتے ہیں یہ رنگ اتر جائے دنیا یہ سمجھ لے کہ اسلامی تمدن وہ نہیں ہے جو دشمن کے دارالامارہ میں نظر آتا ہے۔ جہاں شراب کے جام چھل رہے ہیں اور ہونٹوں کا جھرمٹ لگا ہوا ہے جہاں تمام رعایا سے لے کر دولت مہمی جاتی ہے اور وہ خلیفہ کی رنگ رلیوں پر صرف ہوتی ہے جہاں طرب و نشاط کے نقارہ خانہ میں عزیبوں کی صدا سنی نہیں جاتی اور جہاں انصاف کو کوند چھری سے ذبح کیا جاتا ہے حسین نے دکھ لایا کہ اسلام کا تمدن وہ ہے جسے کربلا کے میدان میں پیش کر دیا گیا جہاں ایک حبشی غلام بھی زخمی ہو کر گھوڑے سے گرتا ہے اور امام کو آواز دیتا ہے کہ امام اس کے سر ہانے جاتے ہیں اور سر اٹھا کر گود میں رکھتے ہیں۔ غلام کی روح آقا کی گود میں جسم سے مفارقت کرتی ہے۔

یزید ہی طاقتیں دنیائے بہت پیدا ہو سکتی ہیں اور ہر قوم میں پیدا ہوتی ہیں مگر حسین مشن جو کہ بلا کی زمین پر پائی تکمیل کو پہنچا وہ ہر زمانہ میں یزیدیت کی شکست کے لئے کافی ہے۔ اس شرط سے کہ حسین کے کارنامے کو دنیایا در رکھے۔ اور اس سے سبق حاصل کرے۔



عزائے مظلوم

دسویں محرم ۱۱۰ھ میں زمین کہ بلا پر کونسا عظیم واقعہ ہو گیا جس پر اب تک چشم عالم خونہ ریز ہے؟ یمنو کی گرم زمیں پر کس مظلوم کا خون بہایا گیا جس کا آج تک ماتم ہے مسلمان جانتے ہیں کہ وہ رسول کا لڑکھو فاطمہ زہرا کی گود کا پالا، امیر المؤمنین کا جگر گوشہ تھا جس کا خون پودا لانا اسلام کے ہاتھوں میں دن کی کھجور پیاس میں حصد تیر و نیزہ و شمشیر ہو گیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ عالم کی خاموشی کائنات نے اس کا کتنا اثر لیا؟ تاہم یحییٰ تبلا میں گی۔ اور سلمۃ الثبوت علمائے اہلسنت کے اقوال اس کی تصریح کریں گے ابن حجر مشہور عالم اہلسنت شرح فقیدہ جزنیہ میں لکھتے ہیں کہ روز قتل حسین جو علامات ظاہر ہوئیں ان میں سے یہ تھا کہ آسمان نے اشک خونیں برسائے اور ظروف خون سے ملبہ ہو گئے آفتاب کو کہن لگنے سے آسمان اتنی شدت سے تارک ہو گیا کہ ستارے دکھائی دینے لگے اور سیاہی اتنی بڑھی کہ لوگوں نے یہ خیال کیا کہ قیامت آگئی اور تارکے ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے اور جو پتھر اٹھایا جاتا تھا اس کے نیچے سے خون اُبلتا دکھائی دیتا تھا اور دنیا میں تین دن تارکی رہی پھر مسیحی ظاہر ہوئی اور بعض نے کہا ہے کہ چھ مہینے تک دنیا سرخ رہی اور اس کے بعد سبھی بالکل اندر سرخی کا ڈاٹا بن گیا۔

یہ شیعی روایت نہیں ہے ممکن ہے آج کل کے تعلیم یافتہ افسر اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیں بہر حال یہ ماننا بڑے گناہ کا ایک غیر معمولی اہمیت اس مصیبت کی ثابت ہوئی تھی ورنہ اس قسم کی روایات اس حلقے میں بیان نہ کی جاتیں جسے امام حسین اور انہی شہادت کے متعلق کسی بات سے بڑھا کر کہنے یا اپنے دل سے بنانے کی ضرورت نہ تھی اب یہ

سوال کرنے کا عام سکاڑوں سے ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ جس مصیبت بہر جمادات وغیر ذوی العقول نے حکم خدا سے خون کے آنسو بہائے اس بہر ذی شعور انسان کیوں نہیں گمیاں ہوتے رسول کے سچے کلمہ گو یوں کو رسول کے محبوب لڑاسے کے قتل سے کیوں نہ صدمہ نہ ہو گا۔

کہہ دنیا آسان ہے کہ تم زندہ جاوید کا ماتم نہیں کرتے، مگر کائنات عالم نے اس فلسفے کا درس نہیں حاصل کیا تھا۔

یہ وہ فہم تھا جس کے غم میں سردار اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبل وقوع واقعہ شہادت روئے۔ اس کو ثوث العظم شیخ عبدالقادر جیلانی نے غنیۃ الطالبین میں تحریر فرمایا ہے۔ حضرت ام سلمہ کی زبانی!

”حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں کہ رسالت میرے گھر میں تشریف رکھتے تھے کہ ناگاہ امام حسینؑ داخل ہوئے۔ میں نے ان دونوں بزرگوں کو دیکھا اس صورت سے کہ حسین سینہ رسول پر کھیل رہے ہیں اور رسالت کے ہاتھوں میں کچھ مٹی ہے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ جب حسین چلے گئے تو میں نے رسالت سے دریافت کیا کہ آپ کے رونے کا کیا سبب ہے؟ حضرت نے فرمایا اس وقت جب حسین کو دیکھ کر میں خوش ہو رہا تھا تو جبریل آئے اور مجھے وہ مٹی دی جس پر حسین قتل کیا جائے گا پس میں رونے لگا۔“

علامہ حجر کی نے ہوائی محرقہ میں اس طرح کی روایت حضرت علی ابن ابی طالب کی زبانی نقل کی ہے۔

پھر جبکہ رسالت مآب اس واقعہ جاں سوز پر قبل وقوع رونے لڑے تو ہوا رو نالعد و قس کیوں نہ کر نامناسب ہو سکتا ہے اس کے بعد جس روز شہادت میں کا واقعہ پیش آیا اس دن ام سلمہ نے رسول اللہ کو خواب میں دیکھا کہ آپ رورہے ہیں اور آپ کے سر و ریش مبارک پر خاک ہے۔ ام سلمہ نے دریافت کیا تو فرمایا ”کہ ابھی حسین قتل ہوئے ہیں۔ ایسا ہی خواب ابن عباس نے بھی دیکھا۔ یہ دونوں روایتیں صحیح ترمذی میں ہیں جو کہ

صحاح ستہ میں داخل ہے۔

گمبہ و ذراہی اور مائتوں کی صورت بنانے کی سند کے لئے تو یہ کافی ہے کہا جائے گا کہ شیعہ، علم تعزیرہ و نیزہ مختلف طرح کی شبیہیں بناتے ہیں یہ جائز نہیں ہے سوال ہوتا ہے کیوں؟ جواب ملتا ہے کہ یہ پیٹریل بدعت ہیں یعنی رسالتک کے نہ ملنے میں ان کا پتہ نہ تھا بلکہ یہ تقریح علیک اہل سنت بدعت واجب و مستحب و مباح بھی ہوتی ہے صاحب بحر المذہب نے صاف لکھا ہے کہ بدعت کو قواعد شرعیہ کے سامنے پیش کرنا چاہیے اگر وہ قواعد و جوب میں داخل ہو جائے تو واجب ہے اگر اسی کے قواعد میں آئے تو مستحب اور اسی طرح مگر وہ۔ مباح اور حرام۔ پھر ہر ایک کی مثالیں بھی دی ہیں۔ بدعت واجب کی مثال علم نحو کا سیکھنا۔ کیوں کہ قرآن و حدیث کا سمجھنا اس پر موقوف ہے اور اسی طرح اصول فقہ کا علم۔ بدعت مندوب۔ مدرسوں کا بنانا اور وہ آخر غیر جو زمانہ رسول میں جاری نہ تھا اسی میں داخل ہے۔ تراویح اور حقائق تقویٰ میں کلام اور محافل کا جمع کرنا۔ مناظرہ کے لئے پھر جب یہ صورت ہے تو تعزیرہ و ضریح کا بنانا صرف بدعت ہونے کی وجہ سے ناجائز کیوں ہو جائے گا۔ اگر کہا جائے کہ یہ مجسم تصور ہے اس لئے قاعدہ حرمت کے تحت میں داخل ہوتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جاندار چیزوں کی تصور بنانا حرام! مگر بے جان چیزوں کی تصور بنانا جائز ہے۔ جس کی تقریح صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی حدیثوں میں موجود ہے۔ پھر تعزیرہ و ضریح تو کسی جاندار سے کی تصور نہیں ہے۔ اب رہ گئی یہ بحث کہ اچھا تعزیرہ اور ضریح بنانا جائز ہے مگر اس کی تعظیم کرنا۔ بوسہ دینا اور اس سے اظہارِ خلوص کرنا کہاں تک درست ہے؟ اس کے متعلق صرف اتنا کہوں گا کہ یہ جذباتِ محبت سے وابستہ ہیں جس کو کسی شخص سے محبت ہو تو وہ اس کے سامنے ہر نسبت نہ رکھنے والی چیز کی عورت کہتا ہے۔

خود رسالت مآب کی ایک حدیث سے جو فتاویٰ عالمگیری وغیرہ میں

درج ہے۔ یہ ثابت ہوتا ہے کہ والدین اگر موجود نہ ہوں تو ان کی قبر کو بوسہ دے اور قبر کا پتہ نہ ہو تو زمین پر دو خط کھینچ کر ایک کو قصد کرے کہ گویا وہ ماں کی قبر ہے۔ اور ایک کو یا باپ کی قبر ہے پھر ان دونوں کا بوسہ لے۔!

یہ کیا ہے؟ صرف انستاب کی عورت ہے پھر تعزیرہ اس حیثیت سے کہ وہ منسوب ہے۔ روضہ حسینی کی طرف اگر قابل عورت سمجھا جائے تو کیا گناہ ہے۔

”حسینیت نہ خدا کا جان“

بہفت روزہ شیعہ لاہور جنوری ۱۹۶۷ء





حیاتِ ابدی

اموی تہذیب اور شامی سیاست نے سنہ ۶۶۰ء ہی میں اسلام و مسلمین کے لئے ایسا روزِ سیاہ پیدا کر دیا تھا کہ اس شدت سے ایسا کالا دن اس سے پہلے اسلام کی تاریخ نے نہ دیکھا تھا اگر یہ سائنس کا مایاب ہو جاتی تو ایسی گھٹا لوٹ پٹائی چھاتی جن کے کسی طرف بھی چشمہٴ حیات کا وجود نہ ہوتا۔ ذریعہ ہندہ کی ہر قید سے آزاد کوششیں یزید کو تخت پر لے آئیں اور دنیا کی زبان سے "امیر المؤمنین"، اور خلیفۃ المسلمین، کے القاب بکھر مانگ لئے بہت جلد اقتدار یزید نے عہدِ عریاں پیدا کر دیا اب وہ عنترت کی پناہ گیریاں آگئیں جہاں دینداری لقل کے طور پر بھی استعمال نہ ہوئی تھی ہائے اس مدت کی بد نصیبی جس کا مطلق العنان آمر یزید ہو۔ آہ ایسا کمینہ کار جانسین پیغمبرؐ سمجھا جائے اس سے زیادہ تعجب اس بات کا ہے کہ اس رند مشرب کے ہاتھ نہ ناعاقبت اندیش مسلمانوں نے بچو شعی یا بجبر و فاداری کی بیعت کر لی۔ اور اسلام کے نظم و نسق کا اس کردار کو وارث تسلیم کر لیا۔ حالات یہاں تک خطرناک ہو گئے اور بہت تیزی سے یہ خطرات رونما ہوئے کہ اگر یزید نے روزِ روشن کو شب کہہ دیا تو حاشیہ نشینوں نے ماہ و یرویں بھی فلک پر پیدا کر دیئے۔ یزید کے اس تسلط عام نے اسلامی زندگی کا معیار ہی بدل کے رکھ دیا تھا۔ اسلام کی وہ روحانیت جس نے میکہ مردہ کے ساتھ سچائی کی تھی۔ اسلام کا وہ زہریں تفکر جس نے طالبانِ رشتہ و راستی کے دل و دماغ کو روشن کئے تھے طاق نیاں کے نقش و نگار بنائے جا رہے تھے جو بائیس اسلام نے ہزاروں ہر دوں میں سمجھی منظور نہ کی

تھیں وہ آج کھلے خزانے اعلانیہ ہو رہی تھیں اور حکومتِ وقت ان کی سرپرستی تھی۔ ظاہر ہے ایسے بڑے آشوب دور میں حتی و صداقت کی بیکسی کس بچا رہتی میں ہوگی وہ اسلام کی جس کی بنیاد مظلوم کی طرف داری پر رکھی گئی تھی آج اس کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہے جو ظلم و جور کو برائی کی جہرست میں سمجھتا ہی نہیں بلکہ اپنے مقصد کی کامیابی کے لئے بہترین ذریعہ جانتا ہے۔ یہ معلوم ہے کہ ہر برائی ظلم کے خفیف سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے ظلم کو ظلم نہ سمجھنا تمام برائیوں کا مرکز ہے جب حالات کی برکتوں اس منزل تک آگئی ہوں تو اس کا جو کچھ نتیجہ ہو سکتا ہے۔ وہ سب اس وقت ہو رہا تھا سچ ہے اس سے زیادہ اسلام پر اور سخت وقت کون سا ہو سکتا تھا یہ اسلام کی خوش بختی تھی کہ اسلام ابھی تک لاوارث نہیں تھا۔ ابھی اس موجود ہیں۔ وہ چٹین جو ابراہیمی امتیاز ہاشمی خصوصیات اور اسلامی نیکوئی کے اپنے زمانہ میں امین تھے۔ حتی و صداقت کی نگرانی شجر اسلام کی نکتہٴ ان کا فریضہ تھا جس کو بچنی امام نے انجام دیا۔ اس حقیقت سے یزید بھی ناواقف نہ تھا اس لئے تختِ شام پر براجمان ہوتے ہی دائی شام کو پر زور طریقہ سے لکھا۔

”جس طرح ممکن ہو حٹین ابن علی سے میری بیعت لے۔ اگر انکار کریں تو ان کا سہ میرے پاس روانہ کر دے۔“

یزید اپنی قہرمانی طاقت پر مغرور تھا سمجھتا تھا ہر طور میرا مدد حاصل ہوگا۔ دونوں صورتوں میں کامیاب رہوں گا۔ (سید المتقیں سے بیعت یزید کا مطالبہ بڑی بڑی بات ہے۔) سوالِ بیعت سامنے آئے ہی انکار فرمادیا۔ اس بیعت کا مطلب امام حسینؑ کو سچے سچے تھے اور اس کے بدترین نتائج سے بچو بی آگاہ تھے۔ مال اندیش حٹین نے کھلے ہوئے الفاظ میں فرمایا۔

”میں یزید کی بیعت کروں۔ ناممکن ہے! یزید اپنے کفر پناہ روئے کو دیکھے

وہ اپنے نازیبا کردار کا جائزہ لے۔ بغیر سوچے سمجھے اس کو مجھ سے بیعت طلب کرنے کا کیا حق ہے۔؟ میں اس کی بیعت پر گزربہ کہوں گا۔"

یزید کی سخت اس انکار کو برداشت نہ کر سکی۔ اسی کی ضد ہے کہ میں بیعت لے کر رہوں گا۔ جس میں کا فیصلہ ہے کہ یہ محال ہے۔

فسطاط بنت یزید نے اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے ایسی ستم آفرینی سے کام لیا جس سے فطرت بھی شرمائی اور روح کمزور بھی بیکراہ ہو گئی۔ امام نے فرمایا "اذا ظلم لڑا اپنے ظلم و جور پر نازاں ہے مجھے اپنی مظلومیت پر فخر ہے تو بے حد ستم ایجادی سے کم کرنے میں بے پناہ مظلومی سے اس کا مقابلہ کروں گا اور اس کا نتیجہ ساری دنیا دیکھ لے گی۔"

یزید کا خیال تھا کہ میں حسین کو ہتہ تیغ کر کے آسودہ ہو جاؤں گا حسین "شہید" کی قدر و منزلت سے واقف تھے اسی لئے شہادت کو اپنا مطمح نظر قرار دے چکے تھے۔ جس کا ثبوت پیغمبر اسلام کی متعدد پیشگوئیوں اور خود امام کے متعدد خطبوں میں پورا پورا موجود ہے۔ اسی لئے کہ دنیا کی ہر چیز فانی ہے مگر شہید نہیں مرنے والا۔ وہ زندہ رہتا ہے اور ابی دنیا جیتا پاتا ہے۔ خون شہادت کا ہر قطرہ ایسے اندر حیات الہیہ کی بالیہ لہ

روح دکھتا ہے جو کبھی فنا نہیں ہوتی اس کے مطلوبہ اور خوش آئند نتائج ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ مظلوم کے خون کا پہلا قطرہ جس وقت بہتا ہے معنوی فتح اس وقت حاصل کر لیتا ہے مقدس اقدار۔ فرزند مندی اور مبارک کارنامی شہید کا حصہ ہے۔ یہ تاج اس کا ہی ہے جو شہادت کے لالہ گول خلعت سے آراستہ ہو جائے، دنیائے دیکھ لیا اور یزید بھی یہ ماننے پر مجبور ہو گیا کہ امام حسین کی زندگی یزید کے لئے اتنی

مہتر تھی جس قدر خطر ناک اس کے لئے حسین کی شہادت ثابت ہوئی۔ کتنی جلد گوشتہ تنہائی میں بیٹھ کر "مائی دلہن" ، کہنا پڑا۔ یزید کی لغت میں آمد نفس کا نام زندگی تھا جس کی ہر طرح نگہداشت کر رہا تھا۔ مگر

حسین کی اصطلاح میں عزت و وقار کا نام زندگی ہے جس پر آمد و شد نفس

قربان کی جاتی ہے۔

بے شک ظاہر میں آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہ یہ تھا کہ امام بے یار و مددگار یکہ و تنہا بیس و مجبور نہ محسوس سے سرتاپا چور کھڑے ہوئے ہیں کثرتِ جراحات سے تن ناز پروردگار رسالت چھلنی ہو رہا ہے لہذا دل کانپ رہا ہے۔ ہاتھ لہر رہا ہے۔ تفصیل بتانے کی طاقت نہیں (صالح ابن وہب مر فی ملوین نے پہلوئے اقدس پر نیزہ مارا حضرت دایس رخسار کے بل کھوڑے سے زمین پر گم سے اور پھر کھڑے ہو گئے شمر لعین نے اپنے الصحاب کو آواز دی۔

"اب تن تنہا کے قتل میں یہ تاخیر کیا دیکھ رہے ہو جلدی کرنا!" یہ سن کر اشقیانے چاروں طرف سے حملہ کر دیا۔ وند بن ستریک نے بائیں شانے پر تلوار لگائی ایک اور لعین نے حضرت کے دوش اقدس پر تلوار کا بھرا پورا وار کیا فرزند رسولؐ منہ کے بل زمین پر گم پڑے پھر سنبھلے

ضعف اور لقا ہمت سے جسم اظہر تھک چکا تھا کبھی حفرہ کھڑے ہوتے تھے کبھی گر پڑتے تھے۔ اسی حال میں "سنان بن انس، نے تابڑ توڑ نیرنگ کے دو وار کئے۔ ایک ہنسلی پر اور دوسرا سینے پر۔ پھر اسی سنان نے بیچھے ہسٹ کر ایک تیر حضرت کے گلے اقدس پر مارا۔ حضرت نے زمین پر گر پڑے پھر اٹھ کر بیٹھے پیر گلے سے نکالا جو خون زخم سے نکلا اس کو اپنے سر اور راتھی پر مل لیا اور ارادت فرمایا۔ "میں اس طرح اپنے نجد سے ملاقات کروں گا"

عمر سعد ملعون نے ایک شخص کو آواز دی کیا دیکھ رہا ہے گھوڑے سے جلدی آ رہا ہے حسین کا کام تمام کر۔ سنان نے ایک تلوار حضرت کے حلق پر لگائی۔ اب امام سر بسجود ہیں کبھی دایاں رخسارہ خاک پر کھتے ہیں یا آباہ کبھی باایاں رخسارہ خاک پر کھتے ہیں کہتے ہیں یا سید آہ۔ آخر میں یہ آیت تلاوت ہو رہی ہے۔

(یا ایہا النفس المطمئنة ارجعی الی ربک و اذنیته مرنیثہ) آہ! اب پلو چھو وہ سر سجود سے کیوں کراٹھا۔ ہائے! ستر

دلہ الحرام آگے بڑھا۔ ارے نہیں قیامت ہوگی! کوئی کہہ رہا ہے۔ قتل الحسینؑ۔ اس آواز کے بعد ظاہر میں آنکھ نے پلٹ کر دیکھا تو جسم اطہر حسینؑ بے سر تھا۔ سیدہ عملین کے دودھ اور لعاب دہن رسالت سے بنے ہوئے خون کے قطرے کہ بلا کی رنگ میں جذب ہو رہے تھے۔ تازہ زخموں میں گرم ریت گھر بنا رہی تھی۔ ہاں ہاں ظاہر میں نگاہ کا یہ بھی مشاہدہ ہے کہ اب حقیقت پر کبھی نظر کرو۔ دیکھو خیر باد یہ نہ کہنا کہ حسینؑ کا خون ہو گیا۔ لا واللہ حسینؑ سرخ رہے ہو گئے۔ ہاں یزید کی تمنا کا خون ہو گیا۔ اب حسینؑ وہ حسینؑ نہیں اب تو بنائے لا الہ الا اللہ بن گئے۔

بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است
پس بنائے لالہ گد دیدہ است!



رمز قرآن از حسینؑ آموختیم
ز آتش او شعلہما افز و خستیم
خون او تفسیر میں اسرار کرد
ملت خوابیدہ را بیدار کرد
تا قیامت قطع استبداد کرد
مزج خوں دلہ او یحییٰ ایجاد کرد

فی الحقیقت اسی پاک خون کا ایک ایک قطرہ جو کہ بلا کی گرم ریت پر بہا تھا۔ انقلاب و تغیرات کے وہ سیلاب پیدا کر گیا جس کو بیہودہ یکتا نہ سکی۔ وہ سلطنت۔ وہ قاہرہ و جابر حکومت جس کی سرحدیں ملتان، فرانس، کے قریب تک جا چکی تھیں اس کی اینٹ سے اینٹ بچ گئی اور ۷۸ سال کے اندر ہی اندر ۱۳۲۲ء میں جو کچھ ہوا اس کو تاریخ سے پوچھئے۔ بنی امیہ کا استیصال۔ ان کے مظالم کا خاتمہ ہوا اور عبرت ناک انداز سے ہوا۔ ممکن ہے کوئی اس کو بنی عباس کی

کامیاب سیاست کا نتیجہ سمجھ لے۔ لیکن حقیقت میں یہ اسی خون کا اعجاز تھا جو ۱۱۰۰ھ میں سرزمین کہ بلا پر بہا گیا تھا۔ کنا رہے بہا یا گیا تھا۔ کیونکہ بنی عباس کی کامیابی کا راز اسی پاکیزہ خون کی حمایت میں مضمر ہے۔ یہ بظاہر مادی کہنتہ ہے۔ لہذا جانی کہ آفات شہادت پر اسلامی دنیا کی آبادی شاہد ہے جو کسی تفصیل کی محتاج نہیں۔ یزید بر باد ہوا۔ جہاں شہادت لڑائی فرمانے والا زندہ جاوید بنا۔ وہ زندہ جاوید جو اسلام کی دائمی بقا و حیات کا ذمہ دار مانا گیا۔ اور وہ زندگی جس کو کوئی طاقت کوئی قوت چھین ہی نہیں سکتی۔

آخر صاحب نے خوب کہا ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

تیرا وجود مگر اے شہید راہ خدا
تغییرات زمانہ کی دسترس میں نہیں
مٹا سکے گا دلوں سے نہ دقت تیری یاد
کہ روشنی کا عمل ظلمتوں کے بس میں نہیں

(بحوالہ "المنتظر" ۵ جون ۱۹۶۴ء)



حُسینی اقدام کا یہ ملاقم

قدیم علماء و مورخین کے بیانات اور ان پر تبصرہ

جب بزرگ کا خط طلب بیعت کے متعلق ولید کے پاس پہنچا۔ شیخ مفید علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں۔

(ترجمہ) ولید نے امام حسین کے پاس شب کے وقت ایک آدمی بھیجا اور آپ کو طلب کیا، حضرت نے سمجھ لیا کہ اس کا مقصد کیا ہے لہذا آپ نے اپنے حضور صہب کی ایک جماعت کو بلا کر فرمایا کہ وہ مسلح ہو جائیں اور کہا کہ ولید نے اس وقت مجھے بلایا ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھ سے کسی ایسے امر کی خواہش کرے گا جسے میں منظور نہیں کروں گا۔ اور وہ خطر سے خالی نہیں ہے لہذا تم لوگ میرے ساتھ رہو۔ اور جب میں اندر جاؤں تو تم دروازے پر بیٹھنا۔ اگر سننا کہ میری آواز بلند ہوئی تو تم میری حفاظت کے لئے اندر داخل ہو جانا۔ (ارشاد)

دیوڑی نے درمیان کے واقعات کی کچھ کڑیاں زیادہ تفصیل کے ساتھ بتائی ہیں، وہ رقم طراز ہیں۔

(ترجمہ) جب بزرگ کا خط ولید کے پاس پہنچا تو وہ پریشان ہو گیا اور اسے فتنہ و شور و شکر کا اندیشہ ہوا لہذا مروان کو بلا بھیجا، حالانکہ ان دونوں کے تعلقات اس زمانے میں کشیدہ تھے۔ مروان آیا تو ولید نے وہ خط دکھایا اور مشورہ چاہا۔ مروان نے کہا کہ عبداللہ بن عمر اور عبدالرحمن

بن ابی بکر کی طرف سے تمہیں کوئی اندیشہ نہ کرنا چاہیے، وہ اس منصب کے کسی حیثیت سے کبھی طلبگاہ نہیں ہوں گے مگر ہاں حسین ابن علی اور عبداللہ بن زبیر کا تدارک تم پر لازم ہے انھیں اسی وقت بلا بھیجو اور اگر بیعت کر لیں تو غیر ورنہ ان دونوں کا سر قلم کر دو۔ اس سے قبل کہ اس خبر کا اعلان ہو اور ان میں سے ہر ایک ایک سمت کو جست دہیز کرنے لگے اور اختلاف ظاہر کرے یہ سن کر ولید نے عبداللہ بن عمر بن عثمان سے جو اس وقت موجود تھا اور وہ بھی کم سن لڑکھواری کے حدود سے قریب تھا، کہا کہ بیٹا تم حسین ابن علی اور عبداللہ بن زبیر کے پاس جاؤ اور انھیں بلا لاؤ وہ لڑکا روانہ ہوا۔ یہاں تک کہ مسجد میں پہنچا۔ دیکھا کہ وہ دونوں بیٹھے ہیں اس نے کہا میرے آپ کو بلا یا ہے دونوں نے کہا کہ تم چلو۔ ہم ابھی آتے ہیں۔ وہ لڑکا چلا گیا ابن زبیر نے امام حسین سے پوچھا، آپ کا کیا خیال ہے، ہمیں اس وقت کیوں بلا یا گیا ہے۔ حضرت نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ معاویہ کا انتقال ہو گیا ہے اور ہمیں بیعت کے لئے بلا یا گیا ہے ابن زبیر نے کہا کہ میرا بھی یہی خیال ہے اور دونوں اپنے اپنے مکان کی طرف واپس گئے۔ امام حسین نے اسے زبیر اور غلاموں کی ایک جماعت کو جمع کیا پھر دارالحکومت کی طرف تشریف لے گئے اور اپنے جوانوں کو جمع دیا کہ وہ دروازے پر بیٹھیں اور جب آپ کی آواز سنیں تو مکان میں داخل ہو جائیں۔

(الخبار الطوال ص ۲۲۸ و ص ۲۲۹)

طبری نے بھی یہ واقعات اتنی ہی بلکہ کچھ اور زیادہ تفصیل سے بیان کئے ہیں۔

جب معاویہ کے انتقال کی خبر ولید کے پاس پہنچی تو وہ گھبرا گیا اور اسے اس کی بڑی اہمیت محسوس ہوئی اور اس نے مروان بن حکم کے پاس آدمی بھیجا اور اسے اپنے پاس آنے کی دعوت دی حالانکہ ولید اب مدینہ کا حاکم ہو گیا ہے اور مروان نے اس پر ناگواری محسوس کی تھی اور ولید نے اس کی بے بسی دیکھ کر اسے اپنے دربار میں کچھ برا بھلا کہا تھا

یہ خبر مروان کو پہنچی تو وہ اس سے کھنچ گیا اور آمد و رفت ترک کر دی۔ یہ حالت یوں ہی قائم رہی اس موقع تک کہ جب معاویہ کی خبر پہنچی تو چونکہ معاویہ کے مرنے اور پھر ان لوگوں سے جن کے نام لکھے گئے تھے، بیعت لینے کے لئے مسئلہ کی اہمیت و لید نے بہت محسوس کی تھی۔ اس لئے جب مروان کو بلایا، ولید نے اسے مزید کا خط پڑھ کر سنا یا تو اس نے کلمہ استرجاع زبان پر جاری کیا اور دعائے مغفرت کی اس کے بعد ولید نے اصل معاملے میں مشورہ چاہا اور کہا کہ تمہاری رائے میں ہمیں کیا صورت اختیار کرنی چاہیے۔ اس نے کہا میری رائے یہ ہے کہ اسی وقت تم ان لوگوں کے پاس آجی کھجی اور انھیں بیعت کرنے اور حلقہ اطاعت میں داخل ہونے کی دعوت دو۔ اگر وہ ایسا کریں تو خیر، ان سے پھر ترض نہ کرے ولیکن اگر انکار کریں تو معاویہ کے انتقال کی خبر ہونے سے پہلے ہی انکی گردنیں مار دو۔ اس لئے کہ اگر ان کو معاویہ کے انتقال کی خبر ہوگئی تو ہر ایک ایک طرف جست کر کے کھڑا ہو جائے گا۔ اور اختلاف کا اعلان کر دیگا اور لوگوں کو اپنی طرف بلا نام شروع کر دے گا۔ پھر کیا جانے کیا نتیجہ ہو، پس ابن عمر کے متعلق میرا خیال ہے کہ وہ جنگ کا ارادہ نہ کریں گے اور نہ خود سے حکومت حاصل کرنے کا ارادہ کریں گے۔ ہاں مگر یہ کہ وہ ان کے سرخوارہ سخوارہ منڈھ دی جائے۔ اس گفتگو کے بعد عبداللہ بن عمر بن عثمان کو جو ایک کس بڑ کا تھا ان دونوں کے پاس بلانے کے لئے بھیجا گیا اس نے دیکھا کہ دونوں مسجد میں بیٹھے ہیں یہ بلانے کیسے وقت آیا تھا جس وقت عموما ولید لوگوں سے ملاقات کے لئے نہیں بیٹھتا تھا اور نہ لوگ ایسے وقت ملاقات کے لئے جلتے تھے اس نے کہا میرے آپ دونوں کو بلوایا ہے دونوں نے جواب دیا کہ جاؤ ہم ابھی آتے ہیں۔ پھر ایک نے دوسرے کی طرف رخ کیا اور عبداللہ بن زبیر نے امام حسین سے کہا کہ آپ کا کیا خیال ہے ہم کو ایسے بے وقت کیوں بلا یا گیا ہے۔ امام نے فرمایا میرا خیال تو یہ ہے کہ ان کا حاکم ہلاک ہو گیا اور ہم کو اس لئے بلا یا گیا ہے کہ خبر

پھیلنے کے پہلے ہم سے بیعت حاصل کر لی جائے۔ انھوں نے کہا کہ میرا بھی یہی خیال ہے اب آپ کا کیا ارادہ ہے، فرمایا کہ میں ابھی اپنے خاندان کے بزرگوں کو بکجا کرتا ہوں اور پھر ولید کے پاس جاؤں گا۔ جب دروازے پر پہنچوں گا تو انھیں وہاں کھڑا کروں گا اور پھر خود اندر داخل ہوں گا۔ عبداللہ نے کہا کہ اگر آپ وہاں جائیں گے تو مجھے آپ کے متعلق خطرہ ہے۔

حضرت نے فرمایا میں جہاد ہا ہوں تو اس وقت جب کہ میں اپنے تحفظ پر قدرت رکھتا ہوں، پھر حضرت اسی صورت سے تشریف لے گئے۔ یہاں تک کہ ولید کے دروازے تک پہنچے۔ اور اپنے ساتھ والوں سے فرمایا کہ میں اندر جاتا ہوں، جب میں تمہیں بکادوں یا تم ولید کی آواز نہ سونے کہ بلند ہوگئی تو سب کے سب اندر داخل ہو جانا۔ اور نہیں تو جب تک میں باہر نہ آؤں تم یہاں سے حرکت نہ کرنا۔

(الطبری جلد ۶ ص ۱۸۹)

مذکورہ بیانات پر جب غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ متفق علیہ ایک واقعہ جو ان سب کے پیش نظر ہے ان میں آپس میں اختلاف کوئی بھی نہیں ہے پس بیان کرنے میں کسی نے اختصار سے کام لیا ہے اور کسی نے تفصیل سے، سب سے زیادہ اختصار شیخ مفید رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے، مگر ایک بات کی تصریح ان کے یہاں زیادہ ہے جو کسی دوسرے کے یہاں نہیں ہے۔ وہ یہ کہ ولید نے امام کے پاس آجی رات کے وقت کھجی۔ دیوڑی اور طبری کسی کے یہاں رات کی تصریح نہیں ہے مگر یہ ہے کہ وہ وقت ایسا تھا جس میں عموما ولید سے ملاقات نہ ہوتی تھی۔

طبری نے کہا ہے، نہ ولید اس وقت کسی کو بلاتا تھا نہ کوئی اس وقت اس کے پاس جاتا تھا۔ اب تک یا تو اسی سے یہ تصور پیدا

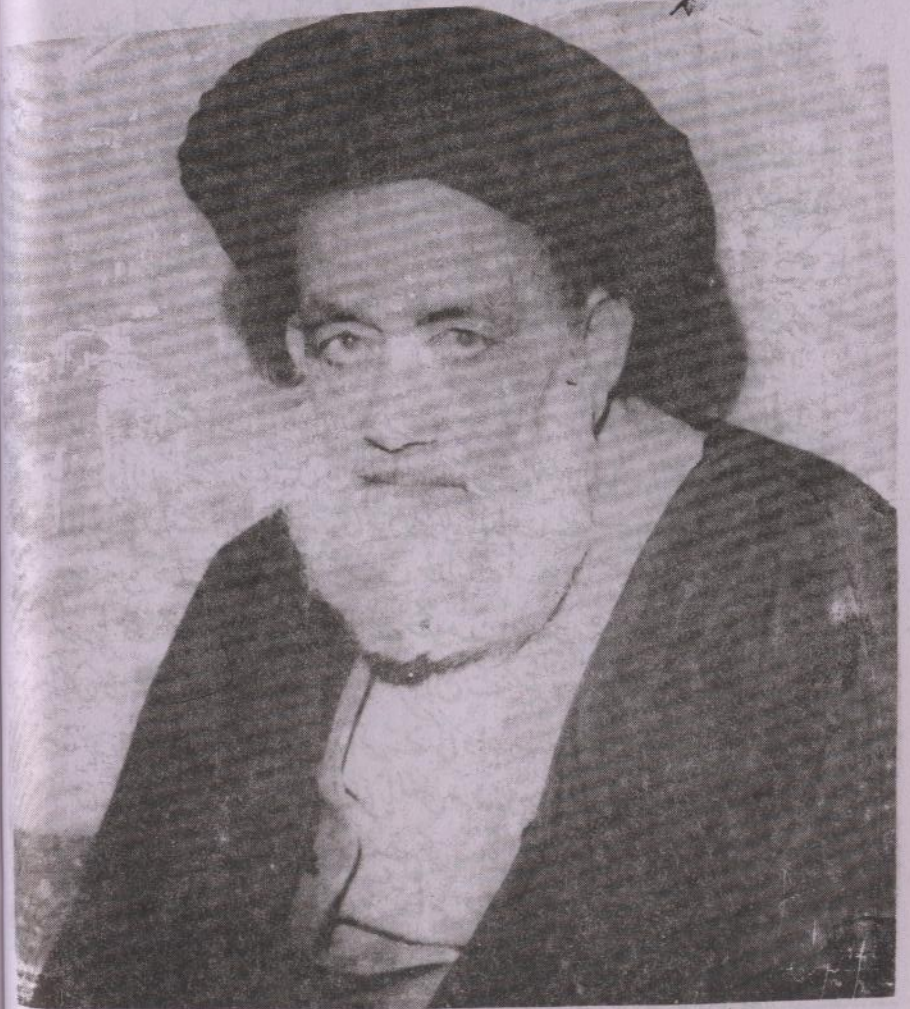
ہوا ہو کہ وہ رات کا وقت تھا یا شیخ مفید رحمۃ اللہ علیہ کے پیش نظر کسی ایسے راوی کا بیان ہو جس نے رات ہونے کی تصریح کی ہو۔

ولید اور مروان کی باہمی نزاع کا اجماعی تذکرہ دینواری اور طبری نے کیا ہے مگر طبری نے اس نزاع کا ابتدائی سبب بھی بیان کر دیا ہے جو بالکل قرین قیاس ہے۔ اس نزاع کے باوجود ولید کا مروان کو مستر رہنے کے لئے بلانا انتہائی اضطراب ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے اور اس سے ظاہر ہے کہ مزید کا خط ولید کے لئے بڑی پریشانی کا باعث بن گیا تھا اور بالخصوص ان افراد سے بیعت کا مطالبہ جن کے نام اس خط میں درج تھے اور پھر اس سلسلے میں جو کچھ اسے ہدایت کی گئی تھی وہ اسے اپنی طاقت سے باہر کی چیز سمجھ رہا تھا، جب ہی اسے اتنی تشویش لاحق ہوئی اور اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، سو اس کے کہ وہ مروان سے مشورہ لے اس لئے بھی کہ مروان کا فی جہان دیدہ آدمی ہے اور اس لئے بھی کہ جو کچھ میں طرز عمل اختیار کروں اور اس کا جو نتیجہ ہو اس کی ذمہ داری میں مروان بھی شریک ہو جائے، کیونکہ یہ میرا بدخواہ تو ہے ہی، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ میری نسبت حکومت وقت کے اس تسمیل حکم میں کوتاہی کا کوئی الزام عائد کر سکے اور چونکہ مزید خود ایک اطہر، جو شیدا اور بے خود و بدمسرت شخص تھا لہذا ولید کو شاید یہ توقع بھی تھی کہ مروان اپنی تجربہ کاری کی بدولت کسی ایسے اقدام کی طرف مشورہ نہ دے جو حالات کی پیچیدگی میں اضافہ کرے اور نتیجہ میں حکومت اموی کے لئے مہتر ثابت ہو۔ اس کے ساتھ ممکن ہے صحابی رسول ہونے کے تخیل میں اسے مروان کی نسبت یہ خوش گمانی بھی ہو کہ اس کے دل میں اتنا خوف خدا ہو گا کہ وہ مجھ کو کوئی ایسا مشورہ نہ دے گا جو بدیہی طور پر غضب الہی میں گرفتار بنانے کا باعث ہو، مگر افسوس ہے کہ اس کے یہ توقعات پورے نہیں ہوئے۔ مروان نے اسے ایسا مشورہ دیا جو اموی خاندان

کا فرد ہونے کے باوجود اسے ناقابل عمل محسوس ہوا اور اس پر عمل نہ کرنے کی بنا پر مروان نے بالآخر خود ہی کسی اور بدخواہ کے ذریعہ سے اس کی شکایت مرکز تک پہنچائی اور اس کے نتیجے میں اسے مدینہ کی حکومت سے ہاتھ دھونا پڑے۔

مروان کا یہ مشورہ دینا کہ اگر یہ دونوں بیعت نہ کریں تو فوراً ان کا سر قلم کر دو اس کی دلیل ہے کہ مزید نے مطالبہ بیعت کے ساتھ پہلے ہی خط میں ولید کو امام حسین کے خلاف ہر مشنہ اقدام یہاں تک کہ قتل کا حکم دے دیا تھا، اور نہ مروان کو یہ مشورہ دینے کی ہرگز ہرگز جرات نہ ہوتی اور اگر وہ ایسی حماقت سے کام لیتا بھی تو ولید اس کے جواب میں کہتا کہ یہ تم مجھے کیسا مشورہ دے رہے ہو۔ مجھے تو صرف سوال بیعت پیش کرنے اور اس پر اصرار کرنے کی ہدایت ہے۔ میرے اصرار کے بعد جو جواب مجھے ملے اس کی اطلاع مجھے مرکز میں بھیجنا چاہیے اور پھر وہاں سے جو ہدایت ہو اس پر عمل کرنا چاہیے۔ میں بطور خود اتنا بڑا قدم کیونکہ اٹھا سکتا ہوں کہ فرزند رسول کا سر قلم کر دوں۔ مگر ولید نے مروان کے جواب میں یہ قانونی عندہ پیش نہیں کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسے اس خونریزی میں مزید کی طرف سے کسی عتاب کا اندیشہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ خود خوفِ خدا سے اپنے کو اس سے قاصر محسوس کر رہا تھا جس کے نتیجے میں اسے حکومت مدینہ سے برطرف ہونا پڑا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ مروان کے مشورہ پر عمل کرتا تو معتوب نہ ہوتا لیکن اس پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے اسے معتوب ہونا پڑا۔ اس سے ان لوگوں کے خیال کی بالکل رد ہو جاتی ہے جو ایسا گمان کرتے ہیں یا سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ مزید بذات خود امام حسین کے قتل کا خواہاں نہ تھا۔ اور یہ ابن زیاد کا بطور خود ایک اقدام تھا۔ اور جس سے متعلق مزید کی کوئی ہدایت موجود نہ تھی۔ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ شروع سے مزید نے طے کر لیا تھا

کہ بیعت نہ کرنے کی صورت میں امام حسینؑ کی زندگی کا خاتمہ ہونا چاہیے جو جسکی تعمیل ولید بن کلبشہ کا۔ اس لئے معذوب ہوا اور ابن زیاد نے اس کی تعمیل کر دی تھی اور اس لئے اس کے اثر اور رسوخ میں اس کے بعد اضافہ ہو گیا۔!



عزائے حسینؑ کی اہمیت

شیعیت، اسلام، مذہب اور انسانیت کے نقطہ نظر سے

غزیر کیجئے اور ان خطرناک راہوں کا مطالعہ کیجئے جن سے شیعیت گزری ہے اور گزرتی رہے اس منزل تک پہنچنے سے لڑ آپ کو معلوم ہو گا کہ حضرت سید الشہداءؑ کی عبادت اور ہی پہلی ایک وہ بڑی چیز تھی جس نے فرقہ شیعہ کو دنیا کے تباہ کن اور انتہائی خطرناک ماحول سے گزرا کر نہ صرف زندہ بلکہ ترقی پذیر صورت کے اس درجہ تک پہنچایا۔

میں سچ کہتا ہوں کہ آئمہ محصورین کی سیاست الہیہ کا غیر فانی کارنامہ ہے جو ہم سید الشہداءؑ کو اتنی اہمیت دے کہ شیعیت کو حیات جاوید عطا کر دی۔

آپ دیکھئے، تو وہ زمانہ کہ جس وقت شیعیت ممکن نہ تھا جس وقت ہم حق کی آواز بلند نہ کر سکتے تھے جس وقت خاندان اہلبیت کے افراد کا نام لینا جرم، جس وقت علی ابن ابی طالب سے نقل حدیث کرنا گناہ تھا اس وقت کیا ممکن تھا کہ آئمہ اہلبیت کا کوئی نام لیا بھی دنیا میں باقی رہے یا شیعیت کا خیال بھی ہمیں قائم رہ سکتا تھا مگر وہ صحیح نباضِ فطرت بشری کے تھے انہوں نے وہ چیز ڈھونڈی جو ہزار مذہبی تعصب کے پتھروں میں بھی فطرتِ انسانی کو متاثر نہ بنا سکتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم سے متاثر ہونا کسی شخصیت اور کسی شخص کی اہمیت پر موقوف نہیں ہے۔ یعنی فرض کیجئے کہ آپ کو اس شخص سے کوئی تعلق

ہمیں بلکہ آپ اسی شخص کو ہی مانتے بھی نہیں کہ کون ہے لیکن اگر کچھ دلہ روز واقعات کا اس کے ساتھ تعلق ہے تو وہ ان ہی واقعات کی بناء پر آپ سے رویت ناس ہو جائے گا۔ اس کا بیزت میں آپ کی فطرت کے حوالے سے جسے سکتا ہوں خصوصاً ہمارے آج کل کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اکثر اس کے محسوس کرنے کا اتفاق ہوتا ہوگا۔ جھوٹے ناول، غلط افسانے جنکے متعلق آپ کو یقین ہے کہ کہنے والے نے کسی حقیقی واقعے پر اس کی بنیاد نہیں رکھی ہے اور کسی سچے انسان کا اس میں تذکرہ نہیں ہے بلکہ صرف تمثیل اور خیال ہے یہ آپ طے کر کے اپنے مقام پر اس کتاب کو پڑھئے۔ ظاہر ہے کہ یہاں شخصیت کوئی ہے ہی نہیں جس کا اثر دل پر پڑے گا مگر پھر بھی اگر کچھ ایسے مناظر پیش کر دیئے گئے ہیں جو دلہ روز اور اندوہناک ہیں تو پڑھنے والا متاثر ہوتا ہے۔ اور کبھی کبھی ایسا متاثر کہ اس کا بات کرنے کھانا کھانے اور ہنسنے کو دل نہیں چاہتا یہ کیا ہے دل میں انسان سمجھ رہا ہے کہ کسی شخص سے متعلق نہیں اور اس کی کوئی اصلیت نہیں مگر مصیبت وہ چیز ہے کہ اس کا نیز واقعی خیال اور غلط تصور کبھی انسان کو اتنا متاثر کر سکتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی مسرتوں کو بھول جائے اور اس غم کو یاد رکھے جس کی کوئی اصلیت نہیں۔

پالسی، شاعر کا دردناک شعر جس میں کسی خاص دلہ روز کیفیت کا مرقع کھینچا گیا ہو اہل حقل ایسے شعر پر کہ دھننے ہیں اور ہنسنے والے متاثر ہوتے ہیں یہ کیسا ہے؟ صرف یہی کہ درد و مصیبت کا تخیل بھی کسی نہ کسی حد تک درد و مصیبت کا حامل ہے۔

حیثین کی شخصیت میں ان تمام خیالی مصائب نے واقعیت کی شکل اختیار کر لی ان مصائب کا تذکرہ کوئی ایسا انسان سنے جو حیثین کو نہ جانتا ہو کوئی ایسا شخص سنے جو رسول سے بھی واقف نہ ہو یا حیثین کا رشتہ رسول نہ جانتا ہو بلکہ واقعہ کہ بلا کو آپ پیش کیجئے بالکل مبہم طور پر نکال دیجئے حیثین کا نام، نہ کیجئے رسول کا فرزند۔ بس فقط واقعات کو بیان کیجئے تو ضرور ہنسنے والوں کو ہمدردی پیدا ہوگی اور ان کے دل پر اثر پڑے گا

اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہ واقعات کس ہستی سے تعلق رکھتے ہیں؟ اس کی جستجو پیدا ہوگی اور جب یہ معلوم ہو کہ یہ اپنے زمانہ میں ایک عظیم المرتبہ انسان تھا تو وہ اس کے حقیقی درجہ اور عظمت کی تحقیق کرے گا۔ اور حقیقت کے نقطہ نظر سے قریب آئے گا۔

(۲)

یہ ملت اسلامیہ کی بدقسمتی ہے کہ مظلوم کہ بلا کی ہستی کو ایک فرقہ دارانہ حیثیت دے دی گئی ہے یہ دیکھنا چاہیے کہ حضرت امام حسین نے یہ تمام مصائب کس لئے برداشت کئے؟ دین اسلام کی خاطر تو پھر کیا یہ اسلام کی حقانیت کی دلیل نہیں ہے؟

مظلومیت وہ کشش ہوتی ہے کہ جن اقوام و مذاہب کے یہاں اس جنس کی قحط ہے وہ کشش کر کے اپنے یہاں مظلوم تراشتے ہیں اور ان کی یادگار میں قائم کرتے ہیں دیکھئے عیسائیوں کے یہاں مظلومیت کی نغمہ ساختہ حکایات اور ان کی نشرو اشاعت کی کوششیں۔

پھر کیا یہ مسلمانوں کے لئے نہیں ہے کہ وہ اپنے حقیقی مظلوم کو دنیا کے سامنے پیش کریں۔ اور اس کی مظلومیت کی لاندوال یادگار میں قائم کریں۔

(۳)

اب میں اپنے الفاظ میں زیادہ وسعت پیدا کرتا ہوں حیثین کی شخصیت صرف اسلام سے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ اس وقت مذہب اور لاندہمیت کی جنگ جو برپا ہے اس میں اہل مذہب کو اپنے مشترک نقطے کی حمایت میں اس واقعہ کہ بلا سے بہتر کوئی کو ہی نہیں مل سکتی یہ کہہ دینا کہ مذہب ایک "خیال" ہے، یہ کہہ دینا کہ مذہب کوئی ٹھوس حقیقت نہیں ہے یہ کہنا کہ مذہب موبہومہ روایات کا نام ہے یہ سب کہنا غلط ثابت ہوتا ہے کہ بلا کے جنگل میں بھلا خیال میں یہ طاقت کہاں کہ وہ حیات کا مقابلہ کر سکے کچھ تو ہے ان دیکھے خیر کے ماننے والوں

کے دل میں حقیقت کا جوہر، تیس ہزار کا لشکر ایک طرف اور وہ ایک خدا کا بندہ انتہائی مختصر جماعت کے ساتھ ایک طرف بلکہ ایک وہ وقت بھی آتا ہے جبکہ مظلوم بالکل ہی یکہ و تنہا کھڑا ہوا ہے مگر اس میں ہزار کے لشکر کی ہیبت اس کو متاثر نہیں بناتی کیا مذہب کی اس طاقت کا مظاہرہ واقعہ کہ بلا سے بہتر کبھی ہوا ہے؟

(۲۷)

اس مظاہرے کے لئے انتظامات بھی سیدالستہدائے نے بے نظیر کئے تھے دنیا کے قائدین کو شش کو شش کرتے ہیں کہ جویش انگریز لہڑیوں سے، پڑ اثر الفاظ سے ان لوگوں میں کہ جن میں ہمدردی نہیں ہے اپنے ساتھ ہمدردی پیدا کریں اور اپنے معاہدین کی تعداد بڑھا لیں مگر حسین کا طرز عمل بالکل اس سے مختلف تھا وہ کو شش کر کے اپنے ساتھ والوں کو الگ کر رہے تھے۔ کہ بلا کے راستے میں کو شش کی، شب عاشورا کو شش کی کہ جو لوگ جانا بچا ہیں وہ چلے جائیں۔ یہ کیا بات تھی؟ صرف یہ کہ قیامت کے لئے وہ حق و باطل کا ایک لختہ پیش کر رہے تھے انھیں یہ منظور نہ تھا کہ حق کے دامن پر کوئی دھبہ رہ جائے۔ اگر کسی ایک فرد میں بھی کمزوری کا رہ جاتی ہے تو حق خالص حق نہ رہتا اس لئے جن میں نے کہ بلا کے خونیں مرتعے کو بالکل خالص نکھرا ہوا صاف رکھنے کی کامیاب کو شش کی۔ اس طرح کہ جمع کو چھانٹ دیا صرف چھنے ہوئے منتخب لوگوں کو اپنے ساتھ رکھا۔ بھرپور انتخاب اور مردم شناسی دیکھئے۔ مدینہ میں بنی ہاشم کا دائرہ کتنا وسیع تھا مگر مجھے نہیں معلوم کہ اولاد ابوطالب کتنے سو اسی کو اپنے ساتھ لیا ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنی ہاشم میں بھی سب پر اعتماد نہیں تھا اور بہت سے ایسے لوگ بھی جدا کر دیا تھا مگر جو جدا تھے انھیں خط لکھ کر کہ بلا بھلا یا گیا تھا اس سے بڑھ کر انسان کی فطرت شناسی کیا ہو سکتی ہے؟ اب کوئی دیکھے کہ جن لوگوں کو امام کی نقاد فطرت نگاہ نے منتخب کیا تھا ان میں سے کسی میں نگاہ کی چوک تو ثابت نہیں ہوتی؟ تاہی اور اق

میں ان کے حالات سامنے ہیں اتنی ہم آہنگ جماعت، ایک رنگ جماعت، ایک دل اور ہم دست جماعت، دنیا کے پورے پورے دکھلائی ہی نہیں دی میں سچ کہتا ہوں کہ مخالفت درکنار ان لوگوں میں کسی ایک موقع پر اختلاف رائے تک نظر نہیں آتا چھ نہ سہی یہی ہوتا کہ کسی وقت امام روکتے ابھی جنگ شروع نہ ہو اور اصحاب مہر سوتے کہ نہیں اب حملہ کر دیجئے آپ رسولؐ کی لڑائیوں میں دیکھ لیجئے۔ ان مواقع کا ذکر نہیں جہاں لوگ ساتھ چھوڑ کر چلے ہی گئے۔ نہیں ایسے مواقع بھی ہیں کہ رسولؐ کی رائے ہے کہ جنگ مدینہ میں رہ کر کی جائے مگر لوگ کہتے ہیں کہ نہیں مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کیجئے یہ تو محمودا فطرت کا تقاضا ہے کہ دس آدمی بھی ایک جگہ جمع ہوں تو کسی کی رائے کچھ ہوگی کسی کی کچھ مگر کہ بلا کی تاریخ میں چھوڑ کر یہی نظر آتا ہے کہ حسینؑ دل کی حیثیت رکھتے ہیں اور تمام اصحاب و انصار اعز او اقارب اعضاء و جوارح بنے ہوئے ہیں وہاں اختلاف رائے کا نشان تک نظر نہیں آتا بلکہ منشاء امام کے سامنے کسی کی رائے کچھ محسوس ہی نہیں ہوتی۔ انھوں نے مبتلا دیا کہ ایک قائد، رہنما اور سردار کی متابعت کے کیا معنی ہیں اور ایک امام کی پیروی کس طرح ہوتی ہے؟

(۵)

عالم انسانیت کے لئے کہ بلا کے واقعے میں سبق ہیں۔ متحدہ انسانیت کے پرچھے اٹتے ہیں خود عرضی، جانبداری اختلاف اور باہمی کش مکش سے، کہ بلا والے حسینؑ اور ان کے ساتھیوں میں حالت یہ نظر آتی ہے کہ ایک دوسرے سے پہلے جان دینے میں سبقت کر رہا تھا ہر ایک اپنے سب سے زیادہ قریب عزیز کو دوسرے سے پہلے جان دینے کی تلقین کر رہا تھا ہر ایک اپنے سب سے زیادہ قریب عزیز کو دوسرے سے پہلے میدان شہادت میں بھیجنے پر تیار تھا۔ حسینؑ کی آواز، حسینؑ کا نظریہ اسب کا نظریہ تھا وہاں اختلاف کا نام نشان نہ تھا اور سب ایک مقصد کی طرف،

ایک علم کے نیچے، ایک دلوئے، اور ایک عزم ایک صدا اور ایک آہنگ کے ساتھ جا رہے تھے۔

دنیا کے انسانیت سے کہو کہ زندگی کی شاہراہ پر حسینیت کے سائے میں آگے بڑھے تو بنی نزع انسان کی باہمی کشمکش ختم ہو جائے اور دنیا ایک نقطے پر مجتمع نظر آئے۔

مسلمانوں سے کہو کہ جہاد للبقاؤ کے لئے حسین کے دامن سے تمسک کریں تو اقوام عالم میں ان کی ہستی پائیدار بنے گی اور ان کی کشتی بجات کے ساحل پر پہنچ جائے گی۔

• شیعوں سے کہو کہ تم سچے معنی میں حسین بنو۔

• حسین کی عواداری رسم کے طور پر انجام دینے کے ساتھ ساتھ امام حسین اور انصار حسین کے حالات سے سبق حاصل کرو تو تمہارا وجودہ انتشار و افتراق دور ہو جائے اور تم کسی ایک سچے رہنما کی سرپرستی میں اپنے قومی حقوق حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کرو گے۔



معراج انسانیت سیرت میں علیہما السلام کی روشنی میں

انسان کی بلندی عقل و تدبر کے استعمال اور فرق شناسی میں ہے اسی صفت کے کمال اور نقص سے اس کی بلندی اور پستی کے حدود متعین ہوتے ہیں یہی وہ تقویٰ ہے کہ جسے قرآن نے معیار فضیلت بشری قرار دیا ہے۔

(یعنی) تم میں زیادہ صاحب برکت وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار رہے۔ فرائض ہمیشہ ایک ہی شکل و صورت پر نہیں ہوتے کوئی بڑے سے بڑا حکیم و دانت مند فرائض کی کوئی ایسی فہرست نہیں مرتب کر سکتا جو ہر شخص کے لئے ہر حال میں قابل عمل ہو۔

فرق شناس انسان کا عمل انتہا پسندی کے دو لفظوں کے درمیان ہوتا ہے اسی کا نام عدل و اعتدال ہے جو حسن اخلاق کی جان ہے۔

چنانچہ پیغمبر اسلام نے تیرہ سال کی عمر یعنی ہجرت کے بعد تک کبھی لوہار نیام سے نہیں نکالی مگر مکہ معظمہ میں قیام کے بعد جب منکرین کی طرف سے جارحانہ اقدام ہو گیا تو اس کے بعد بد رہے، اُحد ہے، خندق ہے، خیبر ہے اور حنین ہے لیکن جب خود زیارت کعبہ کی نیت سے مکہ معظمہ کی طرف گئے تو

تو باوجودیکہ اس وقت ساتھ میں وہی بلند حوصلہ فتوحات حاصل کئے ہوئے رہا تھا جو ہر میدان سر کرتے رہے اور سامنے مکہ میں وہی شکست خوردہ جماعت تھی جو ہر میدان میں ہارتی تہی تھی مگر پیغمبر خدا نے صلح فرما کر واپسی اختیار کی اور صلح بھی ایسی شرف انگیز جن سے عام طور پر مسلمانوں میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی اور وہ انہیں اپنے

لے تو میں آمیز خیال کرتے تھے۔

اسی طرح حضرت علی بن ابی طالب آپ نے تقریباً چوبیس برس کی عمر تک ایک دفعہ بھی تلوار نیا م سے نہیں نکالی حالانکہ ان کے مرنے پر حضرت پیغمبر خدا کے جسم مبارک پر پیغروں کی بارش ہوتی تھی اور طرح طرح کی ایندلیں پہنچتی تھیں مگر وہ اس نغمہ ہی میں اسے محسوس کرتے تھے کہ فرمان ایزدی انہی رسول کے لئے جنگ کا نہیں آیا ہے لہذا ان کے کسی پیرو کا بھی کوئی اس طرح کا اقدام درست نہیں ہے مگر جب حکم جہاد آگیا تو اب ہر میدان میں علی ہی علی نظر آتے ہیں۔ بدر و احد خندق اور خیبر، ہر بڑی جنگ کے فاتح حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام ہی ہیں لیکن حدیبیہ میں جب رسول صلح پر مامور تھے تو دوسروں کی زبان پر جوش میں نہ جاتیں کیا کیا آ رہا تھا مگر علی کی زبان سے ایک دفعہ بھی نہیں نکلا کہ ہم صلح کیوں کریں بلکہ جس طرح جنگ میں علم ان کے ہاتھ میں ہوتا تھا اسی طرح آج صلح نامہ کے لکھتے وقت قلم ان کے ہاتھ میں تھا اور پھر رسول کے بعد تو چھپیس برس خاموشی میں گزار دیئے اور کتنے ہی جوش میں آنے والے حالات کے باوجود تلوار نیا م سے نہیں نکالی لیکن آخر عمر میں پھر جب فریضہ جہاد ذمہ پر آیا تو جمل اور صفین اور نہروان کے معرکوں میں وہی تلوار چمکتی نظر آئی جو پہلے بدر و احد و خیبر میں چمک چکی تھی۔

اب جبکہ حضرت پیغمبر خدا کی واحد زندگی میں مختلف نمونے سامنے آئے جو بظاہر متضاد ہیں۔ حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی واحد زندگی میں ایسی ہی مثالیں سامنے آئیں لہذا اب اگر دو شخصیتوں میں باقیقت کے حالات اس طرح کی دو رنگی نظر آئے لہذا اس کو اختلاف طبیعت یا اختلاف رائے کا نتیجہ سمجھنا کیوں کہ درست ہو سکتا ہے اور یہ کیوں کہا جائے کہ حسن مجتبیٰ طبعاً صلح پسند تھے اور امام حسین طبعاً جنگ پسند تھے بلکہ یہی کہنا چاہیے کہ اس وقت کے حالات کا تقاضا وہ تھا اور اس وقت کے حالات کا تقاضا یہ ہے اس وقت حسن مجتبیٰ امام تھے ان کو فریضہ الہی وہ محسوس

ہوا اور اس وقت حسین بن علی علیہ السلام امام تھے ان کو فریضہ کربانی اس وقت کے حالات میں یہ محسوس ہوا نہ اس میں جذبات کا کوئی دخل تھا اور نہ اس میں! اور یہی وہ حقیقت ہے جس کا حضرت پیغمبر خدا نے مختلف الفاظ میں پہلے سے اظہار فرمادیا تھا کبھی ان الفاظ میں کہ

ابتسای ہذا ان امامان قداما وقد

”یہ میرے دونوں فرزند امام ہیں چاہے کھڑے ہوں اور چاہے بیٹھے ہوں“

اس وقت کی دنیا سے نہیں سمجھ سکتی تھی کہ امام کہنے کے ساتھ

قاما وقد ان کے کہا جا رہا ہے، امامت میں اٹھنے اور نہ اٹھنے کا کیا دخل۔ مگر جب تقبل نے واقعات پر سے پردہ ہٹایا تو اب یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام ماضی کے آئینے میں مستقبل کا نقشہ دیکھ رہے تھے کہ ایک صلح کے بیٹھ جائے گا اور ایک تلوار لے کر کھڑا ہو جائے گا کچھ لوگ حسن کی صلح پر اتر اتر اتر کریں گے اور کچھ حسین کی جنگ پر۔ آپ نے اسی لئے ارشاد فرمایا۔ کہ یہ دونوں امام ہیں چاہے کھڑے ہوں اور چاہے بیٹھے ہوں یعنی حسن صلح کر کے بیٹھ جائے لہذا اتر اتر نہ کرنا اور حسین تلوار لے کر کھڑا ہو جائے لہذا اتر اتر نہ کرنا۔ وہ بیٹھنا بھی حکم خدا سے ہے اور یہ کھڑا ہونا بھی حکم خدا سے ہے۔ وہ اس وقت کے حالات کا تقاضا تھا اور یہ اس وقت کے حالات کا۔

اور کبھی اس طرح جسے علامہ ابن حجر نے لکھا ہے کہ سیدہ عالم ایسے والد بزرگوار حضرت رسول اللہ صلعم کے پاس دونوں شہزادوں کو لیکر حاضر ہوئیں اور عرض کیا۔

یا ابت ہذا ان ابناک املہم

”اب جان! یہ دونوں بچے آئے ہیں۔ انہیں کچھ عطا فرمائیے۔“

حضرت نے فرمایا۔

اما الحسن فقلہ حللی وسودی واما الحسین فقلہ جراتی وجوہی۔

مطلب یہ ہوا کہ انھیں اور کسی عظیمی کی ضرورت نہیں پکان میں تو میری صفتیں تقسیم ہو گئی ہیں جس میں میرا حلم ہے اور میری شان سردی کا اور حسین میں میری بڑاوت و ہمت ہے۔ اور میری فیاضی! اب اس تقسیم پر غور کیجئے معلوم ہوتا ہے کہ ظرف زمانہ کے لحاظ سے جس کو جس صفت کا مظہر بننا تھا اسی صفت کو رسول نے اپنا قرار دیا تاکہ اس صفت سے جو کارنامہ ظہور میں آئے۔ وہ کسی مسلمان کے نزدیک قابل اعتراض نہ ہو سکے۔ اب اس کا مطلب یہ ہوا کہ حسن کی صلح حسن کی طبیعت کا تقاضا نہ سمجھنا بلکہ وہ میرے حلم کا نتیجہ ہے اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ اس موقع پر میں ہوتا تو وہی کہنا جو حسن کرے گا۔ اور حسین کی جنگ کہ حسین کی طبیعت کا تقاضا نہ سمجھنا بلکہ وہ میری بڑاوت کا نتیجہ ہے اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس موقع پر میں ہوتا تو وہی کہنا جو حسین کرے گا۔ اب حسن کی صلح پر اعتراض رسول کے حلم پر اعتراض ہے۔ اور حسین کی جنگ پر اعتراض رسول کی بڑاوت پر اعتراض ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حسن نے صلح کر کے جہاد حسین علیہ السلام کا پیش نظر تیار کیا۔ وہ صلح اس وقت نہ ہوتی تو اس کے بعد جہاد کا یہ ہنگامہ نہ آسکتا کیونکہ اسلام میں جنگ بہ مجبور ہی ہوتی ہے اس وقت جب صلح کا امکان باقی نہ رہے جب تک اصول کے ساتھ صلح کا امکان رہے اس وقت تک جنگ کرنا غلط ہے پھر جب کہ آئین اسلام میں صلح کا درجہ جنگ پر مقدم ہے تو اگر امام حسن صلح نہ کر چکے ہوتے تو اہتمام حجت نہ ہوتی اور حضرت امام حسین کے لئے جنگ کا موقع پیدا نہ ہوتا۔

امام حسین علیہ السلام کے شرائط صلح پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا اور اس صلح کے شرائط میں ان مفاد کا پورا پورا تحفظ کیا گیا تھا جس کے لئے پھر کہ بلا کی جنگ ہوئی۔ یہ نہ دیکھئے کہ ان شرائط پر عمل ہوا یا نہیں بعد میں عمل تو حدیبیہ کی صلح کے شرائط پر بھی نہ ہوا تھا مگر جب تک صلح کا معاہدہ وقوع میں نہ آئے فریق مخالف پر شرائط کی خلاف ورزی

کا الزام ہی کہاں عائد ہو سکتا ہے تاکہ جنگ کا پورا زبیدا ہو۔ وہاں جب حدیبیہ کے شرائط پر عمل نہ ہوا تو معرکہ کربلا قائم ہوا۔

معلوم ہوا کہ یہ تاریخی واقعات کی رفتار کا لازمی اقتضا تھا کہ اس وقت صلح ہو اور اس وقت جنگ ہو اور وہ حصہ وقت کا امام حسن کے حصے میں آیا اور یہ ہنگام امام حسین علیہ السلام کے حصے میں آیا اگر معاملہ بالعکس ہوتا یعنی صلح کربلا میں امام حسن ہوتے تو وہ صلح امام حسین کرتے اور اگر صلح کربلا میں امام حسن موجود ہوتے تو یہ جہاد امام حسن علیہ السلام فرماتے۔

حضرت امام حسن علیہ السلام جلنٹے تھے کہ میرا جہاد ہے صلح کرنا۔ ان کی صلح مقتضائے شجاعت تھی اور امام حسین علیہ السلام کا جہاد تھا یزید کے مقابلے میں تلوار کھینچنا یہ ان کی شجاعت کا مظاہرہ تھا کیوں کہ جس طرح علمائے اخلاق نے بیان کیا ہے شجاعت ہر موقع پر تلوار لے کر بڑھ جانے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ شجاعت قوت غضب کے تابع حکم عقل ہونے کا نام ہے اور یہ قوت غضب کے اعتدال کا درجہ ہے۔ اگر انسان نے بے موقع غضب سے کام لیا اور قدم آگے بڑھا دیا تو "ہتور" ہوگا۔ اور اگر موقع آئے پر بھی کمزوری دکھائی تو اس کا نام جس ہوگا یہ دونوں چیزیں شجاعت کے خلاف ہیں۔ شجاعت یہ ہے کہ بھل قدم آگے نہ بڑھے اور محل آنے پر خاموشی نہ ہو۔ ان دونوں رخصوں کو حسن و حسین علیہما السلام نے پیش کیا اور اس طرح دونوں نے ملکر شجاعت کی مکمل تصویر کھینچ دی۔

پھر یہ واقعہ ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے بھی صلح کی کوشش میں کوئی کمی نہیں کی یہ تو فریق مخالف کا طرز عمل تھا کہ اس نے وہ تمام شرائط مسترد کر دیئے اگر دشمن شرائط کو منظور کر لیتا تو کارنامہ کربلا بھی صلح پر ختم ہوتا۔ اس کے بعد کسی کو یہ کہنے کا کیا حق ہے کہ امام حسن علیہ السلام طبعاً صلح پسند تھے۔ اور امام حسین علیہ السلام نسبتاً جنگ پسند تھے۔

وہاں امیر شام نے سادہ کاغذ کھینچ دیا تھا کہ حسن مجتبیٰ علیہ السلام جو



بین الاقوامی شہید اعظم حسین ابن علی

الحمد لله رب العالمين والصلوة على
سيد الانبياء والمرسلين وآله الطيبين الطاهرين
آج جب کہ کائنات میں فرقہ وارانہ نعروں کی آواز گونجی ہوئی ہے
ہے آنکھیں فرقہ پرستی کے مناظر دیکھنے کی عادی ہو چکی ہیں اور دل و
دماغ فرقہ بندی سے تخیلات سے پر ہیں، یہ کہتا کہ حسین کی ذات فرقہ
بندیوں سے بالاتر ہے بظاہر غلط معلوم ہوگا۔ جبکہ یہ ظاہر ہے کہ
حسین کی ذات کا تعلق ایک خاص فرقہ سے ہے۔ یہ ایسے معنی کہ حسین
اسلام کے پیرو تھے۔ بے شک حسین کا تعلق ایک فرقہ سے ہے بایں معنی
کہ حسین مسلمانوں میں پیدا ہوئے اور بے شک حسین کا تعلق ایک ہی
فرقہ سے ہے بایں معنی کہ حسین پیغمبر اسلام کے نواسے تھے لیکن جس
طرح کوئی دریا باوجود یکہ کسی ایک ہی تہذیب زمین سے نکلا ہو۔ مگر
جہاں جہاں تک پہنچتا ہے ہر قوم کو فیضیاب کرتا ہے جس طرح سورج
مشرق سے نکلنے کے باوجود مغربی ممالک کو بھی اپنی ہلو فستائینوں سے
موزر کر دیتا ہے جس طرح بادلوں کا ایک سمت سے اٹھنا دوسری طرف
کی خشک زمین کو سیراب کرنے سے نہیں روکتا۔ اسی طرح حسین کی شخصیت
کا عرب قوم میں اور اسلام کے مذہب میں پیدا ہونا ان کو بلحاظ افادیت

جو شرائط چاہیں لکھ دیں۔ امام حسن علیہ السلام نے شرائط لکھے اور امیر شام نے
ان کو منظور کر لیا اور امام حسین علیہ السلام کے سامنے تھا یہ یہ ایسے شخص کی
بیعت کا سوال! جسے آل محمد میں سے کوئی بھی منظور نہ کر سکتا تھا۔
امام حسین علیہ السلام زندگی کے اس ایک دن یعنی عاشورہ کو ہی حسین
نہ تھے وہ اپنی زندگی کے ۵۴ برس میں ہر دن حسین تھے۔ پھر آخر ایک دن
کے کہ دار کو سامنے رکھ کر کیوں رائے قائم کی جاتی ہے؟ اس ایک دن کو نکال کر
جو ستاون برس ہیں وہ ان کی فہرست حیات سے کیونکر خارج ہو سکتے
ہیں۔ اسی طرح حضرت امام حسن علیہ السلام صرف اس دن جب صلح نامہ
پر دستخط کئے تھے اسی وقت امام حسن نہ تھے۔ حسن نام تو اس پوری زندگی
کا تھا لہذا آپ کی پوری زندگی کو سامنے رکھ کر رائے قائم کرنا درست
ہوگا اور اگر صرف ایک حصہ حیات کو سامنے رکھ کر تصویر کھینچی جائے گی
تو یہ ایسا ہی ہوگا جیسے رسول اللہ صلعم کے صرف دو روز جہاد کو دیکھ کر کچھ لفظین
اسلام نے آپ کی یہ تصویر کھینچی کہ آپ کے ایک ہاتھ میں تلوار ہے اور
ایک ہاتھ میں قرآن! جس طرح یہ تصویر غلط ہے اسی طرح امام حسن علیہ السلام
کی تصویر صرف صلح کو سامنے رکھ کر اور امام حسین علیہ السلام کی تصویر صرف
ان کی جنگ کو دیکھ کر! بیشک یہ غلطی اتنی عام ہے کہ ان کے نام لیا تاک
اور ان کی سیرت و کردار کی پیروی پر زور دینے والے بھی ان کا وہی
صرف ایک کردار جانتے اور اسی کو پیش کرتے ہیں اسی لئے تقریروں
میں گمراہی پیدا کرنے کے لئے اور کسی بڑے معرکے میں قدم بڑھانے کے لئے
نون میں جو شہید کرنے کے واسطے حضرت امام حسین علیہ السلام کا نام
لیتے اور ان کے کارنامے کو یاد دلاتے ہیں چاہے مقصد صحیح ہو یا غلط اور
وہ جو اپنی تمام عمر شہادت سے ایک دن پہلے تک معرکہ آرائی کو مالتے رہے
وہ گویا امام حسین علیہ السلام کا کردار نہیں ہے بلکہ کسی اور کا ہے پوری تصویر
تو اسی وقت ہوگی۔ جب پوری سیرت کو سامنے رکھ کر تصویر کھینچی جائے۔
(بحوالہ شیعہ اپریل ۱۹۶۷ء)

کے پیرو ہو گئے تھے۔

موجودہ خلفائے اور ہنگامہ آرائیوں میں ہمارا اور آپ کا مشابہہ ہے کہ ننانوے فیصدی لوگوں کا رجحان طبع اس طرف ہے کہ دوسری قوم کی خرابیوں کو مبالغہ کے ساتھ بیان کیا جائے اور اپنی قوم کے مظالم کی پردہ پوشی کی جائے یہاں تک کہ جو بڑے افراد اپنی قوم کی زیادتیوں کا ذکر کرتے ہیں انھیں بھی دو طرفیوں سے ہلکا کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں ایک یہ کہ ہماری قوم نے جو مظالم کئے وہ دوسروں کے مقابلے میں کم ہیں دوسرے یہ کہ پہلے دوسروں نے کی تھی ادھر سے جو کچھ ہوا وہ جواب میں ہوا۔ چھ طرفوں کی یہ کوشش ہوتی نظر ہے کہ عوام اس کے معنی کیا سمجھ سکتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر قوم کے افراد یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ جو کچھ انھوں نے کیا وہ اگرچہ بڑا ہوتا مگر اس لئے اب بڑا نہیں کہ جو ابی طور پر کیا گیا۔ یا یہ کہ جو کچھ کیا دوسرے فریق کی برائیوں سے وہ کم ہے اس لئے اسے قابل الزام نہیں سمجھنا چاہئے اس ذہنیت کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ عام افراد تو اذن برابر کرنے کے لئے اور زیادہ تشدد و بربریت کا ثبوت دیتے ہیں۔ اس کے بعد منتقمانہ کاروائیاں دوسری طرف سے شروع ہو جاتی ہیں اس طرح قتل و غارت کا لامتناہی سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔

امام حسین کی تعلیم یہ ہے کہ تم غیروں کے نیوے دیکھنے کے بجائے خود اپنے ناقص برہنہ کو اور ان ہی کو سب سے زیادہ اہمیت دو۔ حقیقی پہنما کا یہ فرض ہے کہ وہ عوام کو ان کی غلطیوں پر سختی سے متنبہ کرے اور دوسرے فرقے کی بد اعمالیوں کے تذکرے کو خفیف سمجھ کر ان کو اتنی اہمیت نہ دے تاکہ لوگوں کی نظری غلطیوں پر پڑے اور اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں کتنے خفیب کی بات ہے کہ مذہب کے پرستار ایک دوسرے کا برائیوں میں مقابلہ کرتے ہیں۔ یعنی دوسرا برائی میں برطھا نہ رہنے پائے ہمارا ہی طرف سے کمی ہوئی ہے تو ہم اس کو پورا کر دیں۔ حالانکہ اگر مذہب کی روح دماغوں میں راسخ ہوئی تو اچھائیوں میں مقابلہ ہونا

کسی ایک فرقے تک محدود نہیں رکھ سکتا بالکل اسی طرح جسے ان کا بی نام کے خاندان میں ہونا بملک اور قوم کے دوسرے خاندانوں کو اسے بیگانہ قرار دینے کا باعث نہیں ہو سکتا۔

دنیا میں مختلف مذاہب ہیں لیکن باوجود تمام اختلافات کے کچھ اچھائیاں ایسی ہیں جن کو متفقہ طور پر تمام مذاہب اچھائیاں سمجھتے ہیں اور بہت سی برائیاں ہیں جو سب کے نزدیک برائیاں ہیں۔ یہاں تک کہ بڑے آدمی بھی برائیاں کرتے ہیں تو اچھائی کے نام کے ساتھ ہر جھوٹ سچ کے نام سے بولا جاتا ہے۔ ہر بے ایمانی دنیا نڈارہ کی نام سے کی جاتی ہے اور ہر برائی کو اچھائی کہہ کے کرنا ہی اس کا ثبوت ہے کہ ہر آدمی کبھی اپنے اس عمل کو برا سمجھتا ہے اس لئے میرا خیال ہے کہ اگر دنیا میں ایک بلین اقوامی ادارہ ایسا قائم کیا جائے جس میں تمام مذاہب کے ذمہ دار افراد شامل ہوں اور اس کا مقصد نزع انسانی میں ان اچھائیوں کی تبلیغ ہو جن کے اچھے ہونے پر سب متفق ہیں اور ان برائیوں سے روکنا ہو۔ جنکی برائی سب کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ قویہ ایک بڑی انسانی خدمت قرار پائے گی اور اگر دنیا عملی طور پر اس پر کاربند ہو جائے تو باوجود اختلاف مذہب و ملت کے یہ دنیا سب کے لئے اس دور حیات میں ایک جنت بن سکتی ہے۔ جس طرح عمدہ اخلاقی اصول کسی ایک فرقے سے مخصوص نہیں ہیں اسی طرح کسی ایسے بلند اصول کی تعلیم دینے والے کی ذات ایک ہی فرقے سے وابستہ نہیں ہو سکتی۔ امام حسین نے ایک ایسا سورہ حسنہ ہمارے سامنے رکھ دیا ہے جو یکساں طور پر ہر فرقے کے لئے مستعمل رہا ہو سکتا ہے۔ اور وہ ہے حسین ابن علی کا وہ جہاد جو انھوں نے خود اپنی قوم کی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے کیا۔ حسین کی ذات فرقہ بندیوں سے بالاتر نہ ہوتی، اس وقت جبکہ وہ کسی دوسرے فرقے کے خلاف جہاد کرتے اور نتیجتاً مخالف فرقے کے افراد امام حسین کے مخالف ہو جاتے لیکن امام حسین نے جو جہاد کیا وہ مذہب (اسلام) والوں کے ان افراد کے خلاف تھا جو اچھائیوں کے اصول سے ہٹ کر برائیوں

چلیے تھا حقیقت یہ ہے کہ خواص مذہب کو جینیت ایک برحق اصول کے ماننے ہی نہیں ہیں بلکہ وہ اس لئے ماننے ہیں کہ وہ اس مذہب کے ماننے والے کے گھر میں پیدا ہوئے اس لئے دل سے لاندہ مذہب ہیں۔

اپنے مذہب سے ان کو اس طرح کی محبت ہے جیسے اپنے وطن سے اپنی اولاد سے، اپنے گھر سے اور اپنے کسی دوست سے یہ اپنے ہونے کی بنا پر جو محبت ہوتی ہے وہ درحقیقت اپنی ذات کی محبت ہوا کرتی ہے پس اس طرح سے ان کو اپنے مذہب کی محبت ہے اس لئے ان کی مذہبی جنگ بھی درحقیقت ایک ذاتی لڑائی ہے جیسے ذرا زمین، ذرا دن کے اوپر لڑائیاں ہوا کرتی ہیں لیکن تصادم کی بنیاد تو یہ ہوتی ہے کہ ہر دوسرے کو اس حق سے کچھ کم ہی دینا چاہتا ہے لہذا کشمکش فساد اور خون ریزی کی صورت میں پیدا ہوتی ہیں۔ مصلحتی کا فرض ہے کہ وہ اپنی قوم کی بے راہ روی اور کم لہائی کے خلاف علم جہاد بلند کریں چاہے اس راستے میں ان کی جان بھی کام آئے جسے انتہائی بلندی کی منزل پر امام حسین نے اپنے عمل سے پیش کیا۔

مذہب نے جو اصول بتلایا ہے وہ یہ ہے کہ ہر ایک کو دوسرے کے مقابلے میں بلندی حاصل کرنا ہو تو اپنے حقیقی عمل کو اس سے بلند رکھے اس طرح اگر مقابلہ بھی دو فریق میں ہونا چاہیے تو اس بات کو دیکھیں کون دوسرے کے ساتھ احسان زیادہ کرتا ہے اس کے نتیجے میں بھی تصادم نہیں ہو سکتا اسلام نے جو تعلیم دی ہے اس کی ایک معمولی چیز پیش کرتا ہے تجارت میں ترانہ دوسرے تو لے والی چیزوں کے متعلق حکم ہے کہ اگر تم خود کو لے کر بیچ رہے ہو تو پچھ زیادہ دینے کی کوشش کرو۔ اور اگر تم خریدنے جاؤ اور دکاندار تم سے تولنے کے لئے کہہ دے تو کچھ کم ہی لینے کی کوشش کرو۔ اس کے بعد کیا تول تول میں کوئی بھگتا ہو سکتا ہے۔ اب اگر دو قوموں کے درمیان کوئی معاملہ ہو اور وہ اسی نظریہ کے ماتحت زمین کی تقسیم کریں کہ چاہے دوسری طرف زیادہ زمین چلی جائے مگر

دوسری قوم کی حق تلفی نہ ہو تو پھر تصادم کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟
یہ لفظ نے حسین سے بیعت چاہی اور حسین نے انکار کیا حسین کو بیعت سے انکار کیوں تھا؟ اس کا جواب اسی سے ملے گا کہ آخرت میں یہ بیعت کے لئے اتنا اصرار کیوں تھا جس لئے اسے اتنا اصرار تھا اسی لئے حسین کو انکار تھا یہ بیعت کا اصرار بیعت پر اس لئے تھا کہ وہ چھتا تھا کہ اس نے اسلامی قوانین کی کھلی ہوئی خلاف ورزی کی تھی جن کی بناء پر خود اسے یقین تھا کہ ادھر لوگوں کے دماغوں سے رسوا کا نشانہ ذرا بھی کم ہوا۔ ادھر چمکتی ہوئی تلواروں کی چمک نظر سے ذرا اوجھل ہوئی اور ہر مٹتی نظر کا مسلمان بھی محض ایک نگاہ غلط انداز سے یہ سمجھ لے گا کہ یہ بید خلیفہ برحق نہیں ہو سکتا۔ ضرورت تھی کہ اپنے خلیفہ برحق ہونے کے جو انداز میں شریعت اسلامی کے حقیقی پاس بان سے سند لے لی جائے تاکہ جب کبھی مسلمان بیدار ہو تو اس سے کہہ دیا جائے کہ اگر حکومت اس قابل نہ ہوتی تو رسول کے لئے اسے حسین کیوں بیعت کرتے۔ یہ بیزیدی نادانی تھی کہ اس نے یہ تصور بھی کیا کہ حسین بیعت کر لیں گے۔ حسین اگر بیعت کر لیتے تو قیامت تک حقائق پر پردہ پڑ جاتا۔ اسی لئے ان کو بیعت سے انکار ضرور تھا اس طرح حسین نے دو نتیجے حاصل کئے ایک مسلمانوں کے لئے اور ایک دوسروں کے لئے مسلمانوں کے لئے آپ نے یہ اصول اپنے خون کی سرخ روشنائی سے ثبت کر دیا کہ قانون شریعت پابند نہیں ہے۔

دوسرے فرقوں کے لئے یہ کہ اگر تمہاری اسلامی تمدن اسلامی تعلیم اور اسلامی اخلاق کا مطالعہ کرنا ہو تو کسی دشمن یا قریب کے قصر خضر اور یا قصر حمراء میں نہ جانا بلکہ مدینہ کے ان گھوٹے پھوٹے ہوئے کھنڈروں پر نظر ڈالنا جہاں بوسیدہ پردے اور کچی دیواریں نظر آتی ہیں۔ اسی طرح حسین نے قیامت تک بیدار بیزیدینش انسانوں

کو ان کے اہلی رنگ روپ میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا اور غلط فہمی کے امکانات کو ختم کر دیا۔ حسین کا یہ جہاد بڑا اپنی قوم ہی کے مقابلے میں تھا اپنی نوعیت کے اعتبار سے جفا گانہ کھادہ اسلامی جہاد جو پیروزوں کے مقابلے میں ہو اس میں کچھ پابندیاں عائد ہوتی ہیں مثلاً جہاد اسی وقت کیا جائے گا جب غلبے کا امکان ہو۔ تعداد کافی ہو پھر سپاہیوں کی عمر کے لحاظ کی بھی ایک مقدار مقرر ہے کہ اس کم یا نہ زیادہ عمر نہ ہو اسی طرح اور کبھی پابندیاں ہیں لیکن حسین نے جو جہاد کیا وہ اس جہاد سے بالکل مختلف تھا قرآن میں حکم آیا ہے کہ ہمسلمان دونوں کا مقابلہ کریں لیکن جب یہ معیار عمل کی کسوٹی پر پورا نہ اتر سکا تو کہا گیا کہ اچھا نہ تو اور دونوں کی نسبت سے مقابلہ کرو۔ یہاں وہ معیار جو قرآن نے قائم کیا تھا اور جو عمل کی کمزوری کی بنا پر قابل قبول نہ ہوا زیادہ سے زیادہ ہمیشہ اور دونوں یعنی دشمن کے کسی نسبت سے تھا لیکن کمزوری میں جو جہاد کیا گیا تھا اس میں ادھر بہتر دوسری طرف کم از کم تین سو ہزار فوج اس میں بولسبت کا فرق ہے وہ بدر جہاں زیادہ ہے پھر جہاد میں تعداد کافی ہونا ضروری چیز ہے مگر کہ بلا کی جنگ میں تعداد کے برٹھانے کے بجائے گھٹانے کی کوشش ہوتی رہتی ہے جسے لوگ کچھ امیدوں کی بنا پر ساتھ ہو لئے تھے آپ نے سہادت مسلم کی خبر سننے کے بعد ان سے کہا کہ میں کسی فوج کئی یا حکومت کی یاگ اپنے ہاتھ میں لینے کی غرض سے نہیں جا رہا ہوں وہ واپس جائیں۔ اور اس طرح بہت سے لوگ چلے گئے اس کے بعد کمزوری میں بھی عاشقوں نے اپنے ساتھ کے لوگوں سے فرمایا کہ تم میں سے جو جانا چاہے بچو شہی چلا جائے۔

پھر عمر کی پابندیاں جہاد میں لازمی ہوتی ہیں یہاں وہ بھی باقی نہیں رہیں انہی برس کے حبیب ابن مظاہر بھی ساتھ میں ہیں اور نابالغ کچھ بھی۔ بلکہ چھ ماہ کا شیر خوار علی الصغر بھی میدان جہاد میں ساتھ ہے معلوم ہوا کہ عیروں کے ساتھ جہاد میں جو شرط غلط ضروری ہو کر رہی۔

ہیں، دین خدا کی حفاظت کے لئے ایسوں کے ساتھ جہاد کرنے میں ان کا کبھی لحاظ نہیں کیا گیا بلکہ تمام شدید ترین مصائب کو اس سلسلے میں برداشت کیا گیا۔ امام حسین نے دنیا کو مستتر کہ انسانی حقوق کی جو تعلیم دی ہے وہ موجودہ زمانے میں بھولی ہوئی انسانیت کی یاد دلانے کے لئے کافی ہے۔

پانی رس کا اہم ترین جزو ہونے کی حیثیت سے خود حسین کے لئے کہ کپیلے ضروری اور ہمیشہ قیمت تھا اور دشمن کو پانی پلا کر تقویت پہنچانا بظاہر اپنے کو کمزور کرنے کے مترادف تھا لیکن امام حسین نے فوج کو پانی پلا کر ظاہر کیا کہ اگرچہ دشمن ہیں مگر ذریعہ بشر کے افراد ہیں اور پیا سے ہیں۔ لہذا پانی ان سے عزیز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ نہیں کہ محض حکم دے دیا ہو جیسا کہ اکثر لکھتے رہتے ہیں۔ کہ نہ بانی تعلیم دے دیتے ہیں اور اس پر عمل درآمد نہ کیا گیا تو یہ غدار ہمیشہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے تم کو کہہ دیا تھا۔ جماعت نے ہمارا حکم نہ مانا بلکہ اس حقیقت پر پھانسی نشان یہ تھی کہ خود کہہ سی بچھا کر اپنے سامنے پانی پلانے لگے۔ بخدا امام حسین کے انصار کہتے وہی جیسا حسین نے حکم دیا تھا لیکن امام حسین نے خود اپنا فرض بھی ادا کرنا ضروری سمجھا۔

علی ابن طعان محاربی کا بیان ہے کہ میں بہت پیا سا تھا۔ حسین نے محسوس کر لیا اور کہا ہے شخص قلال اونٹ پر پانی ہے، پی لے! میں گیا لیکن فرط تشنگی سے دہانہ کھیک ممتنہ تک نہ لکاسکا اور پانی گرنے لگا حسین بہ نفس نفیس اٹھ کھڑے ہوئے اور خود مشک کا دہانہ کھیک کر کے مجھے سیراب فرمایا۔

یہ اور اس کے مثل وہ حسین تعلیم کے غلط و خال ہیں جنکی وجہ سے ہم ہم کہنے کی جہاد کرتے ہیں کہ

”حسین کی ذات تمام فخر بندگیوں سے بالا تر ہے“

مسلمانوں کی حقیقی اکثریت



اسلام کی ترقی کا انتہائی نقطہ
واقعہ کر بلا کا ایک خاص پہلو

عام طور پر اسلامی ترقی کا جو معیار سمجھا گیا ہے اس کی بنیاد پیرا اسلام کا عہد زریں مختلف اوقات میں سمجھا جا سکتا ہے ممکن ہے اس وقت کو اسلام کا نمایاں زمانہ سمجھا جائے جب روم اور فارس کی عظیم الشان سلطنتوں کو اسلام نے فتح کیا ممکن ہے وہ دور قرار دیا جائے جب دنیا کا خراج سمٹ کر سمٹ کر اسلامی بیت المال میں آتا تھا اور سلطنت کی حدود اتنی وسیع ہو گئیں تھیں کہ سامنے نظر آنے والا ابر بادشاہ اسلام کی زبان سے مطمئن دل کے ساتھ یہ لفظ کہہ لیا آتا تھا کہ جہاں رکھے جانا ہو جا اور برس، تیرے محاصل کا خراج بہر حال میرے ہی خزانے میں آئے گا ممکن ہے وہ دور مسلمانوں کی مردم شماری کا انتہائی مکمل نمونہ قرار دیا جائے جب دنیا میں اسلام کے سوا کسی دوسرے مذہب کا نام لینے والا ڈرتا تھا۔ اور یہ سمجھتا تھا کہ مجھے جو یہ دینے کی مہیبت میں گرفتار نہ ہونا پڑے لیکن کیا حقیقتاً یہ نام کی مردم شماری سچے مسلمانوں کی تھی کیا جتنی تعداد سرکاری دفتروں میں اسلامی افراد کی لکھی جاتی تھی وہ حقیقی اسلام کے نقطہ نظر سے بھی اسلام کی واقعی تعداد تھی۔

جہاں تک اسلامی روح اور اس کے حقیقی جوہر کا تعلق ہے میں بلا خوف

انکار یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان اسلامی ترقیوں کے بہت سے دور وہ ہیں جو اس کی لپٹی قرار دیئے جانے کے مستحق ہیں۔

اس کے برخلاف اگر اسلام کی انتہائی بے کسی، بے بسی اور تنہائی کی مثال دنیا سے لے لی جائے گی تو وہ بہت جلد واقعہ کہ بلا کا نام لے دے گی وہ یہ نہیں ہے کہ اس سے بڑھ کر اسلام کی لپٹی اور کسمپرسی کا کوئی اور دور نہیں ہے اور بدستگ اس حیثیت سے یہ بھی صحیح ہے کہ خود فرزند رسول اسلام کا نام لینے والوں کے ہاتھ سے قتل ہوا مگر میں جب ایک دوسرے نقطہ نظر سے دیکھتا ہوں تو مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی حقیقی مردم شماری اور اس کی اکثریت کا مظاہرہ اگر کبھی ہوا ہے تو وہ صرف واقعہ کہ بلا میں! نہ اس کے پہلے کبھی اور نہ اس کے بعد! یہ ایک عجیب بات معلوم ہوگی لیکن تھوڑے سے صبر و تحمل کے بعد مستحیرہ دماغ میرے ساتھ متفق نظر آئیں گے۔

اسلام کی تعلیم خلیفہ سچا اعتماد، حق کا پورا یقین اور راہ حقیقت پر کامل ثبات و استقلال۔ مجھے اس اعتبار سے اسلام کی مردم شماری کا جائزہ لینا ہے۔

مجھے سب سے پہلے رسول کا دور نظر آتا ہے لوگ کہتے ہیں کہ حضرت کے زمانہ میں ہی مسلمانوں کی مردم شماری ایک لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ ممکن ہے یہ صحیح بھی ہو اس طرح کہ حج آخر میں حضرت کے ساتھ مناسک عبادت کرنے والے قریب قریب اتنے ہی تھے مگر مجھے جس طرح کے اسلام کی تلاش ہے میں صاف کہوں گا کہ رسول کے زمانے میں اس کی تعداد بہت کم تھی ممکن ہے کہا جائے کہ رسول کے ابتدائی عہدوں کا زمانہ تھا مگر افسوس ہے کہ حسین نے جو رسول کے آخری زمانے میں ہوئی ہے اس میں بھی تاریخ گواہ ہے کہ آدمی باقی نہیں رہے تھے اس کے بعد رسول دنیا سے اٹھ گئے اور خلفائے راشدین کے زمانے میں افراد اسلام میں بڑی وسعت پیدا ہوئی۔ لیکن کیا مسلمانوں کی وہ مردم شماری

جو اُحد اور یحیٰن میں ظاہر ہوئی تھی اس میں واقعی ترقی ہوئی؟

یہاں نہیں سمجھ سکتا کہ اس کے بعد کون سا دور اسلام کی تاریخ پیش کر سکتا ہے جس میں مسلمانوں کی حقیقی تعداد کا صحیح اندازہ ہو سکے مگر میں سچ کہتا ہوں کہ کربلا کا واقعہ ایک وہ یگانہ مثال ہے جس میں اسلام

حقیقی روح اور برہنات مسلمانوں کی واقعی تعداد کا اعلیٰ نقطہ سمجھا جاسکتا ہے وہ حسین کے ساتھی تھے جو مستہزوا روایت کی بنا پر صرف بیشتر سہی لیکن تاریخی تحقیقات پر سنو سے کچھ زیادہ تھے۔ میں سچ کہتا ہوں یہ مردم شمارہی وہ تھی جو رسول کے زمانہ میں نہ بڑھی اس

کے بعد کسی دور میں اتنی تعداد میں اتنی خالص عملی کامیابی کے ساتھ دنیا میں پیش نہیں ہوئی جس طرح حسین معرکہ میں دنیا کے سامنے آگئی حسین نے تمام عالمی مذاہب کے سامنے حقیقی مسلمانوں کا ایک نمونہ اجتماعی شکل سے پیش کر دیا ہے جسکی مثال تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے کوئی مذہب اتنی خالص تعداد بوقت واحد اپنے پیروؤں کی پیش نہیں کر سکتا جنہوں نے اتنی سختیوں کے باوجود ایک مسلک پر قائم رہ کر اپنی زندگی کو ظاہری طور پر فنا کر دیا ہو۔

حسین دنیا میں سب سے پہلی بار اور بالکل آخری مرتبہ مسلمانوں کی ایک متحد جماعت کی مثال پیش کرنا چاہتے تھے اور اس کے لئے آپ کے انتخاب کی اگر دنیا تعریف نہ کرے تو ظلم ہے۔ بہت سے ساتھ تھے مگر آپ نے کوشش کر کے مجمع کو متفرق کیا اسی لئے کہ خالص حق میں کمزوری کا شاہد نہ رہ جائے وہ اپنے ساتھ والے مجمع کو ایک خالص اسلامی جماعت کی مثال کے طور پر پیش کرنا چاہتے تھے اگر ان میں سے کسی ایک فرد کی طرف سے کمزوری ہو جاتی تو پورے مجمع کی وہ کامل شان باقی نہیں رہ سکتی تھی۔ میں سچ کہتا ہوں کہ مہابہ میں رسول کو خالص افراد اتنے ہی ملے تھے جو بالکل اپنے تھے ورنہ وہ ادوروں کو بھی اپنے ساتھ ضرور لاتے حسین

اگر کربلا میں صرف اپنی جان اسلام کی خاطر نثار کر دیتے تو مسلمانوں کے لئے صحیح نمونہ عمل پورے طور پر نہ ملتا اس لئے کہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ مقصود تھے۔ غیر مقصود اتنا سخت امتحان نہیں دے سکتا۔ حسین اپنے ساتھ اگر صرف بنی ہاشم کو لائے ہوتے تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ وہ ہاشمی خون کا اثر تھا وہ شیعہ فاطمیہ کی طاقت تھی جو بنی ہاشم یا اولاد علی و فاطمہ سے مخصوص

تھی۔ دوسرے کے بس کی یہ بات نہیں ہے لیکن حسین نے اپنے ساتھ غیر خاندان ان کی تمام جماعتوں کے بہت سے اصحاب انصار و الخوان کو مثال میں پیش کیا جن کے خیالات و احساسات و جذبات میں مشترک سوائے نصرت اسلام کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ حقیقتاً اتنے ہم آہنگ ہم دل، ہم نہ بان، ثابت قدم۔ مستقل بختہ مسلمان دنیا کے سامنے بطور نمونہ عمل کے نہ واقعہ کربلا کے پہلے کبھی پیش ہوئے نہ واقعہ کربلا کے بعد اور یہ واقعہ کربلا کا وہ پہلو ہے جس کی بنا پر مسلمانوں کو ہمیشہ اس کی یاد تازہ رکھنا چاہیے۔

بیاضت کین زینب

رباعیات - قطعات - سوز - سلام اور مرثیوں پر مشتمل نایاب بیاض جس میں مجلس کو کامیاب بنانے کے لئے رقت آمیز مواد آپ کی خواہش کے مطابق موجود ہے۔ اپنے کتب فروشوں سے حاصل کیجئے!

(خاصتر)

خاندان ہاشم کی قربانی

یوں تو کہ بلا کی جنگ کوئی خاندانی جنگ بنی ہاشم کی بنی اُمیہ کے خلاف نہ تھی باوجود قتلِ تعداد امام حسین کے ساتھ تقریباً عرب کے ہر قبیلہ اور مختلف مقامات کے ممتاز اور مذہبی حیثیت سے سربرآوردہ افراد موجود تھے۔ بلکہ چھ غریب عرب تھے یہ سب وہ تھے جن میں لفظ مشترک صرف اہول کا احساس اور ایک و بھر خالص یعنی فریضہ دینی کا اتحاد ہی تھا اور بس پھر بھی اس مقصدِ بلند کی خاطر جس کے واسطے عزیز بنی ہاشم اس طرح جہاں تباری کہ رہے تھے یقیناً بنی ہاشم جنھیں دینی روایات کے ساتھ دوسروں سے زیادہ وابستگی تھی زیادہ حق رکھتے تھے کہ ان کی قربانیاں زیادہ بنائیاں حیثیت رکھتی ہوں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

”کہ بلا میں بنی ہاشم کی قربانیوں کا وزن اسی طرح ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے جس طرح اسلام کے ہر معرکہ میں بنی ہاشم کے کارناموں کو جناب رسول خدا کے ساتھ حضرت حمیدہ کرامی اور حمزہ و جعفر طیار کے ذریعے سے امتیاز خاص رہا تھا۔“

مگر یاد رکھنا چاہیے کہ کہ بلا میں بنی ہاشم کے سوا اس بے مثال کارنامہ قربانی کا سہرا صرف ان کے ایک گھرانے کی بدولت بندھا ہے اور وہ اولاد حضرت ابوطالب کہ بلا میں اٹھا رہے بنی ہاشم شہید ہوئے ہیں ان میں سوا جناب ابوطالب رضوان اللہ علیہ کی نسل طاہر کے اور کون تھا۔

علی اکبر علی اصغر ہیں وہ فرزندِ نذرانِ حسین بن علی بن ابی طالب۔ قاسم و عبداللہ ہیں۔ وہ فرزندِ نذرانِ حسن بن علی بن ابی طالب۔ خود حضرت سید الشہداء اور ابوالفضل العباس اور ان کے بھائی علاوہ ان کے فرزند ان عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب وہ جعفر و عبدالرحمن و محمد ہیں۔ اور فرزندِ نذرانِ عقیل مسلم بن عقیل

بن ابی طالب بس انہی سے اٹھارہ کی تعداد پوری ہو جاتی ہے۔

یہ تخر قدرت کی طرف سے صرف جناب ابوطالب کی اولاد کو عطا ہوا ہے کہ جس طرح ان کے نورِ اعلیٰ انھیں ابوطالب نے آغاز اسلام میں اسلام اور پیغمبر اسلام کو بچایا اسی طرح اللہ میں جب اسلام خطرہ میں ہوا تو ان ہی کی اولاد تھی۔ جس نے اسلام کی حیات تانیہ اور بقائے جاوید کے لئے کہ بلا کی عظیم قربانی پیش کر کے یہ فخرِ عظیم کا درجہ حاصل کیا۔ ان مفتی بنی ہاشم افراد اکمل ابی طالب کے ذاتی کمر دار و رفعتِ علاوہ ان خصوصی اسناد کے جو ان میں سے متعدد افراد کو حاصل ہیں جیسے حضرت علی اکبر کے بارے میں حضرت سید الشہداء کے یہ الفاظ جو بوقتِ رخصت فرمائے اللہم الشہد علی (یعنی خداوند گواہ رہنا کہ اب وہ جوان جا رہا ہے جو صورتِ سیرت اور رفتار و گفتار میں تیرے رسول سے سب سے زیادہ مشابہ ہے۔“

اس میں صرف مشابہت صورت کا ذکر نہیں ہے بلکہ مشابہت سیرت کا بھی جو حضرت علی اکبر کے لئے اس بلند کما کما دار کا ثبوت ہے جس کا تصور کسی غیر معصوم کے بارے میں بہت دستاورد ہے یا حضرت ابوالفضل العباس کے بارے میں افضل الشہداء کی سند یا امام جعفر صادق کی زبان سے صحیح کلام میں جو الفاظ وارد ہوئے ان سب کے علاوہ مشترک طور پر ان تمام حضرات کی بلند کما کما دار کے ثبوت کے لئے امام حسین کے وہ الفاظ کافی ہیں جو شبِ عاشورہ کے خطبے میں ارشاد فرمائے تھے۔

انی لا اعلم اہم حاجا اونی من اصحابی

مجھے نہیں معلوم کہ کسی اصحاب جو میرے اصحاب سے زیادہ با وفا ہوں اور نہ کوئی عزیز و اقارب جو میرے عزیزوں سے زیادہ ادائے حقوق اور حسن سلوک کرنے والے ہوں۔

پھر کربلا کے میدان میں ان کے موقف کا خصوصی امتیاز تمام اصحاب کے مقابلے میں ترتیب شہداء سے ظاہر ہے جس پر ہم نے اپنی مشہور ترین کتاب "شہداء الہانیت" میں روشنی ڈالی ہے کہ سطح نظر میں مجاہدین کی یہ ترتیب خلاف قیاس صحیحی جاسکتی ہے اس لئے کہ عملی رہنمائی کا لفظ ضمایہ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے حضرت امام حسین علیہ السلام خود میدان جہاد میں قدم رکھتے ہوئے عملی مثال پیش فرماتے پھر آپ کے سوا یردیکے بعد دیگرے جلتے اور آخر میں اصحاب کی نوبت آتی حضرت علی بن ابی طالبؑ نے نہج البلاغہ میں رسول اللہ کے طریقہ جنگ کے متعلق فرمایا ہے کہ آپ خطر کے موقعوں پر اپنے اہل بیت اور عوہ کو آگے رکھتے تھے اور اسٹھیں اپنے اصحاب کی سپر بنا تے تھے مگر میدان کربلا میں ترتیب دوسری رکھی گئی۔ یہاں اصحاب پہلے میدان میں بھیجے گئے اور پھر اعزاء اور آخر میں خود امام حسینؑ شریف لے گئے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ کربلا اور دوسرے معرکوں کی نوعیت میں بڑا فرق تھا دوسرے ہر موقع پر یہ یقینی تھا کہ کچھ لوگ قتل ہوں گے اور کچھ صحیح سلامت محفوظ رہیں گے لہذا یہ کوشش کی جاتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ خطرہ دہری برداشت کریں جو رسول اللہ کے ساتھ خاندانی تعلق رکھتے ہوں اور وہ لوگ زیادہ سے زیادہ محفوظ رہیں۔ جو غیروں کی حیثیت رکھتے ہوں مگر معرکہ کربلا میں تو یہ طے تھا کہ زندہ بچنے والا کوئی نہیں جلتے ہیں سب کو شہید ہونا ہے اگر کسی کو زندہ رہنا ہوتا تو اس کے لئے مشہور عاشورہ کا موقع دے دیا گیا تھا جب حضرت امام حسینؑ نے باہر اتمام فرمایا کہ

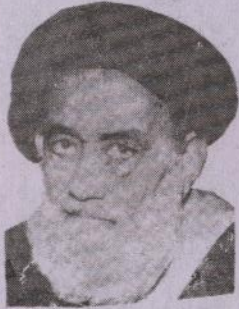
"مجھے تنہا اس خطر سے کو قتل کر لینے دو"

"تم سب جہاں جانا چاہتے ہو چلے جاؤ"

مگر سب نے اس اجازت سے فائدہ اٹھانے سے انکار کر دیا اور اپنی چانیں قربان کرنے کے عوض مبالغہ کم اعلان کر دیا اس کے بعد اب یہ سوال باقی ہی نہیں رہا تھا کہ کون قتل ہوگا اور کون زندہ رہے گا۔ اب تو ہر ایک کے سامنے بس موت ہی تھی۔

اس کے بعد سوال ہے تو صرف قبل اور بعد کا مگر واقعہ کربلا کی نوعیت یہ تھی کہ جتنا وقت گزرتا جاتا تھا امتحان سخت تر ہوتا جاتا تھا۔ پانی بند تھا ہی اور روز عاشورہ دن بڑھنے اور نماز آفتاب میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ پیاس کی تکلیف لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جاتی تھی پھر اس حالت میں کثیر التعداد دشمنوں سے سپہم بند آزمائی ساتھیوں کی جلائی اور ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ جتنی بھی کسی مجاہد کی شہادت میں دید واقع ہوتی تھی اس کا امتحان شدید ہوتا جاتا تھا۔

اسی لئے مگر کو جو لوگوں کو دیکھ سب سے پہلے میدان میں جانے کی اجازت دیدی حبیب بن مظاہر وغیرہ خاص خاص اصحاب دوپہر تک موجود تھے اور جب تک اصحاب میں سے ایک بھی باقی رہا یعنی ہاشم میں سے کسی کو اپنی قربانی پیش کرنے کے لئے نہیں بھیجا گیا۔ اسی طرح بنی ہاشم کے ایک ایک بچے جلتے جلتے سختی برداشت کی وہ اصحاب میں سے کسی نے برداشت نہیں کی اور سب سے زیادہ سختی امتحان خود حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کا تھا جنہوں نے اصحاب کے بھی غم اٹھائے اور پھر غیروں کے بھی غم سے برداشت کئے یہاں تک کہ چھ ہمسین کے بچے کا بھی ہدیہ راہ خلا میں پیش کر دیا اس وقت خود منزل شہادت کی طرف روانہ ہوئے۔



نوید اور امام حسینؑ

کارنامہ عظیمی یعنی جاہدہ کربلا کا اصل سرچشمہ وہی کلمہ لڑتے ہوئے ہے جسکی اشاعت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ میں جسم مبارک پر پتھر کھائے اور اس کے تقاضوں کی تعمیل میں ان کے فرزند حسین نے کربلا میں جسم اقدس پر تلواریں کھائیں۔

یہ اللہ الا اللہ فقط ایک ورد اور ظریف تھوڑی سی تھا جو مسلمانوں کو سکھایا گیا ہو کہ وہ زبان پر جاری کر لیں اور بس! بلکہ اس کے معنی یہ تھے کہ اللہ کے مقابلہ میں کسی دوسرے اقتدار کے قابل نہ ہو۔ اس کے مقابلہ میں کسی دوسرے کے سامنے سر نہ جھکاؤ اور اس کے قانون پر عمل کے معاہدہ کے بعد جو اندرونی فطرت بھی کم بہت عائد تھا اور اب اقتدار اسلام کے بعد اس نے رسمی شکل بھی اختیار کر لی ہے اب کسی دوسرے کے غیر مشروط اطاعت کا عہد و پیمانہ جس کا نام "بیعت" ہے نہ کہ وہ کسی نونہا کار کا کسی اللہ کے بندے سے بیعت یعنی غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ اس عہد و پیمانہ کی نفی ہے جو خالق کی جانب سے بر بنائے لڑتے ہوئے عائد ہوتے ہیں اور جس کی تعمیل ہر مسلمان یعنی ہر سچے انسان کا لازمی فریضہ ہے۔

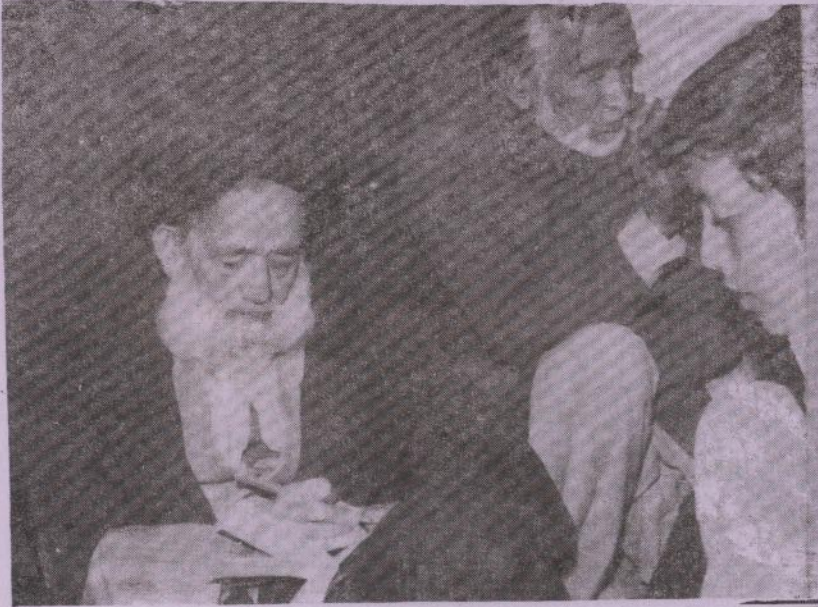
وہ لڑتے ہوئے ہی کا ایک تقاضا ہے جس کے تحت یہ اصول قائم ہوا ہے۔

"لا طاعت الا للہ الخالق" یعنی خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے یہاں تک کہ قرآن مجید میں پیغمبر خدا کی اطاعت کا بھی حکم دیا تو یہ کہہ دیا گیا کہ "من یطیع الرسول فقد اطاع اللہ" جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی یعنی مرکز اطاعت در حقیقت ایک ہی ہے یہ تھیں تھوڑے بہت ناچاریے کہ ہم اللہ کے علاوہ کسی اور کی اطاعت کر رہے ہیں اور اسی سے مسلمانوں کو سمجھنا چاہیے کہ وہ اولی الامر بھی جن کی اطاعت بعد رسول فریضہ قرار دی گئی ہے ایسے ہی افراد ہو سکتے ہیں جن کا کوئی حکم خالق کے حکم سے

کبھی متصادم نہ ہوتا ہو بلکہ جن کا ارادہ و مشیت بھی ہمیشہ مشیت خالق کا پابند رہتا ہو اس لئے ان کی اطاعت اطاعت خالق سے الگ نہ ہو۔

اس بنا پر حضرت امام حسین کے سامنے یزید کی بیعت کا سوال پیش ہونا فقط کوئی سیاسی مسئلہ نہ تھا بلکہ یہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم لڑتے ہوئے کی روشنی میں اسلام اور نفی اسلام کا سوال تھا۔ حقیقت میں یہ ایک یزیدینہ تھا جو امام حسین سے طلب کیا بیعت ہو بلکہ حضرت کے مقابل میں عمرو اور فرعون اور پھر ابو جہل وغیرہ سب

کی روحیں تھیں جو یزید کے پیگم میں بیعت یعنی غیر مشروط اطاعت کے عہد و پیمانہ کی طلبگار تھیں اور حسین بن علی - ابراہیم - موسیٰ اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نمائندہ ہوتے ہوئے غیر اللہ کی اس اطاعت سے انکار کر دینا اپنا فرض عین سمجھتے تھے جس فرض کو انہوں نے ناقابل تصور مشکلات کے باوجود پورا کیا اور اس طرح لڑتے ہوئے ہی کے اس پر حکم کو بلند رکھا جسے ان کے بعد یزید کو اور حضرت محمد مصطفیٰ نے اُچھایا تھا اور جس کے ان کے آباؤ اجداد اور (مہفت روزہ شیعہ لاہور ۲۲ جنوری ۱۹۷۲ء)



قتیل العبرۃ

کشتہ گریہ پر عقیدت کے چند آنسو

ماہِ محرم کا غم انگیز ہلال آسمان پر نمودار ہو گیا گھر گھر مظلوم کہ بلا کی مصیبت ماتم بچھ گئی صدیوں کے زخمِ جنہوں نے پاک عقیدت مسلمانوں کے دلوں میں گھر گھر لیا ہے تازہ ہو گئے ہر افریقہ اپنے مذہب کے موافق اس کا اثر لیتی ہے کہ بلا میں بے گناہ شہید ہو جانے والا مظلوم تھا بھی اس قابل کہ اس کا رنجِ عالم کو گرویدہ تاثیر بنائے۔ قدرت نے بھی اس اثر کے بقا کا اہتمام کیا اور دامنِ افریقہ کو ہمیشہ کے لئے شفقت سے خون آلود دینا کہ اس خونِ ناسحق کا پاکدار شاہد قرار دے دیا۔

شیعہ و سنی افراد کو جلنے دو وہ تو رسول پاک کا کلمہ پڑھتے اور عیسائیں مظلوم کی محبت کے دعویدار ہیں۔ ہندو اور پارسی اقوام بھی اس رنج کا حقد لیتے اور شہید کہ بلا کی مظلومیت کا تذکرہ کرتے ہیں مگر افریقہ ہے کہ اسلام کا دعویٰ کرنے والے بعض بنام نہاد افراد اس مصیبت کا اثر مٹا دینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور صرف کرتے نظر آتے ہیں یہ بات اور ہے کہ یہ کوشش ان کی نقضِ برآب اور قدرت کے مقابلے میں ناکامیاب ہو

عام مسلمانوں کے نقطہ نظر سے سب سے پہلے جو چیز اس قابل ہے کہ ہر مسلم اس کے سامنے خم ہو جائے وہ کتاب اللہ اور قول رسول، فعل رسول، تقریر رسول ہے اس کے بعد صحابہ کرام کی سیرت اور تابعین کا طرز عمل ہے ان میں سے اگر ایک چیز موجود ہو، تو مطلب کے ثابت کرنے کے لئے کافی

ہے یہ جائیکہ تمام ادلہ و براہین پہلو بہ پہلو ہو کر کسی مطلب کو ثابت کریں۔

قرآن مجید سے گریہ و زاری کا ثبوت

خداوند عالم جناب یعقوبؑ کی حالت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے
 "وایدفرت عیناۃ من الحزان فہو کظیحر"
 "ان کی آنکھیں رنج و غم سے سفید ہو گئی تھیں"
 (سورہ یوسف)

علامہ زمخشری تفسیر کشاف میں اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں۔
 صاحبفت عیناۃ من فراق یوسف اوی حین لقائہ
 شما نین عام و صاعلی وجما اکراہن اکرم منہ
 (یعنی) یعقوب کی آنکھیں فراق یوسف میں ۸۰ برس تک خشک
 نہیں ہوئیں ہمیشہ آنسوؤں سے تر رہتی تھیں حالانکہ ان سے بڑھ کر
 اس وقت خیرا کا مقرب بندہ کوئی نہ تھا۔

اور اسی تفسیر میں جناب رسالت مآب سے روایت ہے کہ حضرت نے
 بئبرئیل سے پوچھا کہ یعقوبؑ کا رنج یوسف کے فراق میں کس حد پر تھا؟ انھوں
 نے کہا کہ ستر ہجرتوں کے برابر۔ حضرت نے فرمایا کہ تو اب ان کو
 کس حد تک ملا جواب دیا کہ سو شہیدوں کے برابر تو اب عطا کیا گیا۔
 اس آیت سے ہر ہمیشہ تفسیر حیدر بالوں کا انکشاف ہوتا ہے۔

۱۔ حضرت یعقوبؑ باوجود مرتبہ نبوت یوسف کے فراق میں ۸۰ برس
 تک شب و روز روئے رہے۔

۲۔ قرآن مجید میں اس فعل کا تذکرہ بغیر کسی اعتراض کے درج کیا
 گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظر احدیت میں یہ فعل حمود و مستحسن
 تھا، ورنہ قرآنی جو اہمیت اسلامیہ کی تعلیم کے لئے ان واقعات کا تذکرہ
 کرتا ہے ضرور اس پر اعتراض کرتا۔

۳۔ ان کے گریہ و بکھرنے اور زاری میں کوئی کمی نہیں کی بلکہ اس

بہترین و عزم کے تہذیب کے بعد لڑائی کا ذکر کرنا بتلاتا ہے کہ یہ حزن و غم عبادت سمجھا۔

فعل رسول

نور جناب رسالت مآب وقت مصیبت بے چین ہو کر روئے ہیں اور یہ آواز بلند گم یہ فرمایا ہے کتب اسلامیہ اس قسم کے واقعات سے پڑھیں ہم اس موقع پر بعض حوالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱۔ ابن عبد البر نے استیعاب میں لکھا ہے
عن جابر بن عبد الله قال لما رأى النبي صلى الله عليه وسلم حمزة قتيلاً بكى فلما رأى ما مشى به تنهت - (استیعاب مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد جلد ۱ صفحہ ۱۰۶)
جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ جب حضرت رسول نے حمزہ کو مقتول پایا تو گم یہ فرمایا اور جب ان کے اعضاء پر دیدہ پر نظر پڑی تو پیچھا کر روئے۔

علی بن بہان الدین شافعی محدث نے السان العیون میں تحریر کیا ہے
عن ابن مسعود ما رأينا رسول الله جاكيا اشد من بكاء علي حمزة وفي القبلة ثم وقف علي جنازته وانحس حتى نشع اى تنهت حتى بلغ بلبه الغشى يقول يا عمر رسول الله واسه رسولہ یا حمزہ جافاعل الخیرات یا مزیل الکرجات یا ذاب بالذال المجرمة اى چا مانع عن وجه رسول الله۔
ابن مسعود سے روایت ہے کہ ہم نے حضرت رسول کو کبھی اس شدت سے روئے نہیں دیکھا جیسے حضرت حمزہ پر گم یہ فرمایا۔ قبلہ رخ لاش کو رکھ کر لاش کے قریب کھڑے ہوئے اور ایک پیچھا مارا یہاں تک کہ غش آگیا اور سہرت یوں لڑھکے ہوئے تھے۔

"اے رسول اللہ کے چچا، اے خداوند رسول کے شیر، اے حمزہ، اے نیک باتوں

کے کرنے والے، اے دین پر سے مصیبتوں کے دور کرنے والے، اے رسول سے دشمنوں کو ہٹانے والے"

اور علامہ ابن ابی الحدید معتزلی نے واقعی سے نقل کیا ہے کہ ان اللہی صلی اللہ علیہ وسلم کان یومئذ اذا جکت صغیفة یبکی وان اشجحت یبشی (شرح منج البلاغہ طبع مہر جلد ۳۷ ص ۳۷)
حضرت رسول خدا کی روزِ اُحدیہ حالت تھی کہ جب صغیہ (خوابِ حزنہ) روٹی تھیں حضرت پر گم یہ طاری ہو جاتا تھا اور جب روئے روئے ان کے گلے میں پھندے پڑنے لگتے تھے تو حضرت کی بھی وہی حالت ہو جاتی تھی کیا اس سے بڑھ کر میتابی اور گم یہ و بکا کی حالت ہو سکتی ہے؟ اس کے بعد گم یہ و بکا کہ خلاف شرع بتلانا فعل رسول پر اعتراض کی صورت لکھتا ہے۔

دوسرا موقع

حضرت رسول اکرم نے اپنے فرزند ابراہیم کے احتضار کے وقت گم یہ فرمایا چنانچہ علامہ ابن عبد البر مالکی اپنی کتاب الاستیعاب میں لکھتے ہیں۔
عن انس قال لقد رأیت ابراہیم وهو یکید بنفسه بین یدی النبی فدمعت عینا رسول الله وقال ید مع العین ویحزن القلب ولا نقول الا ما یرضی الرب وان ابکی یا ابراہیم لمحزونون (استیعاب ص ۲۳)
انس سے روایت ہے کہ میں نے ابراہیم کی حالت نزع کا مشاہدہ کیا ہے کہ اس وقت حضرت رسول کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے اور حضرت فرما رہے تھے کہ آنکھیں آنسو بہاتی ہیں اور دل کو صدمہ پہنچتا ہے لیکن ہم ایسی بات نہیں کہتے جو خدا کو ناراض کرے لے ابراہیم ہم کو تمہارا دلی صدمہ ہے۔

اس حدیث میں جس طرح فعل رسول سے گم یہ و بکا کا جواز ثابت

ہوتا ہے زبانی ارشاد سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جو کچھ بھی خلاف شرع ہے وہ ایسے الفاظ کا زبان سے جاری کرنا جو خدا کی مرضی کے خلاف ہوں لیکن آنکھوں سے آنسوؤں کا بہانا یا مصیبت کا اثر لینا کسی طرح ناجائز نہیں ہو سکتا۔

اس روایت کو حافظ ابن جوزی حنبلی نے اپنی کتاب "تلبیس ابلیس" میں بھی نقل کیا ہے اور صحیح بخاری جلد اول صفحہ ۱۲۸ میں حضرت رسول کی گم ہونے کے واقعہ کو نقل کر کے لکھا ہے۔

فقال له عبد الرحمن بن عوف انت يا رسول الله قال يا بن عوف انهما رحمة شدا بتعها يا خري فقال ان لعين تن مع والقلب يحزن۔

عبد الرحمن بن عوف نے (اثر اٹھایا اور) کہا کہ آپ یا رسول اللہ اور اس طرح گم نہ کریں!

حضرت نے فرمایا "اے ابن عوف یہ رقت قلب کی علامت ہے۔ پھر دوبارہ گم نہ فرمایا اور کہا کہ بلاشبہ آنکھیں رو رہی ہیں اور رقت قلب محزون ہے" اس سے معلوم ہوا کہ باوجود صحابی کے لڑکنے کے حضرت رسول نے گم نہ فرمایا اور اپنے عمل سے ظاہر کیا کہ گم نہ ہونے کی کسی طرح خلاف شرع نہیں ہے۔

تفسیر موقع

مشکوٰۃ میں صحیح مسلم سے منقول ہے۔

عن ابی ہریرۃ زار الذبی قبر امہ فبکی وابکی من ہولہ۔ ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ حضرت رسول نے اپنی ماں کی قبر کی زیارت کی اور خود بھی روئے اور اپنے گم ہونے کے لوگوں کو بھی رولایا۔ اگرچہ سابق کی حدیث سے کسی مصیبت کے وقوع پر گم نہ ہونا ثابت ہو چکا تھا لیکن یہ حدیث اس بات کو بتلاتی ہے کہ کسی عہدہ دار کی مصیبت کو یاد کر کے رونا بھی جائز ہے بلکہ دوسروں کو رولانا بھی جائز

ہے اس سے مجلس عزا کی مشروعت پر بہت کچھ روشن ہوتی ہے۔

پوتھا موقع

ذید بن حارث اور جعفر طیار اور عبد اللہ بن رواحہ کی شہادت منکر حضرت نے گم نہ فرمایا اس کو امام بخاری نے کتاب الجنائز کے صفحہ ۳ پر اپنی صحیح میں نقل کیا ہے اور ابن بخاری عبد البر نے استیعاب میں ذید بن حارث کے حالات میں لکھا ہے کہ

ان الذبی بکی علی جعفر وزید وقال اخوای ومولسای ومحمد قای حضرت رسول نے جعفر اور ذید پر گم نہ فرمایا ہائے میرے بھائی اور میرے مولس تنہائی اور مجھ سے بائیں کرنے والے۔

پانچواں موقع

حضرت کی کسی صاحبزادی کا انتقال ہو گیا تھا۔ حضرت قبر پر بیٹھے وعیناہ قدم معان دہا لیکہ حضرت کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے (دیکھو صحیح بخاری جلد اول ص ۱۲۸)

چھٹا موقع

صحیح بخاری جلد اول صفحہ ۱۲۴ اور صحیح مسلم باب البکا علی المیت میں مذکور ہے کہ حضرت کی کسی صاحبزادی کے کچھ کا انتقال ہو گیا تھا تو حضرت کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ فقال سعد ما هذا یا رسول اللہ قال هذا رحمة جعلها الله في قلوب عباده وانما يحكم الله من عباده الرحمن سعد بن ابی وقاص نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا؟ فرمایا یہ رقت قلب ہے جس کو خدا نے اپنے بندوں کے دل میں ودیعت کیا

خدا ان ہی بندوں پر رحم کرتا ہے جن کے دل میں رحم ہو اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ گمراہی فطری امر ہے۔

ساقاں موقع

صحیح بخاری و صحیح مسلم میں عبداللہ بن عمر سے روایت ہے۔
قال اشتمکی سعد بن ابی وقاص بن رسول اللہ مع جماعة من اصحابہ فوجدوا فی غنشیة فبکی قال فلما رای القوم بکاء و بکوا۔ سعد بن ابی وقاص بیمار ہوئے اور حضرت رسول امیہ کی ایک جماعت کے ساتھ عیادت کے لئے گئے سعد کو بے ہوش پایا تو حضرت نے رونے لگے جس کی وجہ سے تمام صحیح پر گمراہی ہو گیا۔ کیا اس کے بعد گمراہی کے حجاز میں شبہ کرنا رسول کے افعال اور شریک احکام کا مقابلہ نہیں ہے۔

لقرہ رسول

جس طرح خود رسالت مآب کے فعل سے رونے کا جواز ثابت ہے اسی طرح دو رسول کو کسی مصیبت پر رونے دیکھ کر رسول کا منع نہ کرنا بلکہ منع کرنے والے کو روکنا بھی منقول ہے۔ دیکھو جامع الاصول میں ہے۔ مات میت من آل محمد فاجتمع النساء یبکین علیہ فقام عمر بنیہا من فقال رسول اللہ وعین یا عمر فان العین دامة والقلب مصاب والعهد قریب (آخر جہ النساء)

اہل بیت رسول میں کوئی موت ہو گئی تو تمام عورتیں جمع ہو کر گریہ و زاری کرنے لگیں۔ حضرت عمر نے کھڑے ہو کر سب کو منع کیا اور روکنا شروع کیا جس پر حضرت رسول نے فرمایا چھوڑ دو ان کو اسے گمراہی نہ آنکھیں روٹی ہیں اور دل دکھتا ہی ہے اور ابھی تو زمانہ مصیبت چھ زیادہ دور

نہیں ہوا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر نے رونے والوں کو جب منع کر رہے تھے تو رسالت مآب کو ناگوار ہوا اور آپ نے منع کیا اگر گمراہ کسی حیثیت سے ناجائز ہوتا تو کبھی حضرت رسول اس کو گوارا نہ فرماتے کم از کم خود ممانعت نہ کی تھی تو دوسرے کے ممانعت کرنے پر سکوت فرماتے مگر برخلاف اس کے آپ نے ممانعت سے روکا جو حجاز کی صریحی دلیل ہے۔

دوسرا موقع

امام احمد بن حنبل نے رفیقہ دختر حضرت رسول کی وفات اور بچوں کے گمراہی کے متعلق ابن عباس سے جو روایت نقل کی ہے اس میں مجھل عمر یضی یمن بسوطہ فقال النبی وعین یبکین ثم قال مہما یبکین القلب والعین فمن اللہ والرحمة وقد علی شفیر القبری وفاطمة ابی جندیہ تبکی قال فجعل النبی یمسح عین فاطمة بنزہ رحمہ لہا (مسند احمد جلد اول)

حضرت عمر اپنے کپڑے سے عورتوں کو مارنے لگے حضرت نے فرمایا کہ چھوڑ دو ان کو کہ روٹی نہیں۔ پھر فرمایا کہ "دل اور آنکھ سے جہاں تک تعلق ہے وہ خدایا کی طرف سے ہے اور رقت قلب کی علامت ہے۔ اور حضرت شفیقہ قبر پر بیٹھ گئے حضرت فاطمہ آپ کے پہلو میں رو رہی تھیں تو حضرت بمقتضائے شفقت اپنے کپڑے سے آنکھیں پونچھتے تھے۔

تیسرا موقع

مسند امام احمد بن حنبل میں ابو ہریرہ سے روایت ہے
مر علی رسول اللہ جنازۃ معہا ابی فنیہ ہن عمر

فقال رسول الله دعهن فان النفس مصابة والعين دامعة (جلد دوم صفحہ ۳۳۲)

جناب رسالت مآب کے سامنے سے ایک جنازہ گزر رہا جس کے ساتھ عورتیں رو رہی تھیں حضرت عمر نے ان کو منع کیا تو رسول نے فرمایا چھوڑ دو ان کو کیونکہ دل کو رنج پہنچتا ہی ہے اور آنکھوں سے آنسو بہنا فطری ہے۔

چوتھا موقع

علامہ ابن عبدالبر قرطبی مالکی نے استیعاب میں ابو الریح عبد اللہ بن ثابت انصاری کے حال میں لکھا ہے کہ کفہ رسول اللہ فی تمیضہ فقال لجیر بن عینک ان نہی النساء عن البكاء علیہ دعهن یا ابا عبد الرحمن فلیبکین ابا الریح مادام بیضهن (استیعاب جلد ۳۵۵) حضرت رسالت مآب نے ان کو اپنی تمیض کا کفن دیا اور جلیہ بن عینک (صحابی) نے جب عورتوں کو رونے سے منع کیا تو حضرت نے فرمایا کہ چھوڑ دو۔ ان کو لے ابو عبد الرحمن جب تک ابو الریح کا جنازہ ان کے درمیان ہے یہ روٹی رہیں۔

اس روایت کا باختلاف الفاظ ابن اثیر جزیری نے اسد الغابہ میں بھی نقل کیا ہے۔ (ملاحظہ ہو جلد ثالث صفحہ ۱۲۸)

پانچواں موقع

استیعاب ابن عبدالبر صفحہ ۳۵۵ جلد اول میں جاہر بن عبداللہ انصاری سے روایت ہے کہ لما جئنی جابی یوم احد وجاءت عمتی تبکی علیہ قال فجعلت ابکی وجعل القوم ینفخون فی ورسول اللہ لا ینھانی

فقال رسول الله ابکوا اولاً تبکوا فوالله ما زالت الملائکة تظلمه باجالتی فما حتی دفتما موه

روایت احمد بن حنبل میرے پدر بزرگوار کی لاش لائی گئی اور میری کھوپڑی روٹی ہوئی آپس لو میں بھی رونے لگا لوگ مجھ کو منع کرنے لگے مگر رسول نے مجھ کو منع نہیں کیا اور فرمایا کہ لوگو روؤ یا نہ روؤ۔ خدا کی قسم ملائکہ اپنے پروں کا سایہ کیے رہے یہاں تک تم نے لاش کو دفن کیا۔

اس روایت کو علامہ ابن اثیر جزیری نے بھی اپنی کتاب اسد الغابہ (جلد ثالث) میں تھوڑے تغیر کے ساتھ نقل کیا ہے کہ حقیقت گریہ بکا سے حماقت ایک جاہلیت کی رسم تھی جو اکثر افراد میں طبیعت ثانیہ کے طور پر رائج ہو گئی تھی۔ اہل جاہلیت کا عقیدہ تھا کہ گریہ و بکا کی وجہ سے پویش انتقام فرو ہو جاتا ہے اور بزدلی پیدا ہوتی ہے اس کی وجہ سے وہ لوگ سختی سے اپنی عورتوں کو رونے سے باز رکھتے تھے اور اس کا مقام فخر میں ذکر کیا کرتے تھے۔ عرب کا شاعر اپنے مایہ ناز محاسن کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے

معاذ اللہ ان تنزع نساً ونا

على هالک اوان لفضیح من القتل

"خدا کی پناہ اس بات سے کہ ہماری عورتیں لڑتے ہوئے کسی مرنے والے کے اوپر یا ہم قتل سے چیخ اٹھیں"

اس عادت کا فلسفہ اگرچہ مذکورہ بالا اصول پر مبنی تھا لیکن

رفتہ رفتہ رونے سے لفزت عادت بن گئی اور وہ قساوت قلب اور بے رحمی کا پیش خیمہ قرار پائی۔ رونے سے منع کرنا درحقیقت طبیعت میں ہی عادت کے نفوذ کا اثر تھا جس کی وجہ سے رسول کا ایک مرتب نہیں بلکہ چند مرتبہ کا اثر ادھی ان کی طبیعت کو نہ بدل سکا اور آخراً عمر تک ان میں یہ عادت باقی رہی۔

قول رسول

واقعات تو یہاں تک بتلاتے ہیں کہ خود حضرت رسول نے گریہ زاری پر آمادہ کیا ہے اور صحابہ کو ترغیب دی ہے چنانچہ مطالب المؤمنین اور تفسیر کبیر میں محمد بن ابی جعفر سے نقل ہے۔
قال قدم علينا رجل من الانصار فحذرنا من حديثه عن رسول الله انه مر بنى اسد وهم بين يدي قتلهم يوم احد فقال لكن حمزة لا يواكى له قالت النساء فحزنا حتى اتينا رسول الله فندبنا حتى ورسول الله في البيت حتى سمعنا التسميمه فاسبل الينا وقد اهبتم او قد احسنتم قال السر خسي اتما قال ذلك لان حمزة كان سيد الشهداء اويومئذ ولكنه كان عن يمينه فرأاه رسول الله وفي المغازي ان سعد بن معاذ وسعد بن عباد و معاذ بن جبل لها سمعوا ذلك فجاءوا بنساء قومهم اى دار رسول الله يندبن حمزة حتى قام ومن ذلك جزى الرسم جاملد ينة اذ مات احد يبتن ان جالدها ع على حمزة۔

محمد بن ابی جعفر کہتے ہیں کہ ہمارے پاس ایک شخص انصار میں سے آیا اس نے مجھ اور بائوں کے ایک بات یہ بیان کی کہ رسالت مآب کا گزرنے سے پہلے اس وقت وہ اپنے مقتولین جنگ احد پر

رو رہے تھے حضرت نے فرمایا "افسوس حمزہ پر کوئی رونے والا نہیں ہے۔ عورتیں کہتی ہیں کہ ہم اپنے گھروں سے نکل کر خانہ کرسول میں آئے اور ہم نے حمزہ پر گریہ و زاری کی اس وقت رسالت مآب گھر میں موجود تھے اور ہم ان کی تشبیح کی آواز سن رہے تھے آپ نے ہمارے پاس پیغام بھیجا کہ تمہارا بڑا احسان ہوا۔

سرخسی نے کہا ہے کہ حضرت نے یہ افسوس اس لئے کیا تھا کہ حمزہ اس دن سیدالشہداء تھے مگر عالمِ افرت میں انتقال ہوا تھا تو رسالت مآب نے مرثیہ پڑھوایا اور کتاب مغازی میں ہے کہ سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ اور معاذ بن جبل نے یہ مرثیہ پڑھ کر ان کی عورتوں کو خانہ کرسالت میں لائے اور انہوں نے حمزہ پر نوحہ کیا۔ اور اس دن سے مہینے میں یہ رسم جاری ہو گئی کہ جب کوئی مرتا تھا تو پہلے حمزہ پر گریہ و بکا کر لیتے تھے۔

اس روایت کو امام احمد بن حنبل نے اپنے مسند میں بایں الفاظ نقل کیا ہے۔

رجع رسول الله من احد فجلت نساء الانصار يبكين على من قتل من ازواجهن فقال رسول الله ولكن حمزة لا يواكى له قال ثم قام فانتبه وهن يبكين قال فمن اليوم اذ يبكين يندبن حمزة۔ (جلد ۳ صفحہ ۱۰۰)

حضرت رسول خدا نے احد سے مراجعت فرمائی تو انصار کی عورتیں اپنے شہید شدہ عزیز و اقارب پر رونے لگیں۔ حضرت نے فرمایا کہ افسوس حمزہ پر رونے والی عورتیں موجود نہیں۔ حضرت سو گئے آنکھ جو کھلی تو صحابہ کی عورتوں میں حمزہ پر رو رہی تھیں۔ ہادی کہتا ہے کہ اب تک یہ رسم ہے کہ جب عورتیں صحابہ کو روٹی ہیں تو پہلے حمزہ پر گریہ کرتی ہیں۔ نیز اس روایت کو طبری اور ابن اثیر نے اپنی تاریخ میں اور ابن عبدالبر قرطبی نے عقدة فرید میں اور ابن عبدالبر نے استیعاب میں بھی ذکر کیا ہے۔

جس کے بعد اس کی صحت میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔
 غور کے قابل ترقیہ ہے کہ حجرہ نے مسافت میں انتقال کیا تھا
 اور کوئی روئے دلالہ نہ تھا تو حضرت رسول نے انصار کی غور توں سے
 گریہ و بکا اور نوحہ کر لیا اور یہ رسم جاری ہو گئی کہ کسی عزیز کی موت
 میں سب سے پہلے حجرہ پر گریہ کیا جاتا تھا تو پھر کسی مظلوم کے عالم
 مسافت میں شہید ہونے ان کے اعزاز کے نہ ہو سکتے پر اگر ہم
 گریہ و زاری کریں تو کون سا محل طعن ہے پھر جبکہ حقیقت یہ ہے کہ
 حجرہ کی مظلومیت سید الشہداء کی مظلومیت کے سامنے کوئی حقیقت
 نہیں رکھتی، شہید کہ بلا یہ مصائب کا خاتمہ ہو گیا تھا اور یقیناً رسول
 کے دل میں حسین کی جتنی محبت تھی وہ بھی حجرہ سے زیادہ ہے۔ پھر حضرت
 امام حسین پر گریہ کہاں تک خدا و رسول کی نظر میں مخلوق و مشن
 نہ ہو سکا۔

دوسری روایت

ابن عبدالبر نے استیعاب فی اسماء الاصحاب میں جعفر بن ابی طالب
 کے تذکرے میں لکھا ہے۔

لما اتى النبي لغي جعفر اتي امراة اسماء بنت
 عميس فضاها في زوجها جعفر ودخلت فاطمة ترهني
 الله عنها وهي تبكي ولقول واعطاء فقال رسول الله
 علي مثل جعفر فلبت البواكي - (استيعاب جلامد ۸۲)
 جب حضرت رسول کو جعفر کی خبر شہادت پہنچی تو حضرت انکی زوجہ
 اسماء بنت عمیس کے یہاں تشریف لے گئے اور ان کو جعفر کا پرہ دیا۔
 اسی اثنا میں فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا روتی ہوئی آئیں اور کہہ رہی تھیں
 ہائے میرے چچا! رسول نے فرمایا کہ جعفر ایسے شخص پر رونے والیوں
 کو رونا چاہیے۔

ایک تفسیر النساء العالمین کا فعل خود حجت اور واجب التبع
 ہے کیونکہ یہ معظمتہ بالتفاق علماء امت آیتہ تطہیر میں داخل اور بقول
 اکابر علماء اہلسنت مریم و آسیہ سے افضل تھیں اس کے ساتھ
 رسول کا اس فعل سے منع نہ کرنا جو اذکی صرح علامت ہے اگر صرف
 اتنا ہی ہوتا تو مطلب ثابت تھا مگر رسالت مآب نے اپنے قول سے
 شبہ کی گنجائش باقی نہیں رکھی۔ علی مثل جعفر فلبت
 البواکی و جعفر ایسے ذمی مرتبہ شخص پر رونے والوں کو رونا چاہیے
 اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رونے والا اگر بارگاہ احدیت میں مثل جعفر
 کے تقرب رکھنے والا اور مراتب فضیلت پر فائز ہو تو اس پر رونا
 مستحسن ہے۔

اسلامی کتب حدیث و تواتر سے پڑھو کہ جعفر کے فضائل حسین
 بن علی کے فضائل سے کون سی مناسبت ہے اور اگر مظلومیت کو
 خیال کر دو تو کربلا کے میدان کا جنگ موڑ کے معرکے سے تقابل کر دو
 زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔

بحمد اللہ قول رسول، فعل رسول، تقریر رسول ہر طرح
 سے گریہ و بکا کا جواز بلکہ استحباب ثابت ہو گیا۔
 مضمون اپنے حدود سے گزر چکا ہے اور موقع نہیں کہ قلم کو زیادہ
 گردش دکھا جائے۔

صحابہ و تابعین کے اقوال و افعال سے گریہ و بکا کے ثبوت کے
 لئے ایک مستقل مضمون درکار ہے۔ اسی طرح خصوصاً حضرت سید الشہداء
 سلام اللہ علیہم پر جس طرح رسول نے گریہ و بکا کے استحسان کو ظاہر
 فرمایا ہے اور خود واقعے سے قبل اس مصیبت کا اثر لیا ہے یہ ایک
 جداگانہ موضوع ہے۔

پھر صحابہ و تابعین، تبع تابعین اور اکابر اہل اسلام

نے شہادت سید الشہداء پر جن خیالات اور تاثرات کا اظہار کیا ہے اس کے لئے ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ اگر موقع ہو تو ان مطالب پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔!



زندہ جاوید کا ماتم

اقبال سپہیل کا اعتراض مستہزور ہے کہ یہ
 روئیں وہ جو قایل ہوں حیات شہداء کے
 ہم زندہ جاوید کا ماتم نہیں کرتے
 اس کا بجز یہ کیا جائے گا کہ کیا ہو گا؟ غور کیجئے کہ یہ حیات اور حیات
 جو شہداء کے لئے مورد تلفی و اثبات ہو سکتی ہے، کیا ہے؟
 ظاہر ہے کہ شہداء کی زندگی وہ مادی زندگی نہیں ہے جس لحاظ سے
 قبل شہادت انہیں زندہ کہا جاتا تھا اور جو ظاہری طور پر اس دار دنیا سے
 متعلق ہوتی ہے اس لئے کہ شرع اسلامی میں شہداء کی میراث تقسیم ہوتی
 ہے۔ ان کے اطفال حکم یتیم میں آتے ہیں اور ان کی ازواج حکم بیوہ میں آتی
 ہیں۔ اگر ان کے لئے موت کا ٹھہر کسی حیثیت سے کیا نہ جائے تو ان کے مرنے کے
 لئے تقسیم ان کی اولاد کی یتیمی اور ان کے ازواج کی بیوگی بالکل بے بنیاد ہوگی
 ہمارے مذہبی نقطہ نظر سے شہید اگر امام ہے تو اس کے بعد دوسرا امام برسر اقتدار
 آجاتا ہے حالانکہ حیات ظاہری میں آید، امام کے ہوتے ہوئے دوسرا امام
 حامل منصب نہیں ہوتا۔ بیوہ کے لئے عقد ثانی کی اجازت جس طرح سنہ ہر
 کی موت کے بعد ہے اسی طرح شہادت کے بعد حالانکہ زندگی میں یہ حکم
 نہیں، احکام اموات میں صرف غسل و کفن شہید کے لئے نہیں ہے۔ نماز
 میت اور دفن لازم ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا بھی تعلق موت کے ساتھ
 ہے زندگی کے ساتھ نہیں۔
 جب کہ شہداء کی زندگی جسے شہداء کے لئے ثابت کیا گیا ہے ارتقاء کے

روحانیت کا کوئی خاص درجہ ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اولیائے الہی میں سے کسی کے لئے بھی اگرچہ اصطلاحی طور پر شہید نہ ہو، موت نہیں ہے بلکہ جاودانی زندگی ہے جس کے مدارج باعتبار مراتب تقرب الہی مختلف ہوں گے پیغمبر خدا کی متفقہ حدیث میں ہے۔

مَنْ مَاتَ عَلَى حُبِّ آلِ مُحَمَّدٍ أَمَاتَ شَهِيدًا
بے شک فقہی حیثیت سے احکام شہید یعنی غسل و کفن کا ساقط ہونا یہ معرکہ جنگ میں شہادت پانے والوں کے ساتھ مخصوص ہیں مگر مرتبہ شہادت کا حصول بقدر ایمان ہر مومن کے لئے ہے۔ پھر جب ہر مومن بقدر ایمان مردہ نہیں تو انبیاء و مرسلین کا کیا تذکرہ! خود حضرت کی حدیث ہے کہ

”میری وفات کے بعد مجھ پر اسی طرح سلام کرنا جیسے زندگی میں، کیونکہ تمہارا سلام دونوں حالتوں میں مجھے یکساں طور پر پہنچے گا“

بعض علماء اسلام نے اسی لئے رسول خدا کے پاس بلند آواز سے بات کرنے کو منع کیا اور کہا کہ قرآن مجید میں ہے کہ

لَا تَرْفَعُوا صَوَاتِكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ كَمَا جَاهِلُوا

اس حکم کی تعمیل جس طرح اس وقت تھی اسی طرح اب ہونا چاہیے اس لئے کہ رسول زندہ ہیں اور ہماری آواز سننے ہیں۔

اب مذکورہ بالا شعر کے مہنوں پر غور کیجئے وہ کہتا ہے کہ ”جو زندہ جاوید ہو اس کا ماتم نہیں کرنا چاہیے“ اور یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ زندگی جاوید حسن عمل سے وابستہ ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ماتم کے قابل ان کی موت ہے جو انتہائی بد اعمال ہوں۔ اور حسن اعمال رکھنے والوں کا ماتم نہیں کرنا چاہیے۔ اب جب کہ اس شعر سے یہ اصول ثابت ہوتا ہے تو ایسے

اسے قرآن کے سامنے پیش کریں کیونکہ کہنے والا لفظ ہر مسلمان ہے۔ اور اس نے جو کہل ہے وہ صرف شاعرانہ انداز میں نہیں ہے جسے زیر لب بسم کے ساتھ صرف اس کے شاعرانہ کیف کو محسوس کر کے نظر انداز کر دیا جائے بلکہ اس نے منطقی انداز میں صغریٰ اور کبریٰ مرتب کر کے ایک نتیجہ نکالا ہے جس سے ایک یورپی قوم کے طرز عمل پر اعتراض مقصود ہے۔

آیت قرآن مجید کی سامنے ہے اس موقع کی جب فرعون اور اس کا لشکر غرق ہو گیا تو ارشاد ہوا ہے۔

فَمَا جِئَكَ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ وَمَا كَانُوا مُنظَرِينَ۔

”نہ ان پر آسمان رویا اور نہ زمین نے کہ یہ کیا اور نہ انھیں اللہ کی طرف سے مہلت دی گئی“

ظاہر ہے کہ یہ کنایہ ہے جس سے ان کی بد اعمالی کا اظہار مقصود ہے۔ کنایہ میں کسی حقیقت کے آثار و لوازم کا تذکرہ کر کے ذہن کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ نہ یہ کہ اس کی ضد کے لوازم کو بیان کیا جائے۔ مثلاً یہ بتانا کہ صبح ہو گئی تو یہ کہیں گے کہ روشنی ہو گئی یہ نہیں کہیں گے کہ اندھیرا ہو گیا جو کہ شام کے لوازم میں سے ہے۔ رات کی شدت دکھانا ہو تو کہیں گے کہ ہاتھ کو ہاتھ جھٹائی نہیں دیتا جو ظلمت کے اظہار میں مبالغہ ہے۔ اب دیکھئے شاعر کا نظریہ یہ تھا کہ روزانہ سے نہیں چاہئے جو خوش اعمال ہو بلکہ اسے رویا جائے جو بد اعمال ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ روزانہ بد اعمالی کا نتیجہ ہے۔ استحقاق گریہ خوش اعمالی کا نتیجہ نہیں ہے۔ مگر قرآن بد اعمالی کے اظہار میں کہہ رہا ہے۔

فَمَا جِئَكَ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ

ان پر آسمان و زمین سے گریہ نہیں کیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآنی نقطہ نظر سے بد اعمالی کا تقاضا یہ ہے کہ ان پر نہ رویا جائے اس کے بالمقابل جو حسن عمل رکھنے والے ہوں وہ مسخ گریہ ہوں گے۔ اب جتنا بلند مرتبہ کا انسان ہو جتنا مرکز فیوض برکتا

زیادہ ہو۔ وہ دنیا سے اٹھے تو اس کا اٹھنا گمبہ و ماتم کا باعث ہوگا یوں تو عموماً
 آسمان و زمین کی گمبہ کی نسبت بطور حجازہ عقلی ہو سکتی ہے جسے و السائل القرینۃ
 یعنی اہل القریبہ ہمارا روزمرہ میں پورا ستہرہ گواہ ہے یعنی اہل شہر، اسی
 طرح آسمان و زمین روٹے ہیں یعنی اہل آسمان و زمین مگر اٹھنے والے
 کی پیش خلد شخصیت کے لحاظ سے کبھی یہ حجازہ حقیقت بھی بن سکتا ہے یعنی
 مرنے والا جو دنیا سے اٹھا تو واقعی وہ زمین روئی اور آسمان نے گمبہ
 کیا۔ پھر اگر زندہ جاوید پر آسمان و زمین گمبہ کر سکتے ہیں جن کا کوئی فضل زیادہ
 باری کے بغیر نہیں ہو سکتا تو اس کا انسان بھی ماتم کہیں تو یہ مرضی الہی
 کے مطابق ہوگا۔

پھر اب یہ دیکھئے کہ شہداء کے زندہ جاوید ہونے کا علم ہم کس کس کے
 ذریعہ سے ہوا، ظاہر ہے کہ پیغمبر اسلام کے ذریعہ سے پھر اس زندہ کی کے
 تقاضوں سے ہم زیادہ واقف ہوں گے یا پیغمبر اسلام اب تاریخ اسلام پر نظر
 ڈالئے، بتائیے جناب حمزہ ابن عبدالمطلب شہید تھے یا نہیں؟ یقیناً شہید
 اور ایسے شہید کہ پیغمبر خدا نے سید الشہداء کا لقب دیا، تو پھر زندہ جاوید
 ہونے میں کیا شبہ! مگر حمزہ کی شہادت کے بعد کیا ہوا۔ غم کیا گیا۔ یا خوشی
 کے آنسو بہائے گئے۔ یا قہقہے لگائے گئے۔ یاد رکھئے کہ سنت و رسالت ہے
 جس کی نظیر عمل رسول میں ہو اور بدعت وہ ہے کہ جو عمل رسول کے
 خلاف ہو۔ اگر حمزہ کی شہادت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ رونا بدعت
 ہوتا۔ لیکن اگر رسول اللہ روئے ہیں تو پھر کسی شہید پر نہ رونا بدعت نہ ہوگا
 خوشنیاں کرنا ہی بدعت قرار پائے گا۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب حمزہ کی شہادت ہو گئی ہے اور صفیہ خوار حمزہ
 بھائی کی خبر کو سنا کہ میدان احد کی طرف روانہ ہوئیں اور جناب رسول اللہ
 کو اس کی اطلاع ہوئی کہ صفیہ آ رہی ہیں تو پہلے آپ نے حضرت علی بن ابی
 طالب سے فرمایا کہ جلد ہی حمزہ کی لاش کو چھدائیں تاکہ بہن کی نظر بھائی کے
 جسد و پیکر پر نہ پڑے۔ حضرت علی نے جانکر اپنی عیال لاش جناب حمزہ پر ڈالی

مگر جناب حمزہ قداور تھے۔ یاؤں کھلے رہ گئے تو آپ نے گھاس صحرا کی جمع کر کے
 پیروں کو مخفی کیا اتنی دیر میں صفیہ پہنچ گئیں اور لاش برادر گمبہ شہر و
 کیا اس موقع پر یہ نہیں ہو کہ رسول اللہ صفیہ کو منع فرمائے اور لاش نہ دیکھتے
 کہ تمہارے بھائی زندہ جاوید ہیں، زندہ جاوید کا ماتم کیوں کرتی ہو
 بجائے یہ فرمانے کے خود آپ صفیہ کے ساتھ روٹے میں شریک ہو گئے اور
 تاریخ میں یہ فقرہ ہے۔

یہ سبھی کلمات جکت صفیہ و منشیج کلمات تہنیت صفیہ
 نشیج کے معنی عربی میں روٹے روٹے ہچکیاں بندھ جانے کے ہیں مطلب
 یہ ہو کہ جتنا جتنا صفیہ روٹی تھکیں اتنا اتنا سوال گمبہ فرماتے تھے یہاں
 تک کہ جب صفیہ کی روٹے روٹے ہچکیاں بندھی ہوئی تھکیں تو خود پیغمبر کی بھی
 یہی حالت تھی۔ اب بتائیے زندہ جاوید کا ماتم ہوتا ہے یا نہیں؟
 اس کے بعد جب ہجرت مدینہ منورہ میں تشریف لائے اور مسجد کی
 طرف جاتے ہوئے سنا کہ الفداء کے گھروں میں روٹے کی صدائیں بلند
 ہیں ان عزیزوں کے غم میں جو جنگ احد میں شہید ہوئے تھے تو حضرت
 نے فرمایا "اما عیسا حسنہ فلا بد لہا" افسوس امیرے چچا
 حمزہ پر روٹے والیاں کوئی نہیں، چونکہ جناب صفیہ اپنے گھر میں آگئی
 تھیں مثل مشہور ہے "کیلا آرجی نہ رو تا بھلا نہ ہنستا" وہ تھوڑی
 دیر رو کر چپ ہو گئی تھیں حضرت نے یہ کلام حسرت آمیز فرمایا تو اس کی اطلاع
 نوائین الفداء تک پہنچ گئی وہ اسے منکر خانہ جناب حمزہ میں آگئیں اور
 حمزہ کا ماتم برپا ہو گیا۔

یہ زندہ جاوید کا ماتم کس نے برپا کیا یا رسول اللہ نے، اب
 کسی مسلمان کو اختیار ہے کہ وہ اس ماتم کو اپنے بھائی یا بھائی
 جناب جعفر طیار بھی شہید ہوئے۔ مورتہ میں ان کے دونوں
 ہاتھ قلم ہوئے، پیغمبر خدا نے منبر پر اپنے تھپلے میں ان کی خبر شہادت
 مسلمانوں کو سنائی جو خانہ شہیدہ عالم میں بھی پہنچ گئی۔ جب حضرت

تشریف لائے تو دیکھا فاطمہ زہرا اور ہی ہیں۔ رسولؐ نے انھیں
بھی منع نہیں فرمایا کہ جعفر زندہ جاوید ہیں۔ روتی کیوں ہو۔ بلکہ آئیے
ارشاد فرمایا علیؑ مثل جعفر فلتبک البواقی، جعفر ایسے آدمی
پر رونے والیوں کو رونا ہی چاہیے؟

لیجئے جناب رسولؐ خدا نے ایک عام اصول کا اعلان کر دیا اگر کہا
ہوتا کہ جعفرؑ پر ضرور رونا چاہیے تو وہ ایک حکم جزئی ہوتا اسے صرف
حیثیت نظر پیش کیا جا سکتا تھا۔

مگر یہ تو ایک کلی اصول ہے، ایک اصولی معیار ہے۔ اب جعفر ایسے لفظ
کے ایک معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ ایسے صاحب اوصاف شخص پر، تب بھی
منابہت ہوگا کہ حسن اعمال کا نتیجہ ہے: اسحقاق کر یہ! جو قرآن کی
آیت کے بالکل مطابق ہے اور دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ جس کو
اس طرح موت آئی ہو جیسے جعفرؑ کو آئی یعنی راہ خدا میں شہید
ہوا ہو، تب تو صاف صاف یہ اس اصول کا اعلان ہے کہ زندہ جاوید ہی
کا ماتم کیا جانا چاہیے اب کس مسلمان کے لئے جائز ہوگا کہ وہ کہے ہم زندہ
جاوید کا ماتم نہیں کرتے وہ جب یہ کہتا ہے تو وہ پیغمبر خدا کے ارشاد
سے بغاوت کا اعلان کرتا ہے۔ بواکر سمجھ لو جھگڑ کر کہے تو یقیناً دائرہ اسلام
سے خارج کرنے کے لئے کافی ہے۔

اپنے مذکورہ بالا بیان کی روشنی میں اگر ہم ایک شعر کی شکل میں
اقبال سمیل کا جواب دینا چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہ

کیا روؤ گے ان کو جو ہلاک ابدی ہیں

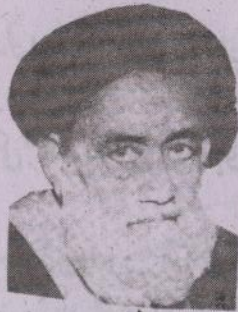
کیوں زندہ جاوید کا ماتم نہیں کرتے!

(یعنی) قرآن اور حدیث تو یہی کہہ رہے ہیں کہ زندہ جاوید کا ماتم
کرنا چاہیے۔

اب اگر کچھ لوگ اسے پسند نہیں کرتے تو وہ ان کا ماتم کریں جھٹھیں
ہلاکت ابدی نصیب ہوئی ہے مگر ان کا ضمیر بھی شاید اس کو پسند نہ کریگا

کہا جاتا ہے کہ رونا بزدلی کی نشانی ہے میں کہتا ہوں کہ کسی شطرناک
معرکہ میں موجود رہ کر خطرے کے احساس سے رونا بزدلی قرار دیا سکتا
ہے مگر کسی خطرناک جہاد میں عدم شرکت پر رونا عین بہادری ہے
یاد رکھئے کہ کربلا کے مجاہدین زخم کھاتے اور خون بہاتے ہوئے مگر یہ نہیں
کہتے تھے بلکہ وہاں تو بریرہ اور عبدالرحمن آپس میں مذاق کرتے نظر
آتے ہیں وہاں ابو عباسؑ و علیؑ اکبرؑ کا کیا ذکر شیر خواہ علیؑ اصغرؑ تک مسکراتے
ہوئے شہید ہوئے ہیں۔ ہاں عباسؑ نہیں روئے اور علیؑ اکبرؑ نہیں
روئے کہ انھیں خون افشانی کا موقع مل گیا مگر زمین العابدینؑ بھر
روئے کیونکہ حکمت ربانی نے ان کو اس قربانی میں شہید ہو کر
شرکت سے مجتہد بنا دیا تھا۔

ہماری بھی اگر قسمت یاوری کرتی کہ اس قربانی میں عملی حیثیت
سے شہید ہوتے تو پھر خون افشانی کرتے اشک افشانی نہ کرتے یہ
اشک افشانی تو اس پر ہے کہ اس سعادت کو حاصل نہ کر سکے اب اگر اس
تصور کے ساتھ یہ آئسو بہائے جا رہے ہوں تو ان سے ہمت میں کمزوری
پیدا نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کا عملی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیں آرزو رہے اور یحییٰ
سے انتظار کہ اب جو نصرت دین کا عملی موقع ہمیں دستیاب ہو سکے اس میں
اپنی ممکن اور با محمل قربانی سے دریغ نہ کریں۔



اگر واقعہ کر بلانہ ہوتا تو کیا ہوتا

الحمد لله رب العالمين والصلوة على سيد الانبياء والمرسلين الذين اصابهم بين
۱۳۶۱ھ کے بین الاقوامی اجتماعات کے بعد جو شہر قصبہ

دیہات میں منعقد ہوئے تھے اور جن میں سے ہر اجتماع میں ہر قوم و مذہب کے افراد شریک ہوئے تھے کم از کم میرے لئے اور میرے ان رفقاء کے لئے جو دہلی یا لکھنؤ سے آئے ہیں یا اس زمانے میں وہاں کے باشندے تھے لاہور کا یہ مظاہرہ حسینیت کوئی حیرت خیز یا غیر معمولی موقف نہیں۔

مگر یاد رکھئے کہ جتنا مرض شدید ہوتا ہے دو کی تاثیر اسی قدر زیادہ نمایاں ہوتی ہے وہ ۱۳۶۱ھ تھا اور آج ۱۳۶۲ھ ہے۔ اتنی مدت میں حالات میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا ہے اس درمیان میں جو انقلابات، زلزلے، آندھیاں اور سیلاب آئے انھوں نے زمین و آسمان کو بدل دیا ہے، ان حالات میں یقیناً لاہور کا یہ جلسہ خاص اہمیت رکھتا ہے اور یہ ایک قسم کا نیا تجربہ ہے جو تاریخ انسانی کے سامنے پیش ہوا ہے۔

۱۳۶۱ھ میں دلوں کے آہنگینوں میں بال پڑے تھے مگر ان کے پرچے نہ اڑے تھے اور دل میں خراشیں آئی تھیں مگر گھاؤ نہ ہوئے تھے ہمارے رجحانات کی سمیٹیں الگ الگ ہوئی تھیں، لیکن جسم جدا جدا نہ ہوئے تھے۔

مگر ۱۳۶۲ھ میں جب کہ لاہور میں آج یہ عظیم الشان اجتماع ہوا ہے وہ وقت ہے جب کہ حالات نے ایسا عظیم تفرقہ ڈال دیا کہ ملک کا کیا ذکر کرنے

اور کھ لقمہ ہو گئے اکثر بھائی سے بھائی، باپ سے بیٹا، شوہر سے بیوی، بہن سے بھائی کی جلائی ہو گئی اس دور میں حسینیت کا یہ عجیب تجربہ ہے جو تاریخ انسانی کے سامنے پیش ہو رہا ہے اور یہ ثابت کہہ رہا ہے کہ کون کون انقلاب کے باوجود جب حسینیت کا پرچم کھل جاتا ہے تو مذہب کا فرق اور قوم و ممالک کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ اور ہندوستان اور پاکستان ایک ہو جاتے ہیں۔

۱۳۶۱ھ سے زیادہ آج کا یہ تجربہ کارگر اور مفید ہے اس لئے کہ اس وقت ہم ایک ایسے نظام کے ماتحت گرفتار تھے کہ تمدن عالم میں ہماری آواز نہ اتر رہی تھی، عالم کی بین الاقوامی مجالس میں آواز بلند کرنے سے ہم گھبراتے بلکہ شرماتے تھے مگر اب جبکہ ہم آزاد ہو چکے ہیں تو ہم حق رکھتے ہیں کہ بین الاقوامی عالم میں اپنے اس پیغام کو پہنچا سکیں۔

آج ہم اپنے ملک میں آزاد ہو چکے ہیں ہر ایک اپنے اپنے وسائل کا خود مالک ہے، اقوام عالم میں کم از کم آئینی طور پر دوسروں کے ساتھ عالمی مسائل کے حل کے لئے برابر سے بیٹھ سکتے ہیں بلکہ بعض جگہ ہم ثالث بن کر مسائل کو حل بھی کرتے ہیں اور دنیا ہمارے سامنے اپنے مسائل پیش کرتی ہے تو یہ جگہ ایک تجربہ گاہ ہے اس کی کامیابی کے بعد میں اس مستقبل کو دیکھتا ہوں جب کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں کے اکابر ذمہ عمار حسینیت کے زیر سایہ عالمی مسائل کو طے کریں اور شاید آگے چلکر وہ حالات پیدا ہوں کہ "حسین ڈے"، کا یہ جلسہ کل عالم کے کسی بڑے مرکز میں منعقد کیا جائے۔ خواہ امریکہ میں خواہ یورپ میں اور خواہ روس وغیرہ میں اور پھر اس حسینیت کے مرکز برین الاقوامی دکھ درد کا علاج کیا جائے۔

یاد رکھئے کہ آج کوئی تاجدار و فاتح حمالک ایسا تصور نہیں کیا جاسکتا جس کا نام اقوام و ملل کو گلے ملادے گا۔ چاہے وہ کتنے ہی جاہل و کمال کا مالک ہو مگر کہ بلا کے ٹرپلے ہوئے لاشے بہتا ہوا خون، نروں ریلز بننے

دلے سر آج دنیا کو ایک موقع پر آسکتے ہیں۔ سمجھو آپ نظام اہل بیت؟
 دنیائے فتح ممالک کو کامیابی کی دلیل سمجھا، لیکن اہل بیت نے فتح
 قلوب کو اصل فتح کی دلیل سمجھا۔ فاتحین ممالک ختم ہو گئے لیکن فاتحین قلوب
 اسی طرح زندہ ہیں۔

یا در کھٹے کی یہ فتح کا راز وہ تھا جسے حسین کے مشیر کا سمجھ نہ تھے اور
 حضرت امام حسین کو رائے دی کہ آپ کو بلانے چاہیے مگر امام نے مشیروں
 کا کہنا نہ مانا تو کیا یہ برا کیا؟ پیغمبر اسلام نے اپنے مشیروں کا کہنا کب مانا تھا؟
 کسی اور کا کیا ذکر ہو سکتا ہے؟

یہ مشیر ان امام مادی مستقبل سامنے رکھتے تھے اور آج کے مشیروں
 کا حوالہ دینے والے بھی دماغ رکھتے ہیں۔ بیشک وہ حدود و نگاہ کی رو سے
 مر گئے، مٹ گئے، گود کے بچے تک سترہید ہو گئے، غور نہیں اسیر ہو گئے، یہ
 سب مشیروں کا کہنا نہ مان کر ہوا مگر پیغمبر اسلام نے بھی تو مشیروں
 کا کہنا نہ مان کر دکھائی اٹھائے۔

یہ نہ دیکھئے کہ ۱۳ برس کے بعد ہجرت ہوئی اور انھار ملے لیکن
 ہجرت سے پہلے تیرہ برس رسول خدا نے کیا کیا دکھ نہیں سہے جسم مبارک
 پر پتھر نہیں کھائے؟ سر مبارک پر خس و خاشاک نہیں پھینکا گیا؟ یہ سب
 کچھ ہوا۔ شغب ابوطالب میں سو برس مقید رہے، یہ نہ مانے اتنا شدا کہ
 سے بھرا ہوا تھا کہ کئی کئی وقت نہ کھانا ملتا تھا نہ پانی، اکثر درختوں
 کے پتے کھا کھا کر گذر کی جاتی تھی۔ ان ہی تکالیف کا اثر تھا کہ مجاہد
 سے باہر آنے کے چند ہی ماہ کے اندر حضرت خدیجہؓ اور ابوطالبؓ دونوں
 کی وفات ہو گئی جس کی بنا پر رسول خدا نے اس سال کا نام "عام الحزن"

رکھا یہ سب کچھ کہنا نہ ماننے ہی کا نتیجہ تو ہوا۔
 اب دنیا بتائے کہ انھوں نے اچھا کیا یا برا اور اس کا کیا نتیجہ ہوا
 ہوا؟ پھر اگر پیغمبر اسلام کا مشیروں کے مشوروں کو رد کر دینا درست
 تھا تو حضرت امام حسین نے بھی اگر مشیروں کا کہنا نہ مانا تو کیا برا کیا؟

کتب لڑائی رخ میں مشیروں کا ذکر بہت جگہ ہے مگر کسی ضعیف سے ضعیف
 روایت میں بھی یہ بات نہ ملے گی کہ کسی مشیر نے یہ رائے دی ہو کہ آپ
 یزید کی بیعت کر لیجئے، مشورے اس طرح کے تھے کہ عراق نہ جائیے۔ طائف
 تشریف لے جائیے۔ مین چلے جائیے۔ مگر معظمہ میں قیام کیجئے لیکن
 کسی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ آپ یزید کی بیعت کر لیجئے۔

اس کے یہ معنی ہوئے کہ یزید کی بیعت کرنا امام حسین کے لئے سب
 ہی کے نزدیک ناممکن یا ناروا بات تھی، اب بیعت نہ کرنے کے بعد
 جن جگہوں کے متعلق مشورہ دیا جا رہا تھا ان میں سے کوئی بھی کیا
 ایسی تھی جو مملکت یزید کی حدود سے باہر ہو لہذا نتیجہ یہی تھا
 کہ یزید کی طرف سے فوج کشی ہو۔

"نہایت دیاس دیو مہر کا وہ فقرا کس قدر پسندیدہ ہے جو آپ
 نے اپنی آج کی تقریر کے دوران میں کہا کہ" اب سوال مقتل کے انتخاب
 کا تھا، شہادت امام حسین علیہ السلام تو یقینی تھی ہی اگر مدینہ میں
 رہتے تو اسی طرح ہوتا جیسا حضرت امام حسین علیہ السلام کے ساتھ
 ہوا۔ اسی طرح کہتے ہیں ہوتے تو بھی کسی خفیہ طریقے سے خاتمہ کر دیا جاتا۔
 امام حسین کا مکہ چھوڑنا کن حالات میں تھا اس کو یوں سمجھئے کہ جو
 دستور فطرت کے خلاف عمل ہوا سے ضرور غیر معمولی اسباب کا نتیجہ
 ماننا پڑے گا۔ وہ حسین جو ۲۵ حج پا پیادہ کر چکے تھے اور حج کے اس قدر
 متنازع ہوں کہ مدینہ سے آکر حج کرتے ہوں، اس طرح کہ مرکب ساتھ
 خالی جا رہے ہوں اور آپ پیدل جا رہے ہوں، کیا اتنے ذوق عبادت
 رکھنے والے حسین کو مکہ سے آج وہ رابطہ نہ تھا جو مسلمانوں کو خانہ کعبہ
 سے ہوتا ہے؟ ان کا تعلق کعبہ کے ساتھ مذہبی تعلق کے علاوہ خانہ کعبہ
 تعلق بھی تھا۔ وہ ان کے باپ کا مولد بھی تھا، پھر خیال تو کیجئے کہ
 پیغمبر اسلام کا نواسہ اور ایک دن حج کا باقی رہتے ہوئے وہاں سے
 سفر کر رہے ہیں جب کہ تمام مسلمان مکہ کی طرف حج کرنے جا رہے ہیں وہ

وہاں سے مکہ چھوڑ کر نکل رہے ہیں اور راہ میں قافلے والے پیرت سے پوچھتے ہیں کہ امام اس وقت کدھر جا رہے ہیں، اور ہر شخص کا سوال فرزند رسول کے دل پر نشتر کا کام کہہ رہا ہے ہر ایک سے کہاں، اصلی بات بتانے کسی سے کہہ بھی دیا کہ اگر میں نکل نہ کھڑا ہوتا تو قتل ہو جاتا یا گرفتار ہو جاتا (واللہ لولہم اخرجوا کخذت) اس لئے کہ حاجیوں کے بھٹیس میں سپاہی بھیجے گئے تھے کہ جب اور جہاں امام ملیں انھیں شہید کر دیا جائے۔

ان ظالموں کے لئے جب وہ شہر الحرام نہ تھے تو بلدا الحرام ان کے لئے حرام کہاں ہو سکتا تھا جب کہ ان کو وقت کی حرمت کا خیال نہ تھا لہذا جگہ کی حرمت کا احترام کہاں کرتے۔

آج دنیاوی سیاست کی نظر سے اس امر کو جاننے کہ اگر کہیں مکہ میں طواف یا سعی کی حالت میں یا نماز میں کوئی شخص آ کر شہید کر دیتا تو فرزند رسول شہید ہو جاتے لیکن آج تک دنیا کو یہ نہ معلوم ہو سکتا کہ قاتل کون ہے۔

صحفیات تاریخ پر آج یہ معاملہ صاف ہے کہ حضرت امام حسین بالکل بے جرم تھے اور ان کا قاتل بے نیاد تھا لیکن اگر فرزند رسول اس صورت میں شہید ہو جاتے تو قاتل امام بوسندہ ہو کر زندہ رہتا۔ امام حقیقی معذوں میں قتل ہو جاتے اور آپ کا مقصد بھی آپ کے ساتھ ہی قتل ہو جاتا۔

کیا مشیران امام اتنے دور رس تھے جو ان تنازع کو مدنظر رکھ کر مشورہ دیتے؟ ان میں کچھ واقعی ہمدرد تھے اور کچھ نامالشی طور پر خیر خواہ تھے جو سیاست کے ماتحت ہمدردین رہے تھے مگر سب کے مشورے صرف وقتی حالات کی بنا پر جذبات سے متاثر ہو کر دیئے گئے تھے مگر حسین علیہ السلام جذبات سے بلند تر تھے، کیونکہ جذبات سے بلند ہستی کا نام

ہی معصوم ہے اور انھوں نے مشوروں کی مخالفت کر کے اپنا جذبات سے بلند ہونا دکھا دیا اور ثابت کر دیا کہ وہ جذبات سے کسی طرح متاثر نہیں ہوتے کہا جاتا ہے کہ کربلا کا واقعہ اس قدر اہمیت کیوں رکھتا ہے؟ یا اس کو اس قدر اہمیت کیوں دی جاتی ہے؟ اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ مگر اب جبکہ واقعہ کربلا ہو چکا میں کیا بتاؤں کہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا جس نے تارہ کی نہ دیکھی ہو اور دن ہی کو آنکھ کھولی ہو وہ پوچھے کہ سوز نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ تو اسے کس طرح بتایا جاسکتا ہے۔

امام نے جو قربانی پیش کی ہم نے اس کی برکات کے زیر سایہ آنکھ کھولی ہے آپ نے حقانیت کا ایسا سورت چمکایا جو غروب ہونے والا نہیں، لہذا اب کوئی کیا سمجھے کہ واقعہ کربلا نہ ہوتا تو کیا ہوتا، یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی کہے کہ خدا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ ظاہر ہے کہ خدا نہ ہونے کا تجربہ ہی کسی کو نہیں ہو سکتا، کیونکہ خدا نزل سے ہے، میں تو سمجھتا ہوں کہ واقعہ کربلا نہ ہوتا تو یہ جو کچھ آج ہے کچھ بھی نہ ہوتا ہمارا دینی زندگی جیکو دوسرے لفظوں میں انسانی زندگی کہوں گا اور سرفیافہ باشعور باعزت اور خوددار زندگی، اس کا کچھ پتہ نہ ہوتا، اذانیس نہ ہوتیں اقا نہ ہوتی، سخا نہ ہوتی، روزہ نہ ہوتا، حج نہ ہوتا، قرآن نہ ہوتا، اخلاق نہ ہوتا، احساس نہ ہوتا، تمدن نہ ہوتا، تہذیب نہ ہوتی، مساوات و اخوت نہ ہوتی، حریت نہ ہوتی، جذبہ شہادت نہ ہوتا، حقانیت نہ ہوتی اور حق پرستی نہ ہوتی، اب اس کے بعد میں کیا بتاؤں کہ واقعہ کربلا نہ ہوتا تو کیا ہوتا مگر ابھی تک تو یہ دعویٰ ہی دعویٰ معلوم ہوتا ہے اس کے ثبوت کے لئے میں کہوں گا۔ یہ دیکھئے کہ واقعہ کربلا نہ ہوتا تھا تو کیا ہو رہا تھا اور خلائی قسم جو ہو رہا تھا وہ ایسا ہے کہ اب یقیناً مشکل سے آتا ہے کہ یہ ہو رہا تھا۔

جس بیخود نے یہ نمونہ پیش کیا ہو کہ دین و دنیا کا اقتدار زیر قدم رکھتے ہوئے کسی کسی وقت پیٹ پر بیٹھ باندھا اور کھانا نہ کھایا ہوا اور

پیغمبر نے ہمیں یہ بخور دکھایا ہو کہ وہ معزز بیٹی جس کی تعظیم کو آپ کھڑے ہو جاتے ہوں یعنی فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اپنی جگہ تو ان کا یہ عوارزہ مگر جب انھیں کینز سے دفرماتے ہیں تو کینز کے ساتھ مساوات کا اتنا خیال فرماتے ہیں کہ بیٹی کھڑا کام کا ج فتنہ پرندہ لانا بلکہ ایک دن کھڑا کام خود کرنا اور ایک دن قعدہ سے لینا۔ چنانچہ بیٹی نے ایسا ہی کر کے دکھایا کہ ایک دن فتنہ لوندی کھانا پکاتی اور کام کاج کرتی اور حضرت فاطمہ آرام فرماتیں اور دوسرے روز حضرت فاطمہ کھڑا کام کرتیں اور فتنہ آرام کرتیں لوگ کہتے ہیں کہ غلامی کو ختم کیوں نہ کر دیا؟ اگر ایسا ہوتا تو معیار غلامی اپنی جگہ ہی رہتا۔ آل رسول نے بتایا کہ یہ تو باہمی تعاون کے ذریعے ہیں۔ آقا غلام، خاندانہ بیوی دیزہ۔ یہ رشتے کھڑے افراد میں معمول کا ذریعہ ہیں ان کو ختم کرنے کی ضرورت نہیں مگر ذہنیت بدلنے کی ضرورت ہے۔ آج جب چھوٹے بھائی سے یہ سلوک روا رکھا جاتا ہے اور کہتے ہیں سگ باش برادر خود دباش "تو ہمارے اس تمدن میں غلام، کینز کے ساتھ اچھا برتاؤ کہاں ہوگا۔ مگر یہ قصور ہمارے تمدن کا ہے۔ آل محمد کے غلاموں اور کینزوں سے بڑھ کر تم کو آزاد ہونا منظور ہے یا غلام رہنا۔ آج کی آزاد ہی ہزار غلامی سے بدتر اور وہ غلامی رشتہ کا جلا ہی تھی، وہ فاطمہ زہرا کا حسب ہدایت پیغمبر برتاؤ اپنی کینز فتنہ کے ساتھ اور اسی طرح حضرت علی کا برتاؤ اپنے غلام قنبر کے ساتھ اس وقت نہیں کہ آپ جب کہ خانہ نشین تھے بلکہ اس وقت جب کہ آپ شہنشاہ تسلیم کئے جا رہے تھے ایسے وقت قنبر کے ساتھ جو برتاؤ آپ نے دکھلایا کہ بازا سے دو پیرہن خریدے ایک سات درہم کا دوسرا یاخ درہم کا۔ پہلا پیرہن اپنے غلام قنبر کو حضرت نے عطا فرمایا اور یاخ درہم والا خود نہیب بن گیا۔ قنبر عرض کرتے ہیں کہ حضور یہ کچھ بہتر ہے آپ اسے نہیب تسلیم فرمائیے ہم میں سے آج کا کوئی آدمی اول تو ایسا کرتا ہی کیوں۔ اگر کوئی کٹیڈر قسم کا آدمی ایسا کہ بھی دیتا تو جب قنبر نے عرض کیا تھا کہ حضور یہ بہتر ہے آپ

پہن لیں تو وہ خود اپنی مصلحانہ حیثیت کا علم اور پناہ کر دیتا، وہ جواب میں ایک تقریر کر دیتا کہ قنبر میں دینا سے اس تفرقہ کو ختم کرنا چاہتا ہوں میں دینا میں غلاموں کا معیار بلند کرنا چاہتا ہوں دیزہ وغیرہ لیکن حضرت علی نے یہ جواب نہیں دیا۔ حالانکہ پیش نظر ہی تھا لیکن قنبر سے اگر یہ فرماتے تو اس جواب میں خود عدم مساوات مقرر تھی اس ارشاد سے قنبر کو احساس غلامی پیدا ہو جاتا۔ آپ قنبر کو ایسا جواب دیتے ہیں جیسا اپنے بچوں کو دیا جاتا ہے کہ تم جوان ہو تمہیں یہ پیرہن اچھا لگتا ہے۔

پیغمبر اسلام خود جس طرح کی تربیت مسلمانوں کی کرنا چاہتے تھے وہ اس واقعہ سے بھی ظاہر ہے کہ حضرت کے پاس صرف میں ایک نہ ٹیس خانی جگہ پاکر بیٹھ جاتے ہیں کہ اتنے میں ایک عزیز بوسیدہ کپڑوں والا جو آداب نبوی کا عادی ہے تم اس ٹیس کے پہلو میں بیٹھ جاتا ہے، ٹیس صاحب نے اپنے معیار طبیعت کے لحاظ سے بہت اخلاق سے کام لیا، بہت ضبط سے کام لیا اپنا دربار نہ بتاتا شاید اس کو ڈانٹ ڈپٹ کر نکال دیتے اور بدتمیز کہہ دیتے مگر وہ بارگاہ پیغمبر تھی۔ یہاں یہ ممکن نہ تھا۔ پھر کبھی فطری طور پر ذہنیت کا مظاہرہ اس طرح ہو گیا کہ ٹیس نے اپنا لباس سمیٹ لیا پیغمبر اسلام نے اتنا بھی کہہ دیا کہ اور خلق عظیم کی بیویوں پر بل آگئے اور فرمایا یہ تم نے کیا کیا؟ کیا اس کی عزت تم میں آجاتی یا تمہاری ریاست اس کو مل جاتی۔ یا چلی جاتی، دامن کیوں سمیٹا؟

مرئی اعظم کی اس تنبیہ کا اس پر اتنا اثر ہوا کہ وقتی طور پر اس کا ضمیر شرمندہ ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ اس گناہ کے کفارہ میں میں اپنی نصف دولت اس عزیب بھائی کو دیتا ہوں۔ متبسم ہوتے ہوئے حضور عزیب کی طرف متوجہ ہوئے کہ یہ نصف دولت کی پیت کش تم کو منظور ہے، عزیب صحابی نے جواب میں عرض کیا کہ میں اسے شکمہ یہ کہے ساتھ واپس کرنا ہوں۔ حضور نے فرمایا کہ یہ خوشی سے دے رہا ہے اس نے عرض کیا کہ مجھے ڈر ہے کہ یہ ذہنیت کہیں مجھ میں نہ پیدا ہو جائے۔

محض اخلاق کی کتابوں میں نمائشی طور پر اصول کو درج کر دینا آسان بات ہے لیکن جیتی جاگتی عمل کی دنیا میں اتنی کم مدت میں اس کو پیش کر دینا بڑی مشکل بات ہے۔ پیغمبر خدا نے ہر تعلیم کو عمل کی صورت میں دنیا کے سامنے زندہ جسے کی شکل میں پیش کر دیا کہ میرا نظام فقط ذہنی یا دماغی نہیں بلکہ عملی ہے، وہ زندہ نظام ہے جو سیرت و کردار کی شکل میں آنکھوں کے سامنے نمودار ہوتا ہے۔ میرا آئین اخلاق لفظی نہیں بلکہ بالکل عملی ہے یہی وجہ ہے کہ کتاب اللہ کے ساتھ اہل بیت کی ضرورت ہوئی اور ارشاد ہوا۔

انِ تَارِكٍ فِيكُمْ التَّقْلِيْنَ كِتَابِ اللّٰهِ وَعِلْمِيَّ

اور اسی لئے ان اہل بیت کو مباہلہ کے میدان میں اپنے ساتھ لے گئے تھے میرا عقیدہ ہے اور میرے نزدیک ہر مسلمان کا یہی عقیدہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے رسول کسی کی آئین کی محتاج نہ تھے بلکہ ان میں سے ہر فرد کی دعا تو کافی تھی مگر خالق اکبر نے نبی علیہ السلام کو ہدایت فرمائی کہ ان سب کو ساتھ لے جاؤ منزل مباہلہ میں اس لئے کہ جب صادقین اور کا ذہین میں مقابلہ ہو رہا ہے تو دنیا جان لے کر خالص صادقین افراد یہ ہیں اور جب رسالت مآب دنیا سے اٹھ جائیں تو جو کام آپ کے بعد ان سے لیا جانا ہے وہ زندگی ہی میں ان سے لے لیا جائے اس لئے نصرت اسلام کے لئے آج ان کو ساتھ لیا اور شہدیک کا رہنما یا، مباہلہ کے اس شریک کا میں سب سے کم سن حسین تھے اور ان کو رسول خود اپنی گود میں لے گئے تھے پیغمبر خدا کی نگاہ ماضی کے آئینے میں مستقبل کا نقشہ دیکھ رہی تھی کہ اسی حسین کی قربانی کی دنیا کو ضرورت پیش آئے گی۔ چنانچہ سال ۱۰ھ میں وہ پیش آ گئی۔ یہ اہلبیت دنیا میں اسی لئے چھوڑے گئے تھے اور ان کا تعارف مسلمانوں سے اسی لئے کیا گیا تھا کہ یہ اسلامی نظام و تمدن کی زندہ تصویر تھے۔ کیا حیرت کی بات نہیں ہے کہ جن مسلمانوں کی تربیت اس معیار پر کی جا رہی ہو، ان مسلمانوں میں صرف پچاس برس کے بعد ہی

ASSOCIATION KHOJ/ SHIA THNA ASHERI JAMATE

یہ وقت آ گیا کہ دار الحکومت اسلامی میں رشیم کے پورے لشکر رہے ہوں اور غلام تدریس کمر بند لگائے ہوئے بادشاہ کے سامنے کھڑے ہوں اور دروازوں کے اوپر پہرے لگے ہوں تاکہ کسی غریب کی رسائی نہ ہو سکے اور کسی مظلوم کی فریاد اس کے کالوں تک پہنچانا ناممکن ہو جائے ہی نہیں بلکہ بادشاہ کے سامنے طلا و نقرہ کے برتنوں میں پانی پلا یا جا رہا ہو۔

یہ سب باتیں یزید سے پہلے ہو چکی تھیں اور اگر کوئی صحابی مثلاً عباد بن تامت وغیرہ لڑتے بھی تھے تو ان کو قدامت پسند ہونے کی سند ملتی تھی۔

یاد رکھئے یہی حالات ترقی کر کے یزید کے کردار کے درجے تک پہنچے یزید سے پہلے سونے چاندی کے برتنوں میں پانی پیا گیا جو ظرف کے اعتبار سے شرع اسلامی میں حرام ہے تو نہ یزید کے یہاں شیخے کے جاموں میں شراب پی جانے لگی اور شراب کے دور چلنے لگے۔ اب بجائے ہند کے تکبیر کے نائے و نوش کی ہند آئیں بلند ہو رہی تھیں، رنگ برنگ کی تحفوں میں بزاز کا وقت آ کر گزر جاتا لیکن رونق محفل میں کچھ فرق نہ آتا۔

غضب یہ ہے کہ یہ سب جاہل شیخی رسول کے نام پر ہو رہا ہو اور سب مسلمان دربار کا وغیرہ مان رہے ہوں اور یہ ہونا اتنا حیرت ناک نہیں جتنا کہ عام طور پر مسلمانوں کا ماننا یعنی یہ سب کچھ ہو رہا ہو اور اس حاکم کو خلیفہ رسول مان رہے ہوں آج کا مسلمان ضرور حیرت سے یہ پوچھے گا کہ کیا مسلمان اس کو مان رہے تھے؟

جی ہاں سب مان رہے تھے اگر سب نہ مان رہے ہوتے تو تاریخ تمام کر کے کیوں بتاتی کہ فلاں فلاں نے نہیں مانا۔ تاریخ کا شمار کرنا بتا رہا ہے کہ سب مان رہے تھے۔ وفات پیغمبر کے پچاس برس کے بعد ہی احساس مذہبی کا یہ حال ہو چکا تھا اور ۶۱ھ سے اب تک کہ تیرہ سو برس ہو چکے ہیں مگر جب کہ عموماً احساس کیا جاتا ہے کہ اسلام کھٹتا چلا جا رہا ہے اور تمدن و تہذیب کی حدیں پامال ہو رہی ہیں مگر سن ۶۱ھ کے مقابل

دوبتہ کو تنکے کا سہارا

جنگِ قسطنطنیہ



حامیان یزید کو یزید کی بدبخامی کے احساس کی بنا پر تیرہ سو برس سے جو فکر لاحق ہے اس کے نتیجے میں بڑی کدو کا دوش کے بعد استغفروں نے اس کی "مغفرت" کے لئے صحیح بخاری سے جو سند حاصل کی ہے اور جسے اس پروردھویں مدنی میں محمود عباسی نے بھی "جہادِ قسطنطنیہ و لیشارتِ مغفرت" کی سرخی قائم کرنے کے درج کیا ہے وہ یہ موضوع حدیث ہے کہ اول جیش من امتی یضرون مدینتہ فیصلی مغفرت لہم، اور جب تنہا حدیث کے الفاظ اتنا مطلب کے لئے کچھ ناکافی ثابت ہوئے تو ستار حسین بخاری کے بیان سے مدد لی جاتی ہے کہ قطلانی نے اس حدیث کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ اس سے مراد رسولی نصرانیت کا بعد رہ مقام قسطنطنیہ ہے اور ابن حجر شارح بخاری نے لکھا ہے کہ یہ حدیث معاویہ اور ان کے فرزند یزید کی منقبت میں ہے اور پھر اس کے لئے کسی ام حرام کی یہ روایت بھی تلاش کرنی کہ ان کے گھر میں رسول نے قبیلہ فرمایا تھا اور خواب میں معاویہ کے بھائی جہاد کا لہشتہ دیکھا اور فرمایا کہ میری امت کی پہلی فوج جو بھری جہاد کرے گی اس پر جنت واجب ہے اور ابن کثیر شامی کہتے ہیں کہ ام حرام نے جب یہ بشارت سنی تو رسول سے عرض کی کہ آپ دعا فرمائیں کہ میں بھی ان میں شامل ہوں۔

میں اس وقت بھی حالت بہتر ہے اور یہ جمع کم نہیں ہے۔ مگر میں اسی جلے کے جمع سے سترہ اور دیہات سے آئے ہوئے تمام لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا ان میں سے کوئی ایک بھی یزید ایسے شخص کو جانشین رسول مان سکتا ہے۔ آج کے جاہلی سے جاہلی اور فاسق سے فاسق مسلمان سے بھی پوچھا جائے تو یزید ایسے کسی آدمی کو جانشین رسول نہ مانے گا لیکن رسول خدا کی وفات کے صرف پچاس برس کے بعد لوگ مان رہے تھے کیا اس کے بعد بھی کسی نبوت کی ضرورت ہے کہ واقعہ کہ بلا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ ظلم اور فسق و فجور سے یہ نفرت کیوں نہ پیدا ہوئی۔ یہ واقعہ کہ بلا کا فیض ہے آج کا یہ مسئلہ اور اس طرح کی تمام یادگاہیں اس لئے کہ زندہ رکھنے کے لئے ہیں اسی کے لئے عوامی ہوتی ہے اور اسی کے لئے نام حسین کی تکرار کی جاتی ہے۔

اب بھی سوال ہو گا کہ حسین نے مشیروں کا کہنا کیوں نہ مانا اور یہ کہ آپ یزید کی بیعت کر لیتے تو کیا طرح تھا۔ میں کہوں گا کہ وہ حسین نہ ہوتے جو مان لیتے کوئی اور ہوتا۔ حسین تو کبھی پشیمان نہیں ہوئے کہ مشیروں کا کہنا کیوں نہ مانا۔ حسین کے ساتھ والا بھی کوئی پشیمان نہ ہوا، کوئی بچہ حسین کے ساتھ کا نام نہ ہوا۔ اور ادھر کوئی اور کیا خود یزید ملعون کا نام ہوا۔!

مگر یاد رکھئے اس فرق کو کہ وہ ندامت زندہ ہتھیروں کا نتیجہ تھی جسے تو بوجھا جاسکے بلکہ وہ احساس شکست کا نتیجہ تھی اب اس خیال سے کہ میرے بعد وائے مفرین بنے ظلم ہو گا اور مجھے خود خدائے مفاد کا بھی احساس ہے اس لئے اپنی تقریر کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ خدا کرے جس طرح آج کے جہلہ میں اجسام یک جا ہوئے ہیں اسی طرح ہمارے دل و دماغ بھی یک جا ہو جائیں اور حسینیت کا جھنڈا خدا کرے برابر لہراتا رہے۔ اور مشرق سے مغرب تک کو اپنے سائے میں لے لے۔! (آمین)

آپ نے فرمایا کہ تم بھی اس میں شامل ہو گئی پھر ابن کثیر شامی اور ابن تیمیہ شامی کے شاگرد ذہبی کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ حضرت امام حسین بھی اس جنگ میں شریک تھے اس طرح گویا قاتل و مقتول دونوں کے جنتی ہونے کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔

حالانکہ اول تو اس حدیث کے راویوں کو جانچنا چاہیے، یہ تہ جیلے گا کہ ان میں کئی آدمی ناصبی ہیں جو علانیہ اہل بیت رسول کے دشمن تھے چنانچہ فاضل ہم عصر اہل احمد صاحب حسنی اپنی کتاب "ناصبان ملک خلیفہ صلی اللہ علیہ وسلم" میں لکھتے ہیں "اس روایت کے چاروں راویان آخر اسٹیجی و کجی و توہمہ خالد بن محمد جرح و مقصرح ہیں ان میں سے تین تو قدری اور ناصبی بھی ہیں اور اس سال سے بھی کام لیا گیا ہے اور سب دشمنی و مہمی بھی ہیں۔ جہاں بنی امیہ کی پروردہ نسلیں آباد تھیں۔ اور ان کی رگوں میں بنی امیہ کا کھلایا ہوا نمک دوڑ رہا تھا۔"

پھر یہ کہ جب بات تاریخ سے بڑھ کر حدیث تک پہنچ گئی تو یہ ایک حدیث اگر نظر مغفرت بتاتی بھی ہو اور وہ بھی ایسے عام الفاظ کی بنا پر نہ دیکھنا پڑے گا کہ اس کے بالمقابل ایسی دوسری احادیث تو نہیں ہیں جو خواہ سند ہی طور پر قابل ترجیح ہونے کی وجہ سے اس حدیث کے مطروح و متروک قرار دینے کے باعث ہو جائیں اور خواہ دلالت میں قوی ہونے کی وجہ سے اس کے اطلاق میں تنقید یا عموم میں تخصیص کا باعث ہوں۔ چنانچہ علامہ قسطلانی نے جن کا حوالہ دے کر عباسی صاحب نے مہلب کا استدلال مفید مطلب ہونے کی وجہ سے نقل کر دیا جو اس کی رد درج کی ہے وہ یہی ہے کہ

اجیب بان ہذا اہل علی طریق اجمیۃ نبی امیتہ و کایزم من دخولہ فی ذالک العموم ان لا یحتاج بدلیل خاص اذ اختلاف ان قولہ علیہ السلام مغفور لہم مشتم و ط جو کونہ من اہل المغفور حتی لو ارتد واحد من غیر اہا بعد ذلک لم یدخل فی ذالک العموم اتفاقاً قالہ ابن المثیر (قسطلانی جلد ۱ ص ۱۶۱)

اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ استدلال صرف بنی امیہ کی طرف ذریعہ کی بنا پر ہے عموم الفاظ میں اس کے داخل ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ کسی دلیل خاص کی بنا پر اس سے خارج نہ ہو سکے اس لئے کہ بالاتفاق حضرت کے اس ارشاد میں کہ وہ جتنے جائیں گے یہ مترط ہے کہ وہ جنت میں قابل ہوں یہاں تک کہ اگر اس جنگ میں شریک ہونے والوں میں سے کوئی بعد میں مرتد ہو جائے تو وہ بالاتفاق اس عام حکم میں داخل نہ ہوگا۔
یہ ابن مینر نے کہا ہے!

مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند کا ارشاد جسے شیخ الہند مولانا حسین احمد صاحب مدنی نے درج کیا ہے مولانا مدنی ہی کے ساتھ ملاحظہ ہو۔

"غایتہ مافی الباب بہ سبب خبر ابی ہاشم بن علی کہ داشت ہجو منافقان کہ در بیت الرضوان متریک بورند بوجہ نفاق ر عنوان اللہ، نصیب او نشان نہ شد، یزید ہم از فضائل این بشارت خروم ماند (اترخی کلامہ علیہ الرحمۃ) یعنی جس طرح بیعت رضوان میں منافقین متریک ہوئے اور اپنے نفاق کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل نہ کر سکے یہ بیکسی اپنی اندرونی خرابیوں کے باعث اس بشارت کی فیئلت سے محروم رہا۔ (قاسم العلوم ممبر امستلا) (مفقول از مکتوبہ شرح الاسلام) اس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کی صحت بالفرض تسلیم کرنے کے بعد بھی یہ حدیث مغفرت کی علت تاہم کا اظہار نہیں کرتی بلکہ مقتضی کو بیان کرتی ہے جس کے ساتھ شرائط اور مواعظ ہو سکتے ہیں جسے من قال لا اللہ الا اللہ دخل الجنة حدیث درست ہے مگر اس میں شرائط کا لحاظ ذرا ہے ان شرائط کو نظر انداز کے تصور کو سیاسی مقاصد سے یزید اور اس کے بعد کے سلاطین ہی نے قائم کیا ہے اور اسی غلط تصور میں اس نے ہر قسم کے معامی کا دیدہ دلیری سے انکاب کیا بلکہ عباسی صاحب کے بڑے عمدہ علیہ مؤرخ ابن کثیر نے بھی یزید کی بد اعمالیوں کا باعث اسی غلط تصور

کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

حد ثنا اسحق بن عیسیٰ عن ابی حمزہ عن ابی یوب الانصاری انه قال حین حضرہ الوفایۃ قد کنت کمت عنک شیعاً سمعت من رسول اللہ سمعتہ یقول لو کانتکم تذینون لخلق اللہ تو ما یدنون فیغفر لہم وعندی ان ہذا الحدیث والذی قبلہ حمل یزید بن معاویۃ علی طرف من الارحاء و رکب بسیدہ افعالاً کثیرۃ افکرک علیہ (البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۲۵۹)

اسحق بن یعقوب کی روایت ہے ابو حمزہ سے کہ ابو یوب انصاری نے اپنی وفات کے وقت کہا کہ میں نے ایک بات تم لوگوں سے چھپا رکھی تھی جو میں نے رسول خدا سے سنی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر تم لوگ گناہ نہ کرتے ہوتے تو وہ تمہیں بخشے۔ میرے نزدیک یہ حدیث اور اس کے پہلے والی حدیث ہی نے یزید بن معاویہ کو ایک حد تک مرحوبہ کے مسلک پر ڈال دیا اور اس کے سبب سے اس نے بہت سے قابل اعتراض افعال کا ارتکاب کیا۔

قاضی اطہر مبارک پوری اپنی کتاب "علی حین" میں لکھتے ہیں۔ "اس سے پہلے والی حدیث من مات لایتمرت جالہ اللہ تنیاً جعلہ اللہ فی الجنتہ ہے۔ اسی طرح یزید نے حضرت معاویہ سے اپنے ولی عہد بننے کا اصرار کرتے ہوئے ایک حدیث بیان کی تھی اور کہا تھا "لائی وجدت فی الآثار من تقلد اصراکما صحت قلنتہ ایام حکمہ علی المنار ص ۲۴)

وہ کہتے ہیں ہو سکتا ہے کہ ان روایات و احادیث کے ظاہری الفاظ نے یزید کو مرحوبہ کی صف اول میں کھڑا کر دیا ہو۔ ارجاء اور مرحوبہ کی صف اول میں ان ہی حالات میں جنم لیا اور حکمرانوں کی خرابی کو برداشت کرنے کے لئے اس وقت کی سیاست نے یہ ذہن پیدا کیا اور بڑے بڑے گناہ کرنے کے باوجود اللہ تعالیٰ سے رحمت و مغفرت کی رجاء اور امید کا نظریہ

پیش کیا اور ہر طرح کے گناہ اور گناہگار کو انگریز کے اس کے خلاف نفرت و عقارت کا جذبہ غم کرنے کی کوشش کی، (علی حین ص ۲۳۶) تیسری بات یہ ہے کہ اس حدیث میں بہ فرض صحت قسطنطنیہ کا نام نہیں ہے بلکہ مدینہ قیصر کا لفظ ہے اور یہ امر ثابت نہیں ہے کہ بروقت مدور حدیث مدینہ "قیصر کا اطلاق قسطنطنیہ پر ہوتا ہے اور وہ ملک روم کا دارالسلطنت ہو۔

مولوی نہال احمد صاحب حنفی امر پوری لکھتے ہیں۔

جب تک کسی مخصوص سہادت سے یہ ثابت نہ کیا جائے کہ زمانہ رسالت میں قسطنطنیہ اور صرف قسطنطنیہ ہی مدینہ قیصر بطور علم بولا جاتا تھا ہم محض کسی شخص کی ذاتی رائے کی بنا پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ مدینہ قیصر سے آنحضرت کی مراد خاص قسطنطنیہ ہی تھی۔ فتح الباری میں ابن الیقین اور ابن المینر کے بیانات موجود ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ مدینہ قیصر سے مراد شہر حمص ہے" (ناصیان ملک مخصوص ص ۳۶۵)

مولوی عبدالشکور صاحب سابق مدیر النجم لکھتے ہیں۔

"یہ مہر کی لڑائی میں شکست پانے کے بعد بادشاہ روم اپنے دارالسلطنت حمص سے بھاگ گیا۔ الخ

رسیرت خلفاء راستہ میں ص ۳۹)

اکبر شاہ خاں لکھتے ہیں۔ "انطاکیہ قیصر ہرقل کا ایشیائی دارالسلطنت تھا" (تاریخ اسلام ص ۲۳۹)

چوتھے۔ اس حدیث کے (بفرض صحت) الفاظ یہ تھے۔ کہ "پہلی فوج جو قیصر کے شہر پر جہاد کرے گی ان کے لئے مغفرت ہے۔

مگر خود عباسی صاحب کے قلم سے آگے جیکر اس استدلال کی رد ہو گئی ہے جب آپ نے یزید کے ملاحظہ و مناقب میں عنوان قائم کیا ہے۔ "حزبت دینیہ و خدات ملیہ"، اور اس کے تحت میں لکھا ہے کہ "معاویہ نے رومی عیسائیوں کے خلاف ۱۶ مرتبہ جہاد اور جہاد کے لئے تھے"

اور ہلا یہ دہنہایہ کے حوالے سے یہ درج کیا ہے کہ گرمیوں اور سردیوں میں
(جدا گانہ) عسکری مہمیں بھیجا کرتے تھے۔

(صفحہ ۳۱۰) پھر لکھتے ہیں۔

”یزید جیسے پرجوش قرظی لڑ جوان کو زمانہ شباب میں جہاری
سرگرمیوں میں حصہ لینے کی تڑپ بے چین کئے ہوئے تھی آخر کار ایسے
والد محترم سے درخواست کی کہ گرمیوں کی عسکری مہم پر مجھے تعینات
کریں۔“ (ص ۳۱۱)

”آخر کار کالفاظ صاف بتاتا ہے کہ یہ بہت سی مہموں کے بعد کی بات ہے۔
اس صورت میں وہ حدیث کہ اول جیش ”سب پہلا لشکر“ اس
”آخر کار“ والی مہم پر کیونکہ منطبق ہو سکتی ہے۔؟
جیسا کہ قاضی محمد اطہر مبارک پوری نے لکھا ہے۔

”بخاری میں یہ حدیث متعدد مقامات پر آئی ہے مثلاً کتاب الا
ستبذ ان حین باب من ار قومنا لقال عند ہرہ میں یا کتاب
الجهاد کے: ولة المرأة فی البحر میں، نیز کتاب الجهاد کے باب من یصرح فی
سبیل اللہ فتمات ہر منہم میں باب ما قیل فی قتال الروم۔
ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں۔ اول جیش من اتی لغز و ن
البحر قد اوجبوا قتالہم حرام قلت یا رسول اللہ انبا
فیہم قال انت فیہم۔ اس کے لئے وہ لکھتے ہیں

”پہلا بحری فوج وہ جیسا کہ معلوم ہوا ہے حضرت عثمان کے دور خلافت
میں ہوا اور معاویہ کی امارت میں ان کے اصرار سے ہوا جس میں ام حرام
بنت لمحان اپنے شوہر کے ساتھ شریک ہوئیں اور قبرص میں اپنی سواری
سے گر کر شہید ہوئیں۔ اور وہیں دفن ہوئیں“ (علی وحین ص ۲۱)

فتح قسطنطنیہ کے سلسلے میں جناب مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم
دیوبند لکھتے ہیں۔

صاحب عمدة القاری شہارح بخاری نے اسے تسلیم ہی نہیں کیا کہ

قسطنطنیہ کے جس ۶: وہ میں اکابر صحابہ شریک ہوئے تھے وہ یزید کی قیادت
میں ہوا تھا چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ

قال صاحب المرأة والاصح ان یزید بن معاویة عمرا
القسطنطنیہ فی سنة اثنتین وخمسين وقيل سب معاویة
جیش شام مع سفیان بن عوف ابی القسطنطنیہ فا دخلوا فی بلاد
الروم وكان فی ذلك الجیشت ابن عباس وابن عمر وابن الزبیر
وابی ایوب الا نصاری وثوبی ابی ایوب فی مداة الحصار قلت الا ظہر

ان ہوا الامارات من الصحابة كما نوا مع سفیان ہذا و
لہد کونوا مع یزید بن معاویة (عمدة القاری ج ۶ ص ۶۲)

مصنف مرآة نے کہا ہے کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یزید بن معاویہ نے
قسطنطنیہ کی جنگ میں ۲۵ھ میں شرکت کی ہے اور کہا گیا ہے کہ معاویہ
نے ایک لشکر سفیان بن عوف کے ساتھ قسطنطنیہ کی جانب روانہ کیا یہ لوگ
ملک روم کے اندر دو رتک چلے گئے۔ اس لشکر میں ابن عباس اور ابن عمر
اور ابن زبیر اور ابی ایوب القاری تھے اور حصار کے دوران میں ابی ایوب کی
وفات ہوئی میں کہتا ہوں کہ زیادہ ظاہر امر یہ ہے کہ یہ بزرگ صحابہ ابو سفیان
کے ساتھ تھے یزید بن معاویہ کے ساتھ نہیں تھے۔

ابن شاہ خاں تحریر کرتے ہیں۔

”بہ عظیم الشان لشکر مرتب ہو گیا تو سفیان بن عوف کی سپہ سالاری
میں قسطنطنیہ کی جانب روانہ کیا اور سفیان بن عوف کی ماتحتی میں اپنے بیٹے
یزید کو بھی جو سالہ فوج کا افسر تھا ایک حصہ فوج دیا۔“

(تاریخ اسلام ص ۱۳)

بس آخر میں جہاد قسطنطنیہ میں یزید نے شرکت کی وہ جب بھی ہوئی ہو
مؤید اس لیجئے۔ ابن اثیر لکھتے ہیں۔

وفی هذه السنة وقيل سنة خمسين سیر معاویة
جیشنا کثیفاً الی بلاد الروم للغزاة وجعل علیہم سفیان بن

عوف دامر ابنه يزيد بالغازية معهم فتشاكل واعتل فامسك
عنه ابوه فاصاب الناس في غنثهم جوع ومرض مثل يمد
فانشأ يزيد يقول

ما انت ابائي بما لاقت جموعهم
بالغنى قد وثق من جملي ومن شعهم
اذا التكات على الاثمار مرتفعاً
بد يرمح ان عندى امة كلتم

ام كلثوم امراة وهى ابنة عبد الله بن عامر
بنلغ معاوية شمره فاقم عليه ليحقن بسفيان في السام
ليصليبه ما اصاب الناس (ابن اثير ص ١٩٤)
اور اس سنہ میں اور ایک قول یہ ہے کہ ٤٠ھ میں معاویہ
نے ایک بڑا لشکر بلاد روم کی طرف جنگ کے لئے روانہ کیا اور ان پر سفیان
بن یوف کو سردار مقرر کیا اور اپنے بیٹے یزید کو حکم دیا کہ ان کے ساتھ جائے
مگر اس نے سستی سے کام لیا اور بیماریاں بن گیا تو اس کے باپ نے چھوڑ دیا اس
جنگ میں لوگوں کو بھوک اور سخت بیماری کا سامنا کرنا پڑا تو یزید نے
یہ شعر کہے۔

”مجھے اس کی نہیں پرواہ بچوان فوجیوں پر گزری مقام فرقد ورنہ
میں بخارہ اور سحر سے جبکہ میں لہیمی گدوں سے لگا ہوا اور ہر مردان
میں بٹھا ہوں اور میرے پاس ام کلثوم موجود ہے“

(یہ ام کلثوم اس کی بیوی کا نام ہے جو عبد اللہ بن عامر کی لڑکی تھی)
معاویہ کو اس کے ان شعروں کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے اسے
قتل دیا کہ وہ سفیان کے پاس سرزمین روم پر فرود جائے تاکہ وہ
مجھے اس مصیبت کو چھیلے جو اور لوگوں کو جھیلنا پڑی۔
مولانا محمد طیب صاحب مستم دار العلوم دیوبند اس پر تبصرہ کرتے ہوئے
لکھتے ہیں:-

اس سے ایک طرف یہ عقوہ کھلا کہ یزید کو جہاد کا کتنا شغف تھا؟

جیسے عیش پرستی میں یہ انہماک ہو کہ یاہ جو دامیر کے حکم کے طرح
طرح کے خیلے بہنے کہہ کے بہاد سے جان بجائے پھر اس کے ساتھ خود غرضی
اور خود منصبی کا یہ عالم کہ وہاں تو مجاہدین بہ بھوک پیاس اور بیماری
کے بہاؤ لڑ رہے ہیں اور یہاں یزید اور عیش دیتے ہوئے ترم ترم کر رہا
ہے کہ مجھے پرواہ نہیں ہے کہ کون بھوک پیاس میں مر رہا ہے اور کون دکھ
درد کا شکار ہے مجھے تو دیر مرال کے مکلف فرس تیکے اور ان کے ساتھ
ام کلثوم کی ہم بستری چاہیے۔ کہاں کا جہاد اور کہاں کے مجاہد“

(تہمید کہ بلا اور یزید ص ١٤٥)
یزید اس جہاد میں خود اپنے دعوے سے شریک نہیں ہوا بلکہ اپنے والد
یزید کو ار کے حکم سے اور انھوں نے یہ حکم بھی اسے آگے دیا تو تخریراً دیا تاکہ
اس کی عیش پرستی پر اثر پڑے۔ اور اسے اس تعیش پسندی
اور غفلت پروری کی سزا مل جائے۔ (ص ١٦١)
قاضی اطہر مبارک پوری نے اس روایت کو ابن خلدون کی زبانی
نقل کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

”امیر معاویہ نے سہہ میں ایک بہت بڑا لشکر لسبہ لای سفیان
بن عوف بلاد روم کی طرف روانہ کیا اور اپنے لڑکے یزید کو بھی ان کے ہمراہ
جانے کا حکم دیا لیکن یزید نے جانا پسند نہ کیا سزا کی۔ اس پر امیر معاویہ
نے اس کی روانگی ملتوی کر دی۔ اتفاق سے مجاہدین کو اس لڑائی میں
اکثر مصائب کا سامنا ہوا یزید کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ بے ساختہ یہ
اشعار پڑھنے لگا:-

مالی ابائی بما لاقت جموعهم
بفرقت و وثق من جملي ومن شعهم
اذا التكات على الاثمار مرتفعاً
بد يرمح ان عندى امة كلتم
امیر معاویہ کے کالوں تک ان اشعار کی آواز پہنچ گئی۔ یزید کے
بھیجنے کی قسم کھانی۔ (ترجمہ تاریخ ابن خلدون ج ٥ ص ٢٢١-٢٢٢)

کیا اس پر کہنے والے کو یہ کہنے کی ہمت
ہوتی ہے کہ ”یزید کو زمانہ شباب میں
جہادی سہ گروہوں میں حصہ لینے کی
ترطی بے چین کے ہوئے تھی“

اس کے علاوہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یزید نے اپنے باپ
کی ہمت سے محنت پر اپنے دور میں پانی پھیر دیا چنانچہ علامہ بلاذری
لکھتے ہیں -

بعث الیہا جاثی عشامی الفاکلہم اهل دیوان
فیروز المساجد ونقل الیہا جماعت من بعلیات
وبنی یہامد ینتدوا قاموا لیعطون الا عطیتہم اذ ان
لونی معاویتہ وولی بعدہ ابنہ یزید قافل ذالذی
البعث وامر بہدم المذینتہ - وحدثنی محمد بن
مصعبی الحمہبی عن الولید قال بلغنا ان یزید ابن
معاویتہ رضی ما لا عظیم ما اذ قدر حتما اقل
حند قلبوں فلما اولواہدم اهل قبروں مدینتہم
ومساجدہم - (فتوح البلدان ص ۱۰۰ طبع مصر)

وہاں بارہ ہزار فوج بھیجے گئے انھوں نے وہاں مسجدوں کی تعمیر کی
اور بہت سے بعلبک کے باشندوں کو وہاں منتقل کیا - اور وہاں ایک
شہر کی بنیاد ڈالی اور سب نے وہاں قیام کیا - انھیں پنجہ میں دیا جاتی
تھیں یہاں تک کہ معاویہ کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا یزید اس کے
بعد حاکم ہوا تو اس نے وہ پنجہ میں بند کر دیں اور شہر کو سما کر دیا -
اور محمد بن مصعبی حمہبی نے مجھ سے بیان کیا ولید کی زبانی کہ ہمیں معلوم
ہوا ہے کہ یزید نے ایک بڑی رقم ہزرت میں لیکر قبروں کی فوج کو واپس بلا لیا جنہیں جلی گئی
تو قبروں کے لوگوں ان کے شہر اور مسجد کو سما کر دیا -

انتقام خون حسین

مورخ طبری کا بیان ہے کہ حضرت امام حسین شہید ہو گئے اور ابن زیاد
اپنے لشکر گاہ سے جو خلیفہ میں قرابہ دیا گیا تھا واپس ہو کر پھر کوفہ میں داخل ہوا تو
شیعان علی نے ایک دوسرے کو نفر میں دلاہمت اور اپنی کوری پر اظہارِ ندامت
کرنی شروع کیا اور یہ اچھی طرح محسوس کرنے لگے کہ ہم سے ایک بڑے مجرم کا ارتکاب
ہوا کہ پہلے تو امام حسین سے نصرت کے وعدے پر کوفہ شریف لانے کی نحوہ ہمت
کی مگر تب آپ جہادی دعوت منظور فرما کر عراق شریف لے آئے تو ہم آپ کی
مدد کو نہ کئے یہاں تک کہ آپ بالکل ہمارے قریب ہی قتل کر ڈالے گئے تو ہند
انگلوں نے طے کر لیا کہ یہ عار و ننگ ہم سے دور نہیں ہو سکتا جب تک ہم
ان لوگوں کو جنھوں نے آپ کے قتل میں شرکت کی تھی - قتل نہ کر لیں یا اس کو قتل
کے ذیل میں خود بھی اپنی جان دے دیں چنانچہ انھوں نے اس سلسلے میں
دوستان اہل بیت میں سے پانچ اہم شخصیتوں سے رابطہ قائم کیا - سلیمان
بن مرد بنہ اخی ہما صحاب رسول میں سے تھے - سائب بن جبہ فراری جو اصحاب حضرت
علیؑ میں ممتاز شخصیت رکھتے تھے عبداللہ بن سعد بن نفیل اندلی - عبداللہ بن
دال تمیمی اور رفاعہ بن شداد جبلی چنانچہ یہ پانچوں آدمی اور دوسرے
بہت سے ممتاز افراد سلیمان بن مرد بنہ اخی کے مکان پر جمع ہوئے اور سائب
بن جبہ نے تقریر کی -

لے جس میں کہا گیا کہ ہم اپنی سچائی پر نانا اور اپنی جماعت پر فخر کیا کرتے
تھے لیکن جب خدا نے ہمارا امتحان لیا تو معلوم ہوا کہ ہمارے دلوں سے سراسر

غلط تھے۔ ہم نے امام حسینؑ کو دعوت دی اور ان کے پاس پیغام بھیجے کہ آئیے ہم آپ کی نصرت پر آمادہ ہیں لیکن آپ جب لشکر لے آئے تو ہم نے اپنی جان چرمانی اپنے جان و مال بلکہ اپنی زبان سے فریضہ نصرت و حمایت کو ادا نہ کیا اور نہ اپنے قبیلہ ہی کو اس کے لئے آمادہ کیا۔ اب ہم خدا و رسولؐ کو کیا جواب دیں گے جب کہ ہمارا کوئی عندر قابل قبول قرار پا ہی نہیں سکتا۔ البتہ یہ ایک صورت ہو سکتی ہے۔ قتل حسینؑ میں کسی حیثیت سے بھی جن جن نے حصہ لیا۔ ان سب استخا ص کو ہم قتل کریں گے یا اس سلسلے میں خود اپنی جانوں سے گزر جائیں گے۔ اب آپ لوگوں کو لازم ہے کہ کوئی اپنا سردار منتخب نہ کرے جس کی نہیر قیادت اس مہم کی تکمیل ہو۔

ان کی تقریر کے ختم ہوتے ہی رفاہیہ شہاد کھڑے ہوئے اور انھوں نے مناسب الفاظ میں ان کی تائید کی اور کہا کہ اگر آپ پسند کریں تو آپ ہی کو اس مہم کی قیادت سپرد کی جائے۔ یا اگر آپ کی رائے ہو اور دوسرے حضرات بھی متفق ہوں تو ہم اس ذمہ دار کی کو اپنی جماعت کی سب سے معزز شخصیت سلیمان بن عمرو کے سپرد کر دیں۔ جو پیغمبرؐ خدا کے صحابی ہیں اور جن کے کاندھج نصرت دین میں سب ہی کو معلوم ہیں۔ اور جن کی اہمیت رائے اور بصیرت بھی قابل اعتماد ہے عبداللہ بن وائل اور عبداللہ بن سعد نے بھی اپنی اپنی تقریروں میں مزید تائید کی اور مسیب بن نجبه اور سلیمان بن عمرو دونوں کی اہلیت کا اقرار کیا آخر میں مسیب بن نجبه کی اختتامی تقریر کے بعد بالاتفاق سلیمان بن عمرو کا اس جماعت کی قیادت کے لئے انتخاب ہو گیا۔

اب سلیمان کھڑے ہوئے اور انھوں نے انتہائی پر زور و اندازہ ایک تقریر کی جسے وہ اس کے بعد سے ہر جمعہ میں دہرایا کرتے تھے۔

اس کا مختصر اقتباس درج ذیل ہے۔
 ”ہم لوگ گردنیں اٹھا اٹھا کر استیاق کے ساتھ اہلیت رسولؐ کی تشریح آوری کی راہ دیکھ رہے تھے لیکن جب وہ آئے تو ہم نے لغافل و تساہل سے

سے کام لیا یہاں تک کہ فرزند رسولؐ ہمارے ملک میں اور ہمارے قریب قتل کر دیئے گئے، جب کہ آپ استغاثہ بلند کر رہے تھے لیکن کوئی لبیک کہنے والا نہ تھا اگر وہ فاسقین نے ان کو اپنے تیروں کا نشانہ بنایا اور نیزوں کے مستحق بنائے رکھا یہاں تک کہ آپ ستمیہ ہو گئے اور اتنا ہی نہیں بلکہ اعدا اپنے بعد شہادت آپ کا لباس تک لوٹ لیا پھر اب اٹھنا ہے تو اٹھ کھڑے ہو۔ اللہ کا غضب حرکت میں آچکا ہے۔ بس اب طے کر لو کہ اپنے بیوی بچوں کے پاس اس وقت تک واپس نہیں جاؤ گے جب تک اللہ کی خواست نذری کا سامان نہ کر لو۔ اور خدا میرے خیال میں تو وہ اس وقت تک تم سے خود بخود نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان کے قاتلوں کو کیفر کر داریں۔ یا خود اسی براہ میں جان نہ دے دو۔ ہاں خبردار موت سے ڈرنا نہیں کیوں کہ جو کوئی موت سے ڈرتا ہے وہ ذلیل ہوتا ہے دیکھو تو بنی اسرائیل کی ایک جماعت نے جب گورسار پرستی کے جرم کا ارتکاب کیا تو ان کی توبہ کس طرح قبول ہوئی ان سے کہا گیا کہ تم اپنے نفوس کے قتل کرنے پر تیار ہو جاؤ۔ اس پر جماعت نے کیا کیا وہ گردنیں بڑھا کر فیصلہ قدرت کے اجراء کے لئے تیار بیٹھ گئے اس لئے کہ انھیں اپنے جرم کا صحیح احساس تھا۔ اور یہ معلوم ہو گیا کہ بغیر اس کے توبہ قبول نہیں ہو سکتی۔ اب تم بھی اگر اپنے کو جرم سمجھ رہے ہو تو آئیسی ہی قرابانی کے لئے تیار ہو جاؤ۔ تلوار میں تیز کر لو۔ نیزوں کی انبیاں درست کر لو۔ اور پورے ساند و سامان کے ساتھ تیار ہو کر بیٹھ جاؤ کہ جب تمہاری دعوت دی جائے تو تم فرزند اجل کھڑے ہو۔ دیر نہ ہونے پائے۔

یہ مہم جویش تقریر تھی جسے منکر جمع کے جذبات میں طوفان برپا ہو گیا متعدد مقرر بننے کھڑے ہو کر اپنے تاثرات اور عوامی جہاد کا اظہار کیا۔ بعد اللہ بن وائل تیسری مرتبہ پورے اور بڑے پیاپاکہ ان کے پاس سرمایہ جمع کیا جائے۔ اور عوام و ولولہ سے بھر پورا مجمع منتشر ہوا۔

اب سلیمان نے ملائین میں سعد بن حذیفہ بن یمان اور دوسرے مقامات پر کچھ دوسرے اشخاص کو خطوط بھی لکھے۔

صبا سے پہلے ان لوگوں نے جا کر قبر حسین کی زیارت کی اس وقت ان کے گمبہ و شیون کا عجیب عالم تھا اور ہر ایک اس آندہ سے بے قرار تھا کہ کاش وہ نہرت امام میں روز عاشورہ کام آیا ہوتا۔ اور اس شہادت کے درجے کو حاصل کرتا۔

ایک شب و روز انھوں نے اسی عالم میں نوحہ و ماتم کے ساتھ ساتھ نماز و مناجات اور توبہ و استغفار میں بسر کی اس کے بعد جذبات کے انتہائی مؤثر اثریوں نے دلوں و جوش کے دریا کو شدت کے ساتھ طوفانی کر دیا ہے

ان مجاہدین نے منزل بہ منزل طے کر کے عین الورود میں جا کر اپنے صغیر مرتبہ کے پانچ دن کے بعد شام کی فوجیں ابن ذی الکلاع اور عیسیٰ بن مینر کی سرکردگی میں ان کے مقابل پہنچ گئیں اب سلیمان بن ہریرہ نے آخری انتظامات کئے اور اعلان کیا کہ اگر میں کام آجاؤں تو سردار لشکر مستیب بن بجنہ ہوں گے اور وہ شہید ہو جائیں تو سردار عبداللہ بن سعد بن لقیل ہوں گے اور ان کے بعد عبداللہ بن وال اور پھر رفاعہ بن شداد روز چہارم شنبہ ۸ جمادی الاول کو پہلا مقابلہ ہوا۔ یا جو دیکھ دشمن کی فوج بارہ ہزار تھی۔ ۳

اور یہ کلی چار ہزار گنہ بھی غالب آئے مگر دوسرے دن آٹھ ہزار فوج کی کمک ان کے مقابل میں آگئی جس کو عبداللہ بن زیاد نے روانہ کیا تھا۔ آج بڑی شدت کا مقابلہ رہا اور رات آنے تک جنگ جاری رہی۔ اب زخمیوں کی تعداد مجاہدین میں بہت زیادہ تھی۔

تیسرے دن دشمنوں کی کثرت اور ان کی قلت سے حالت دگرگوں ہو گئی پھر بھی جان لڑتے کہ مقابلہ کرتے رہے۔ مگر آخر میں بزدل دشمنوں نے تیر با تیری کا سلسلہ جاری کر دیا۔ چنانچہ آیت تیر سلیمان بن عمرو کے لگا جس سے وہ درجہ شہادت پر فائز ہوئے ان کے بعد علم لشکر

۱۔ طبری جلد ۴ صفحہ ۴۲ - ۳۔ طبری جلد ۴ صفحہ ۴۵

مسیب بن بجنہ نے لیا اور بڑی بہادری سے لڑے کئی زبردست حملے کئے مگر آخر وہ بھی شہید ہوئے۔ ۱۔

ان کے بعد عبداللہ بن سعد بن لقیل نے علم سنبھالا اور قبیلہ ازد کی جماعت کے ساتھ مقابلہ شروع کیا اس دوران میں مدائن کے تین سو اڑھائی ہزار مجتہدوں نے اطلاع دی کہ مدائن اور بصرہ سے ملک روانہ ہو چکی ہے مگر یہاں حالت اتنی نازک ہو چکی تھی کہ ان مجاہدین کی زندگی میں اس فوج کے پہنچنے کی امید نہ تھی۔ آخر وہ نود و نہینوں مجاہد بھی لڑ کر جان بحق تسلیم ہوئے۔ ۲۔

اور اس کے بعد عبداللہ بن سعد اور پھر عبداللہ بن وال بھی شہید ہوئے ۳۔

اب شام ہو گئی تھی اس لئے وہ جنگ موقوف ہو گئی نام زد سرداروں میں اب ہریرہ رفاعہ بن شداد باقی تھے مگر اب حالت یہ تھی کہ فوج کی تعداد چار ہزار سے گھٹ کر صرف چند سو باقی رہ گئی تھی اور ان میں سے بھی اکثر زخمی اور ناقابل جنگ تھے لہذا انھوں نے مقابلہ جاری رکھنے میں کامیابی کی صورت نہ دیکھتے ہوئے رات کے وقت اپنی قلیل جماعت کے ساتھ مراجعت اختیار کی اور اس طرح قاتلان حسین سے بدل لینے کی یہ یہی کوشش اختتام تک پہنچی۔



۱۔ طبری جلد ۴ صفحہ ۴۶

۲۔ طبری جلد ۴ صفحہ ۴۷

۳۔ طبری جلد ۴ صفحہ ۴۸

۴۔ طبری جلد ۴ صفحہ ۴۹

(بحوالہ ہفت روزہ شیعہ ۲۲ جنوری ۱۹۷۲ء)

واقعہ کربلا اور پرے کی اہمیت

کہ بلا میں حق و باطل کی جنگ تھی۔ نصرتِ دین کا سوال تھا اور دشمنانِ اسلام کا مقابلہ تھا کوئی شک نہیں کہ حملتِ حق اور نصرتِ دین جس طرح مردوں کا فریضہ ہے اسی طرح عورتوں کا فریضہ ہے مگر طریقہ کار اس کا دونوں کے لئے یکساں ہونا چاہیے یا مختلف۔

موجودہ تمدن جو عورتوں کو پرے سے پابندیوں سے آزاد کر رہا ہے اس کا جواب یہ ہونا چاہیے کہ طریق کار دونوں کا ایک ہے جس صورت سے مرد نصرتِ حق کے لئے میدان میں آئے ہیں اسی طرح عورت کو بھی آنا چاہیے خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ مردوں کی تعداد اتنی نہ ہو کہ وہ ظالم کی مادی قوت کا مقابلہ کر سکیں اور خصوصاً اس حالت میں کہ جب مرد اپنا کام انجام دے کر گزرتے چکے ہوں اور اب عورتوں کے سوا کوئی باقی نہ ہو ایسی حالت میں تو مرد و عورت کے درمیان کوئی نقطہ فاصلہ کھینچنا موجودہ خیالات کے لحاظ سے صحیح ہو ہی نہیں سکتا مگر یہ ایک حقیقت ثابتہ اور ناقابل انکار واقعہ ہے کہ حضرت امام حسین نے جو اپنے وقت میں اسلامی اقدار کے تحفظ کے واحد ذمہ دار تھے کہ یلا کے میدان میں پر وہ اور مخصوص نسوانی نظام تمدن کی وہ اہمیت ثابت کی ہے جو اس کے پہلے وہم و خیال میں بھی نہیں تھی۔

آپ دیکھئے کہ ایک طرف کم از کم تیس ہزار کالٹ کر اور ایک طرف زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو کے قریب مجاہدین جن میں ضعیف العمر لوڑھے بھی اور صغیر السن بچے بھی داخل۔ لوڑھے جہاد بالسیف سے مستثنیٰ نہیں رہے۔ قاسم کے ایسے نابالغ بچے مستثنیٰ نہیں رہے۔ مگر عورتیں جہاد بالسیف سے اس وقت سخت میں بھی مستثنیٰ نہ تھیں کوئی پر جوش عورت

جیسے ام وہیب زہرا علیہا السلام نے لڑی کہہ کر واپس فرمایا کہ عورتوں پر سے جہاد ساقط ہے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ نصرتِ زہرا کی اور ام کلثوم میں جہاد دستیابت کا جو ہر ام وہیب سے کم تھا مگر کوئی ضعیف سے ضعیف روایت ایسا نہیں بتاتی کہ ان میں سے کسی مقدس خاتون نے اس طرح کا اقدام کیا ہو۔ کیوں؟ اس لئے کہ نظامِ اسلامی جو عورت کے لئے ہے وہ ان کے دل و دماغ میں لاسخ تھا۔ یہ ایسا ارادہ کر ہی نہیں سکتی تھیں۔ زہرا و ام کلثوم کا کیا ذکر جو رسول کے گھرانے کی بیٹیاں تھیں ام لیلے۔ رباب اور مادانم ایسی خواتین نے بھی جو اس خاندان کے ساتھ صرف بہو ہونے کا رشتہ رکھتی تھیں قدم لگے نہیں بڑھایا، اس لئے ہرگز یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ معاذ اللہ ان کے دل میں نصرتِ اسلام کا ولولہ اور جوش نہ تھا ضرور تھا مگر یہ سمجھتی تھیں کہ ہمارے لئے اسلامی نظام تمدن میں ایسا کرنا سزا نہیں ہے۔

بڑے سخت مواقع تھے وہ، جب کوئی کہ طیل جوان میدان میں مصروف جہاد ہے، کوئی کم سن بچہ مگر کہ قربانی میں حق و فدا کر رہا ہے کوئی جوان سے زیادہ عزم و بھائی نہ بنے میں گھرا ہوا ہے اور اس وقت ماٹار کھنے والی ماں اور دل و جان سے فدا ہونے والی بہن پردہ کی پابندی کے ساتھ خیمہ کے اندر بیٹھی ہوتی ہے مگر واقعہ یہی تھا۔

یاد کیجئے وہ سخت ترین موقع کہ جب تمام عزم و انصاف شہید ہو چکے تھے کیلئے امام نہرۃ اعداؤں میں گھرے ہوئے نہ خوں سے چوہ اور آخہ میں بجائے پشتِ فرس کے زخمیں گرم پر افتادہ تھے۔ اور دشمن چاروں طرف سے گھیرے ہوئے سر کو قلم کرنے کے لئے بڑھ رہے تھے کیا اگر اس وقت خاندانِ نبوی ہاشمی کی تمام خواتین تلواریں لے کر فوج دشمن پر لوڑھ ٹپڑیں اور امام حسین کو اپنے حلقہ میں لے لیتیں تو حسین آسانی سے قلم نہ جاتا؟ کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت کہ بلا کی تاریخ کس صورت پر لکھی گئی ہوتی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ کیوں؟

کیا زینبؓ کا دم کلونم کی رگ و پے میں وہی خون گم درخش نہیں کہ رہا تھا
 ہو بالفصل العباس بلکہ خود امام حسینؑ کی رگ و پے میں گم درخش کہ رہا تھا
 کیا حضرت علی بن ابی طالبؑ کی شجاعت و جرات میں بیلیوں کا کچھ بھی
 ٹھہر نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ پھر کیا تھا؟ وہی جان بھائی
 اور اولاد سب سے زیادہ عزیز اصول اسلام کا لحاظ جو زکیر بن کران
 در در سیدہ بے کس بیلیوں کو آخر تک جڑے رہا۔

سب کچھ ہو گیا، مگر وہ اسی جگہ بیٹھی رہیں جہاں حضرت امام حسینؑ بٹھائے
 تھے اس وقت تک کہ جیتا تک وہ جگہ یعنی حجے باقی رہے۔ ہاں جب یہیں میں آگ
 کے شعلے بلند تھے اور ظالموں کے ہاتھ سروں کی چادروں ہی کو نشانہ ظلم بنائے
 ہوئے تھے تو تا موسیٰ اسلام کی خاطر ظالموں کی عزت و ناموس کی قربانی کے
 سوال کو عملی طور پر حل کرنے کی ضرورت تھی جس میں ان کے قدم پیچھے نہیں
 رہے۔ اب اس وقت انھیں بھائی بیٹوں اور عزیزوں کے تمام دائروں سے بڑھ کر
 داغ بگوشا وہ بے پردگی کا داغ تھا اور جب در دل کے اظہار کا وقت آیا تو تمام
 مصائب میں شدت و قوت کے ساتھ اسی مصیبت کا اظہار کیا گیا۔

اس موقع پر جب ثانی ذہرا حضرت زینب سلام اللہ علیہا کو دیا گیا یہ
 میں خطبہ پڑھنے کی ضرورت پیش آئی تو یہ یادگار زمانہ الفاظ تاریخی دنیا میں
 پردہ کی اہمیت کا ابدی ثبوت بن کر آپ کی زبان پر آ رہے تھے۔

امن العدل یا ابن الطلقاء خذیرت ہر اثر و امارت و سواد
 بنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ سب یا اقل ہتکت سترہن و ابدیت
 وجوہن یتقنہ وجوہن القریب والبعید والذہنی والشرفین
 (بے پردہ) کیا یہی انصاف ہے کہ تو نے اپنی عورتوں اور کینزوں کو پردہ
 میں بچھا رکھا ہے اور دختران رسول خدا کو قید کر کے بے پردہ پھیرا اور
 ان کے ہر دل کو بے نقاب کیا ہے۔ غضب ہے کہ نزدیک اور دور کے لوگ
 اور لپٹ و بلند ہر طرح کے آدمی ان کے تہوں پر نظر ڈالتے ہیں۔
 اس سے صاف ظاہر ہے کہ ثانی ذہرا حضرت زینب کبریٰؑ اپنی سب

ظہری مصیبت اس بے پردگی کو سمجھتی تھیں اور اس لئے اسی کا خفیہ طور پر
 آپ نے تذکرہ فرمایا۔
 (ہفت روزہ شیعہ اپریل ۱۹۶۷ء)

محقق عمر لا شیفتہ ضاکی اہم تصنیفات

- معقول مذہب - جملہ اصول دین کے متعلق عقلی اور سماجی ثبوت قیمت چار روپیہ
- نصابی تاریخ اسلام ۲ تاریخ اسلام کی بہت سی اہم
- بہ تحقیقی تبصیر غلط بیانیوں کا جواب قیمت چار روپیہ
- علم الحدیث - اصطلاحات حدیث، تدوین حدیث اور محدثین شیعہ پر جامع و مختصر کتاب قیمت تین روپیہ
- حدیث غدیر - واقعہ غدیر خم کے متعلق اردو میں مفصل ترین کتاب قیمت دس روپیہ
- کلام ابی طالب - حسن اسلام کے قصائد کا مجموعہ اردو ترجمے اور تالیفیں منظر کے ساتھ قیمت دس روپیہ
- مذہب اہلبیت علامہ شیخ محمد علی سابق شافعی
- میں کیوں اختیار کیا گیا کی کتاب کا اردو ترجمہ قیمت پندرہ روپیہ
- کلمہ علی ولی اللہ کلمہ ولایت کی اہمیت کتاب اہلسنت سے! قیمت
- تحقیقی حق - مولانا محمد حسین ڈھکو صاحب سے ان کے واقعی عقائد کے بارے میں استفسار اور عقائد شیعہ انٹرنیشنل کا
- استدلالی اثبات و استقرار استدلالی اثبات و استقرار قیمت دس روپیہ
- ان کتابوں کے لئے ہم سے رجوع کریں

اسلامی نظریہ حکومت اور حسین ابن علی

حکومت کی ضرورت کا وجود ضروری بھی ہے یا نہیں۔ اگر مطلق العنان آزادی کا تخیل انسان کے لئے صحیح ہے تو یہ خیال کیا جاسکتا کہ حکومت کی مطلق ضرورت ہی نہیں بلکہ انسان کا آزادی مطلق سے دوچار ہونا نیز ممکن ہے یہ کہنا کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے اور آزادی اس کا فطری حق ہے۔ بالکل بے معنی الفاظ کا جھوٹا وعدہ ہے جب تک اس کے ساتھ یہ قید نہ لگائی جائے کہ "نا جائز قیود سے آزادی"۔

اگر انسان دوسرے حیوانات سے ممتاز ہے تو اس کے لئے اجتماعی قیود کی پابندیاں ناگزیر ہیں۔ حالانکہ حیوانات میں کبھی بعض میں اجتماعی زندگی کے آثار نظر آتے ہیں مگر انسان کو تو اس سے مفروضی نہیں۔

ان ہی اجتماعی قیود کا نام "دستور العمل اور قانون ہے" اور اسی کی نافذ کرنے والی طاقت کا نام حکومت ہے۔ ممکن ہے کہ یہ خیال کیا جائے کہ اگر افراد خود احساس فرض رکھتے ہوں تو ان کے لئے حکومت کی ضرورت نہ ہوگی مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس کے لئے صرف اس فرض کافی نہیں ہے بلکہ ہر ایک کو صحیح نظام کی معرفت کبھی ضرور رہا ہے اور یہ کبھی لازم ہے کہ ان سب کا نقطہ نظر مفاد اجتماعی میں ایک ہی نقطہ تک پہنچے۔ اور کوئی دانتہ یا نادانتہ دوسرے کے مفاد کو نقصان نہ پہنچائے اور یہی تشریحی وقت ہو سکے گا جب وہ پوری جماعت فکر و ارادہ و عمل تمام منزلوں میں یکساں درجہ پر غلطی سے بری یعنی معصوم ہو۔ ایک ایسی جماعت کا ایک جگہ پر فراہم ہونا فیاضی

دنیا میں ممکن ہے وجود رکھتا ہو مگر خارجی عالم میں وقوع سے بیگانہ ہے اس لئے اس ضرورت پر بحث ہی کہنا بے کار ہے جہاں تک کہ عام انسانوں کا تعلق ہے کوئی بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا نظام اجتماعی یہاں تک کہ ایک گھر کی آبادی جو معاشرتی زندگی کی سب سے پہلی منزل ہے یہ کبھی کبھی حدود و حقوق اور انکی پابندی کے بغیر باقی نہیں رہ سکتی اور اس میں بھی ایک طاقت کی ضرورت ہے جو سب کو ان حدود کا پابند بنائے اسے آپ حاکم نہ کہئے گھر کا بڑا اکہم لیجئے۔

مگر ہر چیز ایک بڑے دائرے میں پہنچ کر حکومت کہلاتی ہے جس کی نوعیت میں پہلے جتنا بھی اختلاف کیا جائے مگر اس کی ضرورت میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

اگر سطلونے حکومت کی تین قسمیں قرار دی ہیں

اقام حکومت

- (۱) ایک شخص کی حکومت۔
- (۲) گھوڑے محدود میں افراد کی حکومت۔
- (۳) بہت سے افراد کی حکومت۔

اور یہ واقعہ ہے کہ اس وقت سے اب تک دو ہزار برس گزرنے کے باوجود دنیا طرح طرح کے تمدنی انقلابات اور نظریات کی تبدیلیوں کے باوجود ان تینوں قسموں کے دائرے سے باہر نہیں نکلی ہے مگر جب ہم ان تینوں صورتوں پر نظر ڈالتے ہیں تو کوئی بھی ان میں سے عقلی اصول پر درست ثابت نہیں ہوتی۔

ایک شخص کی حکومت اس میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس شخص میں آرزو امتیاز کون سا ہے کہ وہ حاکم ہو جائے اور باقی سب انسان حکومت ہوں۔ اس کے لئے قدیم زمانہ میں سلاطین کی جانب سے یہ خیال پھیلایا گیا کہ حاکم مبدائی طور پر دوسروں سے ممتاز ہوتا ہے یوں سمجھنا چاہئے کہ جسے انسان حیوانوں میں ایک نوع ممتاز ہے دینے سلاطین کا طبقہ انسانوں میں فطری طور پر ایک نوع ممتاز ہوتا ہے۔ مگر یہ خیال غلط ثابت ہوتا ہے ان انقلابات کو دیکھنے کے بعد جن میں سلاطین معزول ہو گئے ہیں اور کبھی کبھی

آخر میں مقید رہے ہیں بلکہ گدائی پر مجبور ہو گئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ایک غیر معمولی انسان ہونے کا قصور صرف اس تخیل عظمت کی پیداوار ہوتا ہے جو عوام کے دماغ و دل پر ان کی سلطنت کے دور میں منتزل ہوتی ہے۔ اور اسی کے لئے جب وہ تخیل ختم ہو جاتا ہے تو بالکل معمولی انسان معلوم ہونے لگے ہیں اگر ان کا امتیاز کوئی پیدا شدنی تھی ہوتا تو وہ کبھی سلب نہ ہوتا نہ اس میں انقلاب ہوتا جب پھر ہم تاریخ کا تبصرہ مختلف سلاطین پر دیکھتے ہیں تو ثابت ہوتا ہے کہ ان میں سے اکثر بہت سے اوصاف میں عام انسانوں سے بھی پست تھے۔ چونکہ نورخ کا قلم اکثر اس تخیل سے خالی ہوتا ہے جو رعایا کے دل میں بادشاہ کی نسبت ہوتا ہے اس لئے وہ صاف لکھ دیتا ہے کہ فلاں بادشاہ احمق تھا یا جاہل تھا یا بے رحم تھا یا خود غرض تھا وغیرہ وغیرہ۔

دوسرا سبب جو ایک شخص کے اقتدار کے جواز کا بتایا گیا ہے وہ طاقت و اقتدار ہے اسی کو دوسرے لفظوں میں قہر و غلبہ کہا جاسکتا ہے ہمیں قہر و غلبہ کا ذریعہ حکومت ہونا تسلیم ہے مگر معیار حقیقت ہونا کسی طرح تسلیم نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس سے حکومت قائم ہو جاتی ہے، بالکل ٹھیک، مگر قائم ہونا چاہئے بھی۔ ایسا نہیں ہے بہت سی باتیں ہو جایا کرتی ہیں مگر ان کا ہوجانا صحت و جواز کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر ایک گھر کا دروازہ کھلا نہ گیا اور گھر والے بے خبر سو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہرگز ہے کہ چور آئیں اور سارا مال لے جائیں مگر ان کا یہ مال و اسباب لے جانا جائز بھی ہو یعنی وہ مجرم نہ قرار پائیں۔ ایسا نہیں!

اسی طرح اگر ڈاکو مسلح ہو کر حملہ کریں اور گھر کے رہنے والے یا تو اسلحہ رکھتے نہ ہوں یا تعداد میں کم ہوں تو کوئی شک نہیں کہ وہ ڈاکو جبر و طاقت سے ان کے مکان یا اسباب پر قبضہ کر لیں گے مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ مال و اسباب یا جائداد انہی بلک بھی ہو جائے بلکہ دنیا کا ہر قانون ان ڈاکوؤں کو سزا دینے اور ان سے اس مال کے برآمد کرنے کے لئے تیار ہوگا پھر اگر ایک مکان پر قہر و غلبہ ملکیت قائم نہیں کر سکتا تو ایک

بلک یا قوم پر یہ قہر و غلبہ تسلط کو جائز نہ کر کے قرار دے سکتا ہے پھر اگر طاقت ہی سے کسی فرد نے حکومت قائم کی تو اگر رعایا طاقت حاصل نہ کرے اس کی مخالفت کرے تو اسے کوئی نکتہ جرم سمجھا جاسکتا ہے۔ اب اس کے بعد ایک انسان کے اقتدار اور حکومت کے لئے کوئی دلیل نہیں مل سکتی اسی طرح یہ چند آدمیوں کی حکومت بھی بلاوجہ ہے۔

تیسری قسم یعنی بہت سے آدمیوں کی حکومت۔ اس کے بارے میں سوال یہ ہے کہ یہ بہت سے آدمی تمام قوم کا جوہر و ہیں یا کل قوم ہیں اگر جوہر ہیں تو پھر وہی بات بکثرت طلب ہے کہ ان بہت سے آدمیوں کو مانجی افراد پر حکومت کا حق کیسا ہے اور اگر یہ کل قوم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ خود دیوری قوم حاکم ہے اور خود ہی حکومت لے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مفاد حکومت ختم۔ حکومت کی ضرورت تو اس لئے تھی کہ ان افراد میں جو خود غرض، مطلب پرست اور کوتاہ نظر ہیں کوئی طاقت ایسی ہو جو سب کو صحیح قانون کا پابند بنائے۔ لیکن جب قانون سازی خود اس جماعت کا کام ہو گیا تو یہ اپنے مطلب کے مطابق جیسا، جس وقت چاہے گی ویسا قانون بنائے گی چاہے صحیح ہو چاہے غلط اور اس کے نتیجہ میں مختلف جماعتوں اور مختلف جماعتوں کے مختلف افراد میں رستہ کشی ہوتی رہے گی یعنی ہر ایک چاہے گا کہ اپنے مطلب کی باتوں کو تمام جماعت کے سر منڈھ دے اور اس کو ہر ایسے موقع پر بدل دینے کی کوشش کرے جبکہ اس کے مقصد کو نقصان پہنچتا ہو۔

پھر اگر یہ سمجھا جائے کہ یہ تمام جماعت کسی ایک یا چند افراد کو دستور سازی کے لئے خود مقرر کرے تو جبکہ وہ افراد ان ہی عوام کے منتخب کئے ہوئے ہیں تو ان ہی عوام کی مرضی پر چلنا ضروری ہوگا یعنی انہیں یہ لحاظ نہ ہوگا کہ صحیح و مناسب کیا ہے بلکہ یہ دیکھیں گے کہ عام افراد چاہتے کیا ہیں اور اگر کبھی کبھی انہوں نے رائے عامہ کی مخالفت کی دوسری بار کے انتخاب میں اپنے ہاتھ سے اختیارات لے لئے جائیں گے اور دوسروں کے سپرد کئے جائیں گے۔ پھر ایک بحث یہ بھی ہے کہ رائے عامہ کے معلوم کرنے کا ذریعہ کیا ہے؟

دولت یعنی انتخابی نہیں مگر یہ یاد رہے کہ کونام اپنے شعور سے کام لینے کی صلاحیت نہیں رکھتے وہ بے سوچے سمجھے خواہش کے ہاتھ میں ہو جاتے ہیں اور جو خواہش چاہتے ہیں وہ ان سے کرا لیتے ہیں۔

نتیجہ یہ ہے کہ جیسے سمجھا جاتا ہے اکثریت کا فیصلہ وہ حقیقت میں چند افراد کی رائے ہوتی ہے جسے وہ مختلف صورتوں سے افراد قوم پر مسلط کرتے ہیں اور ان کے احساسات کو بے ہوشی سنگھا دیتے ہیں۔ یہ سمجھا کر کہ یہ آپ کی رائے سے ہو رہا ہے۔

اسی بنا پر یہ سمجھ دیکھتے ہیں کہ جمہوری انتخابات میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ایک وقت میں وہی شخص اکثریت کا قبلہ عقیدت ہوتا ہے اور دوسرے وقت میں وہی شخص ذول و منکوب ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ شخص ایسے خصوصیات و اوصاف کے اعتبار سے بدلتا نہیں ہے مگر کونام کے رجحانات بدلتے ہیں اور اسی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کونام کا رجحان بھی صحت کا ذمہ دار نہیں ہے۔

حقیقت اہم یہ ہے کہ جمہوری نظام سے حاصل شدہ اقتدار ابھی ایک شخص یا چند انتخابی کو ایک طرح کے قہر و غلبہ ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ اول بات ہے کہ کوئی غلبہ فولادی ہتھیاروں سے حاصل کیا جائے اور کوئی غلبہ ایسے ہتھیاروں سے جو بدلع کو متاثر کر دیں کوئی شکستہ ایسا ہو جس سے جسم کے مقید ہونے کا اندیشہ ہو اور کوئی شکستہ ایسا ہو جو آزادی خیالات کو محسوس کر دے نتیجہ دونوں کا ایک ہے اور صحت و حقیقت سے دونوں دور ہیں۔

معادہ عمرانی اور اس پر کجیت ایک نظریہ جسے "معادہ موسوم کیا جاتا ہے کہ تمام قوم کی حکومت تمام قوم پر ہے۔ اس طرح کہ فرد اپنے اختیار سے اپنی ذاتی آزادی اور مطلق العنانی کو قربان کر دے، مفاد اجتماعی کی خاطر اس طرح یہ پابندی اس کے لئے باہ خاطر نہ ہوگی کیونکہ وہ خود اپنے ہاتھ سے کجوشی اپنے ہی اجتماعی مفاد کے لئے اختیار کی گئی ہے۔ مگر

اس میں سوال یہ ہے کہ جس طرح اقتدار میں یہ معاہدہ دل کی خوشی سے ہے اور اسی لئے وہ حق آزادی کے خلاف نہیں، اس طرح کیا بعد میں اس معاہدہ پر باقی رہنا امر اختیاری ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس قانون کی کسی دفعہ کی خلاف ورزی یا مخالفت جرم نہ ہو جبکہ وہ شخص جس نے معاہدہ کیا تھا خود ہی اس معاہدہ کو شکستہ کر دینا چاہتا ہے اور اگر خلاف ورزی جرم ہے اور اس کے بعد معاہدہ پر برقرار رہنا ضروری ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آزادی افراد کی ہمیشہ کے لئے سلب ہو گئی حالانکہ اس نظر کے تحت بنیاد بقائے آزادی پر ہے۔

پھر یہ کہ جب افراد جامعہ خود غرضی اور مطلب پرست ہوں تو انہیں اس کا پابند کیسے کیا جاسکتا ہے کہ وہ قانون کی تشکیل میں اپنے مفاد شخصی کو پیش نظر نہ رکھیں اور صرف مفاد اجتماعی پر نظر ڈالیں۔ اس کی کوئی ضمانت نہیں ہو سکتی۔ اور بقول اس کے جو قانون بنے گلوہ مفاد عمومی کا پورے طور پر نگہبان نہیں ہو سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اب تک دینے جتنی بھی حکومت کی شکلیں کج پر کی گئیں ان میں سے کوئی بھی مستحکم بنیاد پر قائم نہیں ہے۔

اسلامی حکومت اب اس کے بعد یہ سوال آتا ہے کہ پھر یہ بعض اوقات یہ دھوکا ہوتا ہے کہ اسلام کا نظریہ حکومت کیا ہے؟ یہاں نے جو حکومتیں قائم کیں ان کا نظام۔ مگر ایسا نہیں ہے یہ دونوں بالکل الگ چیزیں ہیں۔ مسلمانوں نے جو حکومتیں قائم کیں ان کے متعلق بالکل غلط طور پر یہ شہور ہے کہ وہ جمہوری اصولوں پر تھیں۔

ان تمام حکومتوں میں شخصی فرمانروائی تھی جس کا اصول بھی ایک نہ تھا۔ بلکہ کبھی ایک جگہ میں حاکم کا انتخاب ہوا اور کبھی سابق حاکم نے اپنے بعد والے کو نامزد کر دیا اور کبھی اس نے ایک کمیٹی مشورہ کے لئے بنا دی اور کبھی ابھکر کہ صرف اقتدار قائم کرنا رہ گیا جیسا ہوتا گیا۔ ویسے ہی اصول بننے لگے یعنی اجماع، اختلاف، مشورہ، قہر و غلبہ، اور مختصر طور پر ان چار اصولوں پر

تبصرہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس سے مراد تمام رقبہ مملکت کے افراد کا اتفاق سے یا صرف "اجماع" دارالسلطنت کے کل افراد کا اتفاق یا وہاں کی بھی ایک جماعت کا جو کسی خاص جگہ جمع ہو گئی ہو یا ان میں سے بھی بعض کا جو متفق ہو گئے ہوں؟

اگر کل افراد محدود مملکت مراد ہیں تو ظاہر ہے کہ ان تمام افراد کی رائے کا معلوم ہونا اس زمانہ برق و سحاب میں، زمانہ سیارہ و طیارہ میں بھی ہمیں کلام ہے پر جائیکہ اس زمانہ میں جبکہ یہ وسائل محابرت نہ تھے اس وقت میں یہ بات برسوں میں بھی حاصل ہونا مشکل تھی چہ جائیکہ اس سے کم یعنی ایک دن کا تھوڑا سا لفظ۔

پھر عقلی طور پر وہ کتنے ہی کثیر افراد ہوں ان میں سے سب کے فیصلہ کا دست ہونا بھی اس پر موقوف ہے کہ اس میں کوئی ایک غیر جائز الحظاری یعنی مضموم مانا جائے اور اگر ایسا نہیں ہوا تو جس کل کا ہر جزو غلطی کی آماجگاہ ہو وہ کل غلطی سے بری کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

اور اگر صرف دارالسلطنت کے کل افراد، تو انھیں حق کیا ہے کہ وہ باقی اطراف مملکت کے افراد کی آزادی کو سلب کر کے کسی حکومت کو ان پر مسلط کر دیں اس طرح کہ انھیں جوں جوں کا کوئی حق نہیں۔ اور سب بڑھ کر یہ کہ دارالسلطنت میں سے بھی کچھ لوگ اور وہ بھی اس شدید کمزوری اور اختلاف کے ساتھ ہمیں ہاتھ پائی تک کی نوبت آئے پھر جبکہ یہ اجماع کسی اعلان کے ساتھ بھی نہ ہوا ہو اور اس کے لئے لوگوں کو سوچنے کا بھی موقع بالکل نہ دیا گیا ہو ظاہر ہے کہ ایسا فیصلہ نہ جمہوری سمجھا جاسکتا ہے نہ عقلی طور پر جائز۔

اس کی صحت کے متعلق پیش کی جاتی ہے تو قرآن کی آیت اور پیغمبر کی حدیث یہ ہے کہ وَمَنْ لِيَشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْهُدَىٰ لَنُؤَمِّرَنَّوْنَهُ وَلَنُؤَمِّرَنَّوْنَهُ وَلَنُؤَمِّرَنَّوْنَهُ وَسَاءَ مَا يَصَلُّوْنَ۔ اس میں صرف اتنے فقرہ سے استدلال کیا جاتا ہے کہ

"جو شخص مومنین کے راستے کے خلاف اختیار کرے وہ جہنمی ہے" مگر مومنین پر تو الف لام میم استراق ہے جس کے معنی کل مومنین ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ تو نہیں نکلتا کہ جتنے بھی مومنین جس جگہ جمع ہو کہ کوئی فیصلہ کر لیں وہ صحیح ہو گا پھر یہ پوری آیت کا مضمون ہے بھی نہیں۔ پوری آیت تو یہ کہہ رہی ہے کہ جو شخص رسول سے جھگڑا کرے اور مومنین کے خلاف طریقہ اختیار کرے یہ جہنم میں جائے گا اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رسول سے جھگڑا کرنا خود مومنین کے خلاف ہے اور تقاضائے ایمان کے منافی ہے۔ اس سے تو نتیجہ

اور خلاف نکلتا ہے یعنی یہ کہ بغیر کے مقابلہ میں اُمت کو رائے ذی کا حق نہیں ہے۔ (حدیث) لا تَحْتَمِزُ قَوْمٌ عَلَىٰ فَتْكَ لَآ (یا علیٰ خطیب)۔ یعنی پیغمبر کا ارشاد ہے کہ میری اُمت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی یا غلطی پر متفق نہیں ہو سکتی۔ اگر یہ حدیثیں سند کے اعتبار سے بالکل درست ہوں تب بھی اس میں تمام اُمت کے اجماع کا ذکر ہے۔

چند افراد کا جمع ہونا اس میں ہرگز مذکور نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ اجماع جس معنی سے معیار حکومت قرار دیا گیا ہے اس کی صحت پر کوئی دلیل عقلی یا نقلی نہیں ہے۔

رہ گیا اختلاف، تو ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد ہے اس حکم کے جو اس حق حکومت پر جو دنیا سے جا رہا ہے اور جبکہ اسی کی حکومت کے جواز کا کوئی ثبوت نہیں تو اختلاف کا کیا حق اس سے قائم ہوگا۔ اس کے بعد

وہ ساختہ و پرداختہ اس حاکم کا ہے جو باختلاف معین ہوا

تھا اور جس کا خود حاکم ہونا ایک ایسے حاکم کے تاحر دگی سے تھا جس کی حکومت خود اپنے محل پر ثابت نہیں ہے۔ جو تھی جیسا کہ یہ وہی طاقت حق والا نظر ہے جس کو پہلے غلط ثابت تھا اور جبکہ اس کے بعد یہ بھی شرط بلا ضرورت ہے۔ اس کے بعد یہ کیوں نہیں سمجھا جاتا کہ اس میں تمام غیر اسلامی حکومتیں شری اور جائز حکومتیں

ہیں اس لئے کہ ان میں غلبہ و اقتدار حاصل ہے معلوم ہوتا ہے کہ خود مسلمان بھی
تنہا غلبہ و اقتدار کو درجہ سلطنت نہیں سمجھتے بلکہ اسلام کی شرط لگاتے ہیں
اور یہ ظاہر ہے کہ کھلے ہوئے کافر سے اتنا سفید نقصان نہیں پہنچ سکتا جتنا
دشمنہ ذمیرہ آستین پہناں کئے ہوئے کافر یعنی منافق سے :-

اسلام کا نظریہ حکومت

اب دوبارہ پھر یہ بحث
نظریہ حکومت کیا ہے؟ یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حکومت کے دو کام ہیں
ایک دستور و قانون کی تشکیل، دوسرے طاقت و اقتدار کے ساتھ اس
نظام کا اجراء و نفاذ

اب پہلے قانون کے متعلق گفتگو کی جاتی ہے اگر "اسلام" نام ہو
صرف چھ عقائد کا جو در مانع میں جگہ پالیں اور انہیں غسل سے تعلق نہ ہو یا کم
انکم غسل سے تعلق نہ ہو تا بھی تو صرف انفرادی زندگی میں اسے اجتماعیات سے
بمخت نہ ہوتی تو بے شک یہ ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کو قانون کی تشکیل خود
کرنے کی ضرورت نہ ہو یا کسی دوسرے ملک کے قانون کی وہ پیروی کر لیں لیکن
اسلام تو خود ایک دستور حیات پیش کرتا ہے جس میں صرف عقائد نہیں بلکہ
زندگی کے لئے عملی قواعد و ضوابط ہیں اور وہ بھی صرف انفرادی زندگی سے
متعلق نہیں بلکہ ہماری اجتماعی زندگی سے متعلق ہیں۔ ایک مسلمان اسلام
کو قبول کر لینے کے ساتھ ہی ساتھ یہ معاہدہ کر لیتا ہے کہ میں اپنی انفرادی
اور اجتماعی حیات میں اس ضابطہ و قانون کا پابند ہوں اس کے بعد یہ ممکن
ہی نہیں کہ وہ عملی طور پر مسلم نہ رہتے ہوئے پھر خود قانون سازی کرے یا کسی دوسرے
شخص کے لئے قانون سازی کا قائل ہو یا پوری قوم مجتمع طور پر قانون
سازی کے کام میں شریک ہو یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا جبکہ وہ مسلم ہے
اور اسلام کے ساتھ ہی وہ اپنے کو قانون اسلام کے سپرد کر چکا ہے۔
موجودہ زمانے کے بعض مفکرین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ قانون ساز
کو اس جماعت سے خارج ہونا چاہیے جس کے لئے قانون بن رہا ہے تاکہ وہ

قانون زیادہ سے زیادہ بے لوث اور غیر جانبدار ہو سکے اس لئے زیادہ سبب
طریقہ یہ ہے کہ ایک ملک کے لئے قانون دوسرے ملک کے مدبرین سے بنوایا
جائے مگر یہ تو اس وقت صحیح ہے جبکہ قانون کا دائرہ شمول ہی سے
ملک یا اقلیم کے لئے ہو لیکن اگر قانون ملکوں اور قوموں کی تفریق سے بالاتر
ہو یعنی تمام نوع انسانی کے لئے ہو تو پھر مذکورہ اصول کے مطابق اس کے
سوا کیا صحیح ہو سکتا ہے کہ قانون ساز نوع انسانی کی جماعت سے خارج ایک
بلذات ہو یعنی خالق عالم جس کا علم و قدرت سب کو محیط ہے۔ اور
یہی اسلام کا نظریہ حکومت ہے۔

یہاں قانون ساز بھی اللہ ہے اور حاکم بھی صرف اللہ ہے ایک مسلم اسلام
کے ساتھ ہی اس کی اور صرف اس کی بادشاہت کو مان لیتا ہے جس کے بعد
کسی فرد، کسی مجلس یا کسی قوم کا حکومت کرنا اللہ کے حق کا غصب کرنا ہے
اور اس کے بعد اس سطوی تینوں قسمیں حکومت کی ختم ہو جاتی ہیں جب ایک
حاکم حقیقی موجود ہے اور وہ اللہ ہے تو ایک فرد کی بھی حکومت غلط، چند
 آدمیوں کی بھی حکومت غلط اور بہت سوں کی بھی حکومت غلط۔ اس کا
نتیجہ ہے آزادی کا بل یعنی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہیں رہتا
یا یوں کہو کہ کسی ایسی طاقت کا محکوم نہیں رہتا جس کا دائرہ قدرت کے قیود
سے باہر ہے، رہ گیا خالق، اس کی اطاعت فطری طور پر بہر حال کرنا ہی ہے۔

اگر انفرادی افعال میں خودی نہ کرے گا تو انفرادی اور فطری افعال
میں جبر کرے ہی گا۔ اسی لئے ارشاد ہوا **لَا اِسْلَامَ لِمَنْ فِى السَّمْوَاتِ**
وَالاَرْضِ مِنْ طَوْعًا وَكَرْهًا مگر انسان کا شرف انسانی اس کا مقتضی ہے
کہ وہ اس اطاعت کو اختیار کرے تاکہ اس کی حق شناسی کا ثبوت ملے۔ بیشک
ہو نہ کہ اس کے قانون کے معلوم کرنے کے لئے ہم الفاظ کے محتاج ہیں اور خالق
کی ذات ایسی نہیں کہ وہ ہم تک پہنچ کر ہم سے بات کرے۔ اس لئے ایک واسطہ
کی ضرورت ہے۔ یہ رسول ہے مگر اس کا کام احکام الہی کا پہنچانا ہے۔
نہ اس کا ذاتی کوئی حکم ہے نہ اس کی ذاتی اطاعت ہے بلکہ جو اس کی زبان

پر کرتے ہیں وہ احکام الہی ہیں۔
 وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (اور جو اسکی اطاعت ہے وہ حقیقت میں اللہ کی اطاعت ہے) وَمَنْ يَطِيعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اطاعَ اللّٰهَ اب جبکہ حکومت اللہ کی ہے تو ہر دور میں اپنے نائب مقرر کرنا اسی کا کام ہے اور اس اختیار کو کسی وقت میں بھی اپنے ماتحت میں لینا اللہ کے حق حکومت میں مزاحمت کرنا ہے جو ایک مسلم کے شایان شان نہیں ہے۔
 قرآن مجید نے صاف اعلان کر دیا ہے کہ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّكَالًا مَّؤْمِنَةٌ اِنْ اَقْبَضِيَ اللّٰهُ وَّرَسُوْلًا لِّمَا اَمْرًا اَنْ يَكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِّنْ اَمْرِهِمْ كَسِي مُؤْمِنٌ يَّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَّرَسُوْلٍ كَرِهِيَ اللّٰهُ وَّرَسُوْلٌ كَرِهِيَ اللّٰهُ لِيُؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ مِمَّا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ يَكُوْنَ لَكُمْ اَلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ الَّذِي اَخْرَجَكُمْ مِّنْ اَرْضِ مِصْرَ وَاَنْتُمْ كَافِرُوْنَ
 دوسری جگہ زیادہ واضح کلیہ کی شکل میں اعلان کیا ہے کہ وَرَبُّكَ الَّذِي يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ يَكُوْنَ لَكُمْ اَلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ الَّذِي اَخْرَجَكُمْ مِّنْ اَرْضِ مِصْرَ وَاَنْتُمْ كَافِرُوْنَ
 ہے پیدا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے منتخب کرتا ہے احمقوں کو اختیار کبھی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ سُورَةُ التَّوْبَةِ میں جو قرآن مجید کے بتیغ سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہی ہے یہاں تک کہ اس کی طرف کا خود حکم الٰہی اپنے لئے اس کام میں مددگار بھی خود اپنی طرف سے مقرر نہیں کرتا بلکہ اللہ سے دُعا کرتا ہے (اَسْتَسْقِئُكَ مِّنْ اَمْرِى) اور محمد ورفیقہ یعنی دشمن کے مقابلہ کے لئے ایک سردار بھی جو بتیغ یا رسول نہیں بلکہ "ملک" کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے وہ بھی قوم خود نہ مقرر کر سکی بلکہ نبی سے خواہش کی اَلْعَبْتُ لَكَ مَلِكًا لِّفَاتِحِىْ فِى سَبِيْلِ اللّٰهِ اور نبی نے بھی خود مقرر نہ کیا بلکہ یہ کہا کہ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا، اللہ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے، پھر قوم نے اس کے استحقاق پر اعتراض کیا وہ اعتراض اور قوم کا حق مداخلت بھی قبول نہ کیا گیا۔ بلکہ اس ذیل میں ایک کلیہ کا اعلان کر دیا گیا کہ وَاللّٰهُ يُوْتِى مَلِكًا مِّنْ اَشْيَاِءِ اللّٰهِ اَيُّهُمُ يَشَاءُ لِيُؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ مِمَّا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ
 اللہ اپنے ملک کو جسے چاہتا ہے دیتا ہے اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ اللہ حاکم حقیقی ہے تو اللہ ہی نائب کو مقرر کر سکتا ہے اور یہی نائب النسانی جماعت میں ہمارا اصلی

بھیجا بن سکتا ہے

مسلمانوں نے اس حاکم کے انتخاب کے حق کو اللہ سے سلب نہ کر کے اپنے ذمہ نہ لے کر بڑے الفساق اٹھایا۔ یاں معنی کہ اگر وہ اصول مقرر نہ ہوتا تو پھر نہ وہ کا سوال پیدا ہو کہ امتنا نہ پیدا کرتا۔ دیکھ لیجئے کہ رسول اللہ کو اللہ کی طرف سے مان لیا گیا پھر ایسا نہ نہیں ہوا کہ مسلمانوں میں دو رسول ہو جائے قبلہ کو اللہ کی طرف سے مان لیا پھر یہ نہیں ہوا کہ دو قبلے ہو جائے اور کتاب کو اللہ کی جانب سے مانا پھر یہ نہیں ہوا کہ دو قرآن ہو جائے۔ اختلاف بس اس وقت سے پیدا ہوا جب حاکم کے انتخاب کو اللہ کے بجائے خود اپنے ہاتھ میں لے لیا بس اس کے بعد سے جو مسلمانوں کے شیرازہ میں امتنا پیدا ہوا تو آج تک باقی ہے۔
 پیغمبر کا اعلان و عمل اس بارے میں سند ہے کہ حاکم کے تقرر میں رعایا کا دخل نہیں۔ ایک عرب سردار نے جب اپنے اسلام لانے کی شرط یہ قرار دی کہ اپنے بعد حکومت میں میرا حقہ قرار دے دیجئے تو حضرت نے جواب میں صاف فرمایا کہ اس کا کبھی اختیار نہیں یہ تو اللہ سے متعلق ہے۔ اب جو حضرت نے بیعت کثیرہ میں حضرت علی ابن ابی طالب کے بارے میں اعلان کیا کہ یہ میرا وزیر، وصی اور خلیفہ ہے تو یقینیت مسلمان یہ ماننا لازم ہے کہ یہ حضرت کا اپنے ذاتی رجحان کی بنا پر اعلان نہیں ہے بلکہ اللہ کی طرف سے اعلان ہے اور اس اعلان سے کبھی یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ خود قوم کے اختیار سے متعلق نہیں ہے ورنہ رسول اس کو اپنے ذمہ نہ لیتے۔ اسی بنا پر غدیر کے خطبے میں پیغمبر نے ولایت علی کے اعلان کے قبل پہلے مسلمانوں سے اہول تسلیم کر لیا۔ اس استفہام کے ساتھ کہ اَلَسَمْتُمْ اَوْ لِيْ كُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ قَالُوْا اَجَلٰى كَيْفَا مَلِكًا مِّنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَحْتِيَاجُ اَنْفُسِكُمْ؟ سب نے کہا بے شک آپ زیادہ اختیار رکھتے ہیں۔ اب اس کو تسلیم کرنے کے بعد تو مسلمان کو اپنے خود مختاری کے حق کا حکومت کے بارے میں دعویٰ کبھی صحیح قرار ہی نہیں پاسکتا اور اسی لئے رسول کی زندگی میں عہد کسی دہن سے کبھی نہ کھلتے سنائی

نہیں دیتی کہ حکومت، ہمارا حق ہے۔ یا حاکم مقرر کرنا ہمارا کام ہے ہاں رسول جب دنیا سے اٹھ گئے تو اب اجماع اور شوریٰ اور قہر و غلبہ کا نام سنائی دینے لگا۔ مگر یہ مسلمان کے خود ساختہ اصول ہیں ان کا اسلام سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے۔

نہایت تک حکومت کے یہ اصول جہور مسلمین میں تسلیم کئے جاتے رہے اور عام نظریہ یہی قائم رہا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب ان تین طریقوں میں سے کسی ایک سے حاکم کا تعین ہو جائے تو کسی کو مخالفت کا حق نہیں اور اگر کوئی مخالفت کرے اور حاکم اس کے خلاف تادیبی اقدام جاری کرے تو حاکم کا فعل درست اور جو شخص اس کے خلاف ہو وہ مجرم! اور اگر اس سلسلہ میں قتل ہو جائے تو ظرہا ہی کے ساتھ ہلاک شدہ سمجھا جائے گا! شہید اسے نہیں کہا جاسکتا۔

یہی اب تک عمل رہا تھا جس کے ثبوت تاریخ میں بہت ہیں۔ امیر شام معاویہ نے اپنے فرزند یزید کے لئے نہ صرف ان طریقوں میں سے کوئی ایک بلکہ ان تمام طریقوں کو جمع کر دیا انھوں نے شام اور عراق کے علاوہ مکہ اور مدینہ میں خود جا کر جلسے کئے اور یزید کی بیعت لی اس طرح جتنا بڑا اجماع یزید کی مخالفت پر ہوا ایسا اس کے پہلے کسی خلیفہ پر بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے ساتھ اختلاف بھی تھا اور قہر و غلبہ بھی اس کا نتیجہ صاف ہے کہ کسی شخص کو مخالفت کا حق نہ ہونا چاہئے۔ اور مخالفت کرے تو بادشاہ کو اس کے خلاف ہر کارروائی کا حق ہے اور اگر وہ قتل ہو جائے تو کسی شہیدِ رومی کا مستحق نہیں۔

مگر حسین ابن علیؑ کا یہ کارنامہ تھا آپ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس بادشاہ کے مقابلہ کے لئے اور پھر اپنے ساتھ بے گناہی اور مظلومیت کی طاقت کو ایسا زبردست بنا دیا کہ دنیا حسین کو مظلوم اور یزید کو ظالم ماننے پر مجبور ہوئی۔ حسین اور ان کے ساتھی سب شہید تسلیم کئے گئے اور یزید ہمیشہ کے لئے مردود اور ملعون قرار دیا گیا اس طرح حسین نے اس نظریہ حکومت کا تختہ الٹ دیا جو اسلامی نظریہ کے خلاف مسلمانوں میں غلط طور پر مان لیا گیا تھا۔

مسلمانوں کا نظریہ حکومت مادی اسباب یعنی عوام کے اتفاق برائے انتخاب یا اصول تاج و تخت کا محتاج ہے مگر اسلامی نظریہ حکومت ان اسباب کا محتاج نہیں ہے۔ تمام دنیا انکار کر رہی ہو، مخالفت پر کمر بستہ ہو بلکہ قتل پر تیار ہو گوشت نشینی و کس میرسی ہو، پیوند دار لباس اور فرش تھیر ہو لیکن وہ اسلامی قانون کا سب سے بڑا واقف کار اور سب سے بڑا عمل پیرا اور اس کے محافظ ہونے کا اہل ہے اور اللہ کی طرف سے اس منصب پر مقرر ہوا ہے تو وہ الہی حاکم ہے اور دنیا پر اس کی اطاعت فرض ہے اور جو حکومت الہیہ کے ماننے والے ہیں وہ اسی کو اپنا حاکم تسلیم کرتے رہیں گے یا درکھنا چاہیں کہ حکومت الہیہ کا ایک پیرو کبھی کسی طاقت کا محکوم نہیں ہو سکتا یعنی اگر حالات کی نامساعدت سے وہ کسی دوسرے نظام اقتدار کے شکار ہو جائیں اس پر بھی کوئی عیب نہیں اس پر نظر رکھو گا کہ اللہ کا حکم اس کی نسبت کیا ہے اگر اس نے یہ محسوس کیا کہ ان حالات میں حفاظت جان و مال یا کسی بلند مقصد کے تحفظ کی خاطر حکم الہی یہی ہے کہ ہمیں خاموشی کے ساتھ قانون سلطنت پر عمل کرنا چاہیے تو وہ عمل کرے گا جسے دنیا سمجھے کہ وہ حکومت وقت کے احکام کی اطاعت ہے مگر حقیقت میں اپنے حاکم اصلی اللہ کی اطاعت کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے ہے یہ اور بات ہے کہ اتفاق سے نتیجہ اس کا حاکم وقت کے قانون کی پیروی کے مطابق ہو گیا ہے لیکن اگر وہ اپنے حاکم اللہ کا یہ منشا دیکھ لے گا یا کہ ان حالات میں پیروی جائز نہیں ہے تو وہ جان دینا کو ارہ کرے گا ہر کارروائی کو باوجود قبول کرنے کا مگر جہاد کے لئے کھڑا ہو جائے گا۔

یہ تو حکومت
حکومت الہیہ کے قیام کی دشواری
حقیقت ہے جو ہر انسان کی انفرادی زندگی میں بھی کارفرما ہے لیکن جہانگیر

اس کے ظاہری اقتدار کا تعلق ہے اور وہ افراد صالحہ کے وجود پر موقوف ہے اور اگر صالح افراد اتنی تعداد میں نہ موجود ہوتے تو وہ نائب حکومت موجود نہ ہوگا جسے خصوصیت کے ساتھ بذریعہ غیر نامزد کیا گیا اور پھر بھی دنیا اس کی حکومت کو تسلیم نہ کرے گی اور اسے گستاخین ہو جانا پڑے گا اور یہ سلسلہ ۲۶ برس تک جاری رہے گا جو اس کے بجز یہ کہ لئے کافی ہے کہ افراد صالحہ کا فقدان حکومت الہیہ کے ظاہری طور پر برسر اقتدار آنے میں مانع ہے لہذا اگر اس کے بعد نائب خاص ہماری نگاہ سے اوجھل ہو جائے تو اس کا سبب افراد کی عدم صلاحیت ہی قرار پائے گی یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ جب حکمران غائب ہے تو حکومت کیسے قائم ہو سکتی ہے اگر اس وقت افراد صالحہ پیدا ہو جائیں تو حاکم حقیقی کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ ہمارے نائب کو ہمارے سامنے ظاہر کر دے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے یزید ملعون سے جو حق و باطل کی فیصلہ کن جنگ کی تھی اس کا مقصد یہی تھا کہ آپ صحیح اسلامی نظریات کو جو حقیقت میں معقول ترین نظریات ہیں) دین کے سامنے اتنے واضح انداز میں پیش کر دینا چاہتے تھے کہ پھر قیامت تک تمام سلامت روی سے غرور و فکر کرنے والے ہمیشہ ان نظریات کو اپنا سکیں اور جب کبھی باطل کے دھندلے ان صحیح اسلامی نظریات کو دھندلنے کی کوشش کریں تو حسین مظلوم اور ان کے مقدس ساتھیوں کے خون کی شعاعیں ان نظریات کو روشن ترین حیثیت سے اجاگر کر کے انسانیت کو بے عقلی اور نابلگی کے عذاب سے بچائیں۔

یزید ملعون نظر اسلام کا لبادہ اور ڈھکے اور (طرفہ ستر یہ کہ) خلا رسول اللہ کا ذریعہ بن کر اسلامی اصول و عقائد کو اپنے گھناؤنے کردار سے بھٹلا بھی رہا تھا اور سیدھے سادے مسلمانوں کے لئے نفل زاک ترین قسم کے استنباہات بھی پیدا کر رہا تھا اس نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ اس نے چاہا کہ امام حسین علیہ السلام سے لے کر خود امام معصوم اور نائب برحق

رسول تھے) اپنی سیاہ کاریوں اور بے حیائیوں کی تصدیق کر لے اور حسین بن علی کو اپنی نبیت میں داخل کر کے اسلام حقیقی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موت کے گھاٹ اتار دے لیکن یزید نے سمجھتا تھا وہ عقل سے کام لینا نہیں چاہتا تھا اس نے اسلام کے ذریعہ اصول و عقائد پر کبھی غور کیا تھا۔ اور نہ وہ حسین بن علی کی شخصیت کو ہی سمجھ سکا تھا۔ اس کا جاہلانہ خیال یہ تھا (معاذ اللہ) حسین اس کی طاقت کے آگے سرنگوں ہو جائیں گے لیکن حسین جو تمام دنیا کے انسانیت کے لئے رشد و ہدایات کا ذریعہ تھے اور جو تمام عالم کے لئے علم و عقل کی شاہراہ قائم کرنے والے تھے وہ ایک ایسے موقع کے منتظر تھے کہ جادہ علم و عقل اور شاہراہ دیانت و شرافت کو ایک بار اس شان سے روشن کر دیا جائے کہ پھر کبھی جہالت و ضلالت کے اندھیرے اسے چھپانہ سکیں۔ یزید کو اپنی جہالت پر گھمٹہ تھا لہذا اس نے عقل کے اندھیرے! نبوہ کثیر فخر انسانیت حسین بن علی کے خلاف بھیج دیا لیکن حسین کی نگاہ امامت نے اس وقت کی انسانی دنیا کا منظر کھینچ لیا اور ایسے لوگوں کو اپنی رفاقت کے لئے منتخب کیا جن سے بہتر انسانیت کے نمونے ممکن نہیں تھے یزید اپنی جہالت اور بے وقوفی میں سمجھا کہ اس کی جیت ہوگئی۔ لیکن خود اس کے محل کے در و دیوار سے اس پر لعنتیں برسے لگیں اور ادھر حسین کا خون اور سر مبارک یہودیوں اور نصرانیوں سے بھی اسلام کا کلمہ پڑھا رہا تھا۔

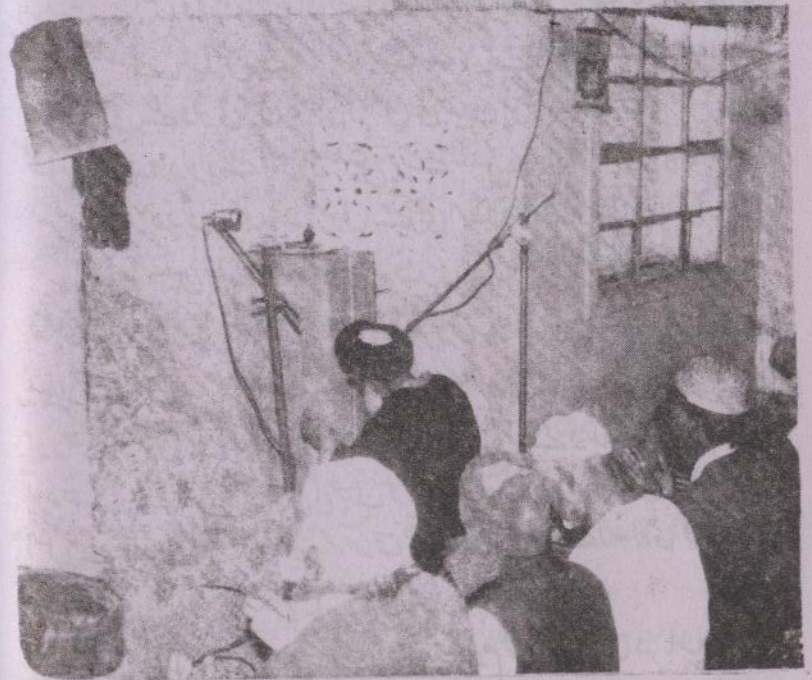
امام حسین علیہ السلام نے نہ صرف یزید کی باطل پرستی اور اسلام دشمنی کو ثابت کر دیا بلکہ اس تمام غلط ماحول کے پردے کو چاک کر دیا جسے یزید جیسے شراب خوار نابکار کو اس بات کا موقع دیا کہ وہ اپنے کو (امیر المؤمنین) اور خلیفہ رسول کے مقدس القاب سے ملقب کر کے دنیا کو اسلام کے نام پر دھوکہ دے رہا تھا۔ حسین کی جنگ درحقیقت یزید کے خلاف نہ تھی بلکہ اس بے قائدگی و بے عنوانی کے خلاف تھی جس کی وجہ سے اسلامی قیادت یزید جیسی گھناؤنی شکل میں نمودار ہو رہی تھی۔

اس مقصد عظیم کے لئے حسین مظلوم کو بڑی بڑی قربانیاں دینی

بیٹریں۔ یہ قربانیاں امام کو ان کے مقصد میں کامیاب بنا گئیں اور حقیقت کے چہرے سے قیامت تک کے لئے باطل کے پردے چاک ہو گئے۔
جناب خواجہ معین الدین حسینی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی امر کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

شاہ بہت حسین بادشاہ بہت حسین حسین
دیں بہت حسین دیں پناہ بہت حسین حسین
سرود، نہ دار، دست در دست یزداد
حقا کہ بنائے لالہ بہت حسین حسین

(بحوالہ "تجلیات فکر" محرم ۱۳۷۰ھ
انجمن سنجیتی آگرہ)



محاربہ کربلا

پہلا باب

جنگ کا آغاز

"گواہ رہنا کہ سب سے پہلا تیر میں نے ہی لگایا ہے،" یہ الفاظ سید سالار لشکر کی زبان پر جاری ہوتے ہوئے تیر رہا کیا جائے اور پھر تمام فوج میں سکون رہے!

یقیناً ہزاروں کمانیں کھٹکیں، ہزاروں چلے کھینچے اور ہزاروں تیر روانہ ہو گئے۔ سپح کہتا ہوں کہ تیروں کا حملہ بہادری کی نشانی نہیں ہے موجودہ زمانہ کی جنگ بوائٹس اسلحہ کی بنیاد پر ہے جس طرح ہزدلانہ حیثیت رکھتی ہے ایسے ہی سابق زمانہ میں تیروں کی بادش، کیا شرم کی بات نہیں، ایک ایسی قبیل تقیاد جو کئی سو تک بھی پہنچی ہوئی ہو، اس پر حملہ ہو، اس بڑی فوج کی طرف سے جو تیس ہزار سے کم ہرگز نہ ہو اور پھر تیروں کے بے پناہ باران سے ابتدا کی جائے۔ میں نہیں سمجھتا کہ حسین بن علی کی قبیل فوج اس اچانک حملہ کے مقابلہ کے لئے کس حد تک آمادہ تھی۔!

مگر نہیں اسمیں آمادگی کی ضرورت نہ تھی۔ اُن کے تے ہوئے سینے تیروں کے استقبال کے لئے موجود تھے اور ان کے دل و جگر شہادت کے اشتیاق میں ناکوں کو ہاتھوں ہاتھ لینے پر تیار!

یزیدی لشکریوں کو اندازہ تھا اور یقینی حیثیت سے اندازہ کہ اگر حسین لشکر سے وہ کتنا ہی تخفہ بھی دست بردست مقابلہ کیا جائے تو بلا کی تاریخ صرف عاشورہ کے دن پر ختم نہیں ہو سکتی۔ وہ خوب جانتے تھے کہ دیر ہو نا ان کے مفقود کسے لئے انتہائی اندیشہ کا باعث ہے۔ انھیں خوب معلوم تھا کہ امام کے خطوط بصرہ بھی گئے ہوئے ہیں اور وہاں سے مدد پہنچنے کی توقع ہے۔ کوفہ کے بھی بہت سے لوگ جو مسلم کے مددگار تھے فضا کے بدل جانے اور حکومت کے ظلم و استبداد قائم ہو جانے کی وجہ سے اگرچہ گوسنوں میں چھپ گئے ہیں مگر موقع کے منتظر ہیں اور نصرت جیسے کے لئے بے چین ہیں یہ بھی خطرہ کچھ دور نہیں تھا کہ ایران نزدیک ہے اور وہاں کے لوگوں کو حضرت امام حسین کے ساتھ عقیدت کا ہونا ممکن ہے خصوصاً جب کہ آپ کے ساتھ زین العابدین بھی موجود ہیں جو نہضیالی رشتہ سے ایرانی ملک کے شاہزادہ ہیں اور اس لئے بہت امکان ہے کہ قومی تصفیت بھی ایرانیوں کو ان کی حمایت پر آمادہ کر دے۔ یہ بھی خیال ہو سکتا تھا کہ نجد کے پہاڑ (اجادہ سلیمی) بہت زیادہ فاصلہ پر نہیں ہیں۔ جہاں کاٹے ایک پر طاقت قبیلہ ہے اور طرح بن عدی امام حسین سے وعدہ کر چکے ہیں کہ اگر آپ وہاں پہنچ جائیں تو آپ کی مدد کے لئے ہزاروں جوان قبیلہ طے کے ابھی ذمہ پوش ہو سکتے ہیں۔

ان ہی اسباب سے جلدی تھی اور بہت جلدی۔ معلوم ہوتا تھا کہ مقابل میں فوج ہے اور بہت بڑی فوج۔ جنگ ہوگی اور مکمل جنگ، تیر اندازی اور ہزاروں تیروں کی بارش۔

ماضی اور پھر تیر سو برس گزشتہ کے ماضی میں واقعات کے سمجھنے اور ان کے ترتیب دینے میں اگر غلطی ہو تو کچھ قابل توجہ نہیں ہے۔ علامہ مجلسی ایسے وسیع النظر ان کو اس مقام پر دھوکا ہوا ہے

اور بہت سخت دھوکہ کہ انھوں نے کھلے ہے۔

فما ساروا بعد هذا الذمیه
قتل اصحاب الحسين وقتل
فی هذه الحمله خمسون
سرجلا -
جب یہ تیروں کی بارش ہوئی تو اصحاب
حضرت سید الشہداء کی تعداد بہت
گھٹ گئی اور اس حملہ میں پچاس
آدمی درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ میں "حملہ اولیٰ" پہلے حملہ کے نام سے ایک شہزادہ کا تذکرہ ہے جس میں اصحاب حضرت امام حسین میں سے پچاس آدمی شہید ہوئے تھے مجلسی یا ان کے پہلے محمد بن ابی طالب کو جن سے مجلسی نے یہ سفیر نقل کیا ہے۔ یہ شبہ ہوا کہ "حملہ اولیٰ" سے مراد وہی تیروں کا حملہ ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ "حملہ اولیٰ" سے مراد وہ حملہ ہے جو ظہر سے ایک گھنٹہ پہلے ہوا تھا جس میں بہت بڑی مخالف فوج نے بہت قریب اگرچہ حسین لشکر کی سخت مخالفت پر حملہ کیا تھا۔ جس کا تذکرہ اس کے بعد آئے گا۔

تیروں کی اس ابتدائی بارش کا کوئی خاص اثر فوج حسین پر سوائے اس کے نہیں ظاہر ہوتا کہ وہ ان کے لئے پیغام جنگ ثابت ہوا۔ امام حجت پرے طور سے تمام کر چکے تھے اور اب یہی ایک حجت باقی تھی کہ ابتداء جنگ کی دشمن کی طرف سے ہو جائے۔ چنانچہ وہ بھی ہو گئی۔ کوئی ہراس نہیں۔ کوئی اضطراب نہیں امام نے اپنے اصحاب سے فرمایا فوجاں حرمکم اللہ اذ الموت الذی کا جدمنہ فان هذا السہام سسل القوم الیکم کفرے ہو جاؤ خدا رحمت نازل کرے تم پر۔ موت کے استقبال کو جو بہر حال ضروری ہے، یہ تیر نہیں ہیں بلکہ قاصد ہیں دشمن کے جو تمھاری طرف روانہ کئے گئے ہیں۔" اصحاب حسین بھی جنگ پر آمادہ ہو گئے۔ اور انھوں نے بھی تیروں کا جواب تیروں کے ساتھ دیا۔

لڑائی تو اب باقاعدہ چھڑ ہی گئی تھی۔ فوج شام میں سے دو غلام ایک لیسار غلام زیاد بن امیہ اور ایک سالم غلام عبید اللہ بن زیاد میدان جنگ میں آئے اور انھوں نے مباد نہ طلب کیا۔ فوج حسینی میں سے حبیب بن مظاہر اور بریر بن خضیر جوش میں بھرے ہوئے آگے بڑھے مگر امام نے ان کو روک دیا۔ عبداللہ بن عمیر کلبی نے اجازت مانگی۔ یہ بہادر اپنی بیوی امّ وہب بنت عبید کے ساتھ کربلا میں آیا ہوا تھا۔ اس نے فکڑے ہو کر اجازت جنگ مانگی۔ حضرت نے سر سے پیر تک اس کا حلیہ دیکھا۔ گندمی رنگ لانا قد۔ مضبوط کلائیوں اور بازو پوڑی پشت اور سینہ، حضرت نے فرمایا بہادر اور جنگ آزما جو ان معلوم ہوتا ہے۔ جا اگر تیرا دل چاہتا ہے کشمیر دل جو ان میدان جنگ میں آیا۔ دو لڑوں نے نام لاسب پوچھا۔ معلوم ہوا، کہا ہم تم کو نہیں پہچانتے۔ ہمارے مقابلہ میں نہ میر بن قیس یا حبیب بن مظاہر یا بریر بن خضیر کو آنا چاہیے۔ عبداللہ کو غصہ آ گیا۔ اور حملہ کیا۔ پہلے ہی وار میں لیسار کا کام تمام کر دیا۔ عبداللہ اس طرف متوجہ ہوئے تھے کہ سالم نے تلوار کا وار کیا۔ تلوار سر پہ آچکی تھی کہ خبر ہوئی، بہادر نے بائیں ہاتھ کو سپر بنا دیا۔ تلوار نے انگلیاں پائیں ہاتھ کی قطع کر دیں۔ عبداللہ نے اتنی دیر میں پلٹ کر ایک ضرب شمشیر میں اس کا خاتمہ کیا اور جوش میں یہ رجز پڑھنا شروع کر دیا۔

ان تنکس و فی فانا ابن کلب
حسبی ببیتی فی علیہ حسبی
رائی امرؤن و صرّ و عصب
ولست بالحواسر عند النکب
رائی زعیملک امّ وہب
بالطعن فیہم مقد ما والفراب

مضرب غلام مؤمن بالرب

اگر مجھ نہ جانتے ہو تو پہچان لو کہ میں کلب کا فرزند ہوں۔ میرے حسب نسب کے لئے اتنا کافی ہے کہ قبیلہ عیلم میں میرا گھرانہ ہے میں ایک سخت مزاج درشت خصلت انسان ہوں اور مصیبت کے وقت کمزوری اختیار کرنے والا نہیں

ہوں۔ اے امّ وہب میں زمداری کرتا ہوں تم سے کہ ان میں بڑھ بڑھ کر نیزہ لگاؤں گا اور تلوار میں ماروں گا۔ اس طرح کی قسم شمر زنی جو خدا پر ایمان رکھنے والے جواں بہت انسان کو کرنا چاہیے۔

معلوم نہیں ان اشعار میں کونسا جوش انگیز اثر تھا کہ امّ وہب فرزندہ عبداللہ بن عمیر کے دل میں طوفانی تلاطم برپا ہو گیا اور ایک عمو دشیمہ ہاتھ میں لے کر میدان میں یہ کہتی ہوئی آگئی۔

فدا ابی و صفا قاتل دون
میرے باپ اور ماں تم پر تار پاک دو
الطبین ذریعۃ محمد
پاکیزہ اولاد رسول کی املا میں کوتاہی
نہ کرو جنگ جاری رکھو۔

عبداللہ بن عمیر کو اس ناگہانی صورت سے انتہائی تکلیف محسوس ہوئی نہ وہب کے پاس آ کر چاہا کہ سر ابروہ حسینی کی طرف واپس پہنچا دیں مگر صورت اپنی چادر عبداللہ کے ہاتھوں سے چھڑنے لگی اور کہنے لگی کہ انی لن ادعک حتی اموت معدک میں تمہیں چھوڑ کے جاؤں گی نہیں جب تک کہ تمہارے ساتھ میں بھی قتل نہ ہوں۔

امام حسین نے جو یہ دیکھا آواز دی۔ "خدا تم دن و رات کو جزا اے خیر دے۔ اے مومنہ واپس چلی آ کر خدا تجھ پر رحمت نازل کرے" غورتوں کی طرف اور ان کے ساتھ گھر میں بیٹھ جا کیونکہ غورتوں کو جہاد کا حکم نہیں ہے۔ امام کے حکم کا اثر لیا اور وہ مومنہ خیمہ اہل حرم میں واپس آئی۔

عمرو بن حجاج نے جو مینہ فوج پر تھا حسینی فوج کے میسرہ پر حملہ کیا جب وہ لوگ قریب پہنچے تو ان بہادروں نے گھٹنے اپنے زمین پر ٹیک دیئے اور نیزے سیدھے تان لئے۔ دشمن کے گھوڑے نیزوں کی باڑھیں دیکھ کر اپنی جگہ ٹھہر گئے اور آگے نہ بڑھ سکے جب وہ لوگ واپس ہونے لگے اور رخ اپنا دوسری طرف

پھیرا تو انھوں نے بیروں کی بارش کر دی۔ اس سے چڑا دی ان میں سے قتل ہوئے اور چند زخمی ہوئے۔

حقیقت یہ ہے کہ کربلا میں سیدالشہداء اور ان کے اصحاب نے فن سپر گری کا وہ اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے جس کی مثال تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اتنی چھوٹی فوج اور اتنی بڑی فوج سے برسر پیکار ہوا اور اس میں اتنا طویل وقت صرف ہو

عزیزین یزید ریاحی نے جو فوج حسینی کی طرف منتقل ہو رہی چکے تھے خدمت امام میں آکر عرض کیا۔

یا ابن رسول اللہ کنت اول خسراج علیک فاذن لی ہا کون اول قتیل بین یدیک واول من یصلح جدک عندا

فرزند رسول میں سب سے پہلے آپ سے لڑنے کو آیا تھا لہذا آپ مجھے اجازت دیجئے کہ سب سے پہلے آپ کے سامنے قتل ہوں اور آپ کے جد بزرگوار سے جا کر سب سے پہلے دست بوسی کروں۔

بہت سے لوگوں نے ان الفاظ سے نتیجہ نکالا ہے کہ شہداء نے کربلا میں سب سے پہلے درجہ شہادت پر فائز ہونے والے "حمر" ہیں۔

سید ابن طاووس نے لہوف میں ان الفاظ کی تاویل کی ہے کہ

اتما اس اول قتیل من الان لان جماعۃ قتلوا قبلہ کا ورنہ

سب سے پہلے قتل ہونے سے یہ مراد تھی کہ اب اس وقت سے وہ سب سے پہلے قتل ہونے والے ہوں کیونکہ ان کے پہلے بہت سے لوگ قتل ہو چکے تھے جیسا کہ روایات میں وارد ہوا ہے۔

لیکن یہ بالکل ظاہر ہے کہ حمر کے مذکورہ بالا الفاظ اس تاویل سے کوئی تعلق

نہیں رکھتے علامہ مجلسی فرماتے ہیں۔

المعنی یکون اول قتیل من الملباسا سرین واکافان جماعۃ کلاز قد قتلوا فی الجملۃ الا اولی۔

معنی ان الفاظ کے یہ ہیں کہ وہ سب سے پہلے قتل ہونے والے ہوں مبارکہ طلبی کی صورت سے لڑنے والوں میں درحقیقت بہت سے لوگ ان کے پہلے قتل ہو چکے تھے پہلے حملہ میں۔

اس میں کھلی ہوئی بات ہے کہ حمر کے الفاظ میں "مبارکین" کی بالکل قید نہیں ہے۔ بلکہ ان کا یہ کہنا کہ "سب سے پہلے آپ کے جد بزرگوار سے جا کر مصافحہ کروں"، صاف بتلاتا ہے کہ اس کے پہلے کوئی شخص شہید نہیں ہوا تھا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ حضرت رسول اکرم کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے یہ شرط نہیں تھی کہ بطور مبارک طلبی شہید ہو بلکہ بزرگ مغلوبہ یا تیروں کے حملہ میں شہید ہونے والے بھی حضرت کی خدمت میں سرفرازی کی مستحق ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ مجلسی کا یہ قول اسی غلط فہمی پر مبنی ہے کہ "حملہ اولی"، جس میں پچاس آدمی شہید ہوئے وہ جنگ کی آغاز والی تیراندازی ہی کا نام ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

حقیقتاً حمر کے الفاظ بالکل حقیقت پر محمول ہیں۔ حمر کی اس اجازت بہاد کے پہلے ہرگز کوئی شخص شہید نہیں ہوا تھا۔ لیکن پھر بھی اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ حمر ہی شہداء کے کربلا میں سب سے پہلے فرد ہیں۔

حمر نے جنگ کی اجازت اسی خیال سے مانگی کہ وہ جائیں گے اور لڑیں گے اور شہید ہوں گے اور اس صورت میں اول شہید قرار پائیں گے۔ اور انھیں اجازت بہاد کی ملی بھی اور انھوں نے حملہ بھی کیا لیکن اس حملہ میں وہ شہید نہیں ہوئے بلکہ صرف ان کا گھوڑا زخمی ہوا اور وہ شہید اس کے بعد چند دوسرے اصحاب کی

شہادت کے بعد بڑے میں جس کا تذکرہ ابھی تھوڑی دیر کے بعد آئے گا۔
حرم کو امام نے اجازت دی اور وہ میدان جنگ میں آئے۔ یہ اشعار
رحز میں پڑھنے لگے۔

انی انا الحرس و ماویٰ الفیف اضرب فی اعزازکم بالسیف
عن خیوی من حمل بارض الخیف اضربکم ولا یری من حیف

میں "حرم" ہوں اور مجھ کو لڑنے کا پناہ دینے والا ہوں۔ تمہاری گردنوں پر تلوار
چلاؤں گا اس امام کی جانب سے جو سر زمین مکہ کا سب سے بہتر رہنے والا ہے میں
تم کو تلواروں لگاؤں گا اور اس کو ذرا بھی ظلم و تعدی نہ سمجھوں گا۔

اس کے بعد حملہ کیا اور شہید زنی متروک کر دی۔ اس کے پہلے اس وقت
بیب حرم لشکر سعد سے جلا ہو کر امام سے جا کر ملے ہیں تو یزیدی فوج کے ایک
سپاہی یزید بن سفیان تمیمی نے کہا تھا کہ میں حرم کو دیکھ لیتا اس وقت جب
وہ لشکر سے نکل کر جا رہا تھا تو ایک نیزہ میں اس کا کام تمام کر تا اب جو حرم
نے حملہ کیا اور چاروں طرف تلواروں میں چلانا متروک کیں لوگ سلسلے سے ہٹ
رہے تھے اور دور دور سے وار کرتے تھے۔ حرم کی زبان پر عنترہ شاعر کا یہ شعر تھا۔

مازلت ارمیہم تبصرۃ سحر و لبانہ حتی ترجل جالہ ام
"میں برابر ان کے اوپر پھینکتا رہا اپنے گھوڑے کی گردن اور اس کے سینہ
کو یہاں تک کہ اس نے سر سے پاؤں تک خون کی چادر اور ڈھولی۔"

حرم کا گھوڑا زخمی ہو گیا اور اس کے سر و چہرہ پر تلواروں پڑی تھیں۔ خون بہہ
رہا تھا اس وقت حصین بن تمیم شہزاد یزیدی افسر نے یزید بن سفیان سے
کہا کہ دیکھو حرم یہی ہے تو جس کو قتل کرنے کی تم کو آرزو تھی!۔

یہ سن کر یزید کو جوش آگیا۔ نکلا اور حرم کو آواز دی کہ کیا تجھ سے لڑنا منظور ہے؟
پہلے نے کہا ہاں ضرور یہ کہہ کر سامنے آگئے۔ خود حصین کا قول بیان کیا گیا ہے کہ
بس یہ معلوم ہوا۔ جیسے یزید کی جان حرم کے قبضہ میں ہی تھی۔ ادھر سامنے پہنچنا

اور بس قتل ہو گیا۔

اس منظر کی سبب تھی کہ دشمن کا پرانہ ہو گیا اور پھر حرم کے مقابلہ
کو کوئی نہیں نکلا۔ حرم اپنے گھوڑے کو بوزخنی بوجھا کھا موزہ کر اپنے ہرگز
کی جانب واپس آگئے۔

نافع بن ہلال نے آگے بڑھ کر لڑائی کا آغاز کیا اور وہ یہ کہہ رہے تھے
کہ انا الجمالی انا علیٰ دین علی۔

"میں قبیلہ بنی جمیل میں سے ہوں میں علیؑ کے دین پر ہوں۔" ان کے
مقابلہ میں ایک شخص آیا جس کا نام تھا مزاحم بن حمیرت۔ نافع نے حملہ کیا اور اسے
قتل کر دیا۔

ان سپہم نقصانات سے جو فوج مخالف کو برابر ہوئے تھے۔ سردار ان
فوج پر لیشان ہو گئے۔ عمر بن الحجاج جو اس کے پہلے بھی ایک حملہ کر چکا تھا
اور ناکام واپس گیا تھا۔ اس نے ذرا زور سے فوج کو لگا کر اور بلند آواز سے
کہا۔

یا حقی اقدارون من لقادون اے یہ قوفو! یہ تم جانتے ہو کس سے جنگ
فرسان المصقر ما مسامین کہ رہے ہو۔ یہ ملک کے خالص شہسوار
لا یبرزن لہم احد منکم لوگ ہیں۔ یہ جانوں پر کھانے ہوئے
ذاتہم قلیل وقل ما یبقون لوگ ہیں تم میں سے کوئی شخص انفرادی طور
واللہ لو لم تر مومہم الا بالحقارۃ پر ان سے جنگ کے لئے نہ نکلے گا انکی
نقل مومہ۔

(طبری ج ۶ ص ۲۱۹)

تقدار کم ہے یہ بہت تھوڑی دیر زندہ
رہ سکتے ہیں اگر تم سب مل کر فقط پتھر
ہی ان کے اوپر برساتے تب بھی ان کو

قتل کر سکتے ہو۔

یہ مشورہ عمر سعد کو بھی پسند آیا اور تمام فوج کو فرمان پہنچا دیا گیا کہ کوئی شخص مبارزہ طلبی کے لئے میدان میں نہ نکلے۔ بے شک عمر بن حجاج نے آگے بڑھ کر فوج میں جوش پیدا کرنے کے واسطے تقریر کی اور کہا۔

یا اهل الکفر فته المن مو اطاعتکم لے اہل کفر اطاعت اور وفاداری

ولا ترقا بواقی قتل من سرق کے پابند ہو اور اپنی جماعت سے الگ نہ ہو اور ذرا بھی شک و شبہ نہ کرو ان لوگوں کے قتل کے بارے میں جو دین سے نکل گئے ہیں اور امام

وقت (بزید) کے مخالف ہیں۔

امام حسین نے یہ گمراہ کن الفاظ سن کر جو ابی تقریر یہ ضرور کی سمجھی اور ارشاد کیا۔

یا عمر بن الحجاج اعلیٰ حق من الناس
اخن من قنا وانت تم بتم علیہ
اما والله لتعلمن لو قد قبضت
اسوا حکم و متم علی الاما لکم
اینا صرتمن الدین ومن هو اوطی
لبصلی الناس۔

لے عمر بن الحجاج تو لوگوں کو میرے
خلافت آمادہ کر رہے۔ کیا ہم دین
سے نکل گئے ہیں اور تم دین پر قائم
ہو۔ قسم خدا کی سنقریب معلوم ہوگا۔
اس وقت جبکہ تمھاری جانیں ان
جسموں سے جدا ہوں اور تم اپنے اعمال
کے اوپر دنیا سے جاؤ۔ اس وقت
معلوم ہوگا کہ کون دین سے نکلا تھا
اور کون آتش جہنم میں جلنے کا مستحق
تھا۔

عمر بن الحجاج نے اپنی فوج کو آمادہ کر لیا تھا اور اب کی پورے جوش و خروش

سے عمر سعد کی فوج کے میمنہ کے ساتھ فرات کی جانب سے فوج امام حسین پر
حملہ کیا اس حملہ میں مسلم بن عوسجرا امام کی فوج میں سب سے پہلے شخص زخمی
ہو کر زمین پر گرے چھوٹی فوج کے چھوٹے سے میسرہ نے ایسی یا مردی سے مقابلہ
کیا کہ دشمن کو واپس جانا پڑا مگر غبار کا دامن چوچاک ہوا ابن عوسجرا سے خاک خون
میں آغستہ نظر آئے۔ امام حسین مسلم کے سر ہانے لگے۔ دیکھا ایک رقیق حیات
باقی ہے۔ حضرت نے مسلم کے لئے دعائے خیر کی اور اس آیت کی تلاوت فرمائی کہ
منہج من قضی الخجہ ومنہج من ینتظر وماجد لو اتب دیلا۔
"کچھ جانے والے گزر گئے اور کچھ وقت کے منتظر ہیں اور کسی نے
اپنی بات میں تبدیلی نہیں کی۔"

"حبیب بن مظاہر جو امام کے ساتھ ساتھ تھے وہ مسلم کے قریب گئے کہا
تمھارے قتل ہونے کا بڑا اصد یہ ہے مگر تمھیں جنت کی مبارکباد دیتا ہوں۔
مسلم نے کمر و آواز سے کہا "تمھیں بھی ہر طرح کی فیروہ برکت کی مبارکباد
قبول ہو۔"

اس کا نام ہے استقلال، اس کا نام ہے ثبات قدم، اس کا نام ہے اصول
پہر جان دینا، اور اصول کو آخر وقت تک مد نظر رکھنا۔

حبیب نے کہا "اگر مجھے یقین نہ ہوتا کہ میں بھی سنقریب تمھارے ہی پیچھے
پیچھے آتا ہوں تو میں کہتا کہ کچھ وصیت کرو۔ اور میں اس وصیت کو
پورا کروں۔" مسلم نے کہا "وصیت کچھ بھی نہیں، وصیت جو کچھ ہے وہ
اسی ذات کے متعلق (اشارہ کیا حسین کی طرف) کہ تم بھی ان ہی کے سامنے
اپنی جان نثار کرنا۔" حبیب نے کہا۔ "ضرور خدا کی قسم ایسا ہی ہوگا۔"

کیا دنیا کی تاریخ ایسی مثالیں پیش کر سکتی ہے۔ ہر گز نہیں۔!
عمر سعد کی بدحواس فوج اس خنقرہ سی جماعت کے مقابلہ سے بے تحاشا
بھاگی تھی اسے خبر بھی نہیں تھی کہ کون قتل ہوا لیکن مسلم بن عوسجرا کے اہل عیال

ان کے ساتھ تھے ان کے خیمہ میں جو ان کے قتل کی خبر پہنچی تو ایک کینز نے چرخ مار کر کہا یا ابن عوسجہ تارہ یا سیدنا ۱۸۰۔ "ہا کے ابن عوسجہ ہائے میرے ماتم یہ سننا تھا کہ عمر بن العجاج کی فوج والوں نے خوشی کا ستورہ بلند کیا کہ ہم نے مسلم بن عوسجہ کو قتل کر دیا۔

شہرت بن لہجی نے جو خود فوج عمر سعد میں تھا اپنے گرد و پیش والوں سے کہا کہ "غلام لاگوں کو غارت کرے، تم اپنے ہاتھ سے اپنی مٹی خراب کر رہے ہو، ہم اس بات پر خوش ہوتے ہو کہ مسلم بن عوسجہ ایسے شخص کو قتل کر دیا۔ قسم اسی خدا کی جس کا میں اسلام لکھتا ہوں کہ میں نے کتنی ہی مرتبہ ان ہی مسلم کو اسلامی جہاد کے موقعوں پر کار نمایاں کرتے دیکھا۔ ایک آذربائیجان ہی کا جہاد تھا جس میں چھ مشرکوں کو قتل کیا۔ کیا ایسا شخص تمہارے ہاتھ سے مارا جائے اور تم خوشیاں کر دو؟

یہ سچائی کا مخصوص جوہر ہے کہ وہ دشمن کی زبان سے بھی ظاہر ہو جائے مسلم بن عوسجہ کے قتل کرنے والے دو شخص تبتلئے جاتے ہیں مسلم بن عبداللہ حنیفا بنی اور عبداللہ بن ابی خشک کا رہنما۔

میمزہ والے حملہ کی اس کامیابی نے جو قتل مسلم کی صورت میں ظاہر ہوئی تھی فوج کا دل بڑھا دیا تھا اس لئے اب کی ٹمر بن ذی الجوشن نے میسرہ فوج کو لے کر حملہ کیا۔ اس طرف بھی اصحاب امام حسین نے بڑی پامردی سے مقابلہ کیا عبداللہ بن عمیر نے جو اس کے قبل ایک حملہ کر کے اپنی شجاعت دکھلا چکے تھے اس جنگ میں نمایاں حصہ لیا۔ اور دو آدمی اور قتل کئے۔ جس کے بعد ہانی بن ثابت حضرمی اور بکیر بن حی تیمی کے ہاتھ سے شہید ہوئے اس طرح کی تصریح ہے۔ کان القیتل الثانی من اصحاب الحسینؑ یہ اصحاب امام حسینؑ میں سے دوسرے بزرگ تھے جو شہید ہوئے۔

ان کی زوجہ ام وہب جو پہلے ہی سے یحییٰ بن عوسجہ کو ایک مرتبہ میدان جنگ

میں نکل چکی تھی اب اپنے شوہر کے قتل ہونے کے بعد پھر بے تحاشا میدان میں آگئی اور شوہر کے سر پر ہٹے ہٹھکے خاک و خون سے سزیاں کرنے لگی اور کہہ رہی تھی کہ "ھینا اللہ الجنۃ" بہشت کی مبارکباد قبول کر دو۔ شمر بن ذی الجوشن نے اپنے غلام رستم کو اشارہ کیا کہ گمراہ اس کے سر پر وار دے اسے گمراہ لگایا اور وہ با وفا عورت اسی جگہ شوہر کے سر پر ہٹے ہی تمام ہو گئی۔

یہ واقعہ اگر بلکہ کے سلسلہ کی وہ ستر مناک وادراتیں ہیں جن پر تاریخ ہمیشہ بخالت سے سر بٹھکایا کرے گی۔ اور انسانیت کی پیشانی عرق انفعال سے تر ہوگی۔ حسین بن علی کی فوج والے بہادر سپاہی جن میں سوار صرف ۳۲ تھے بڑی ہرجرسی سے دشمن کی فوج میں ڈوب ڈوب کر لڑ رہے تھے اور جس طرف رخ کرتے تھے اہل کوفہ کا فوج مارتا ہوا فوج کا سمندر اس طرح بچھے ہٹ جاتا تھا۔ جیسے بڑھتے ہوئے دریا میں جزیر کے وقت کمی پیدا ہو لیکن ان حملوں میں اصحاب سیدالشہداء میں سے بھی بعض افراد ہر کام آ رہے تھے جن میں سے حسب ذیل اشخاص کے نام اب بھی محفوظ ہیں۔ (۱) یحییٰ بن سہم مولیٰ طسن بعض روایتوں میں ہے کہ امام حسینؑ کے غلام تھے۔ حذقیہ وروہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ انھیں حسان بن خنظلی نے اوائل جنگ میں قتل کیا۔

(۲) عمر بن خالد سردی حسیدی (۳) سعد مولیٰ عمر بن خالد (۴) جمع بن عبداللہ عازدی (۵) عازد بن جمع بن عبداللہ (۶) جناد بن حادث سلائی۔

یہ پانچواں آدمی ایک ہی ساتھ نصرت امام حسینؑ کے لئے آئے تھے اور بونگ چھڑنے کے بعد ایک ہی ساتھ فوج دشمن پر حملہ آور ہوئے اور زور شور سے حملہ کیا تاکہ میں گھسی کہ شمر شہ زنی کرنے لگے۔ فوج کوفہ نے ان لوگوں کو چادروں طرف سے گھیر لیا اور لٹکے نام سے بالکل الگ کر دیا۔ یہ دیکھ کر امام نے اپنے بھائی جناب عباسؑ کو ان کی اہلاد کے لئے بھیجا آپ نے جا کر تن تنہا فوج پر حملہ کیا اور تلوار چیلانا شروع کی یہاں تک کہ فوج کو منتشر کر دیا۔ اور ان زخمی بہادروں کو

(۱۷) ان بہادروں کا جوش جنگ اور دلدادہ شہادت جس سے بروقت امداد پہنچنے کے باوجود انہوں نے پھر نجات کے موقع کو ہاتھ سے دے دیا اور آخر لڑ بھڑ کر درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔
 ایسی ہی چیزیں وہ ہیں جنہوں نے کربلا کے واقعہ کو دنیا کی تاریخ میں وہ اہم ندرت اور خصوصیت عطا کر دی ہے جو کسی اور واقعہ کو حاصل نہیں ہے۔
 ان لوگوں کی شہادت کے متعلق علامہ شیخ محمد سماوی نے اپنی کتاب (ابصار العین فی انصار الحین) میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ :-
 ذالذی قبل الحمدۃ الاولیٰ فی اول القتال "یہ پہلے حملہ کے قبل ابتداء جنگ کا واقعہ ہے"۔

جناب بن حجر کندی ان کی بھی شہادت جنگ کے ابتدائی اوقات ہی میں ہوئی ہے۔ حدائق درودہ کے مصنف نے لکھا ہے کہ ان کے بیٹے حجر بن جندب بھی ان ہی کے ساتھ قتل ہوئے لیکن یہ امر پایہ ثبوت کو نہیں پہنچا ہے۔ ان زیادتیوں میں بھی جو امام نصر عجل اللہ فرجہ سے وارد ہیں۔ اور اصحاب سیلہ شہدا کے تذکرہ ہر مشتمل ہیں ان کا تذکرہ نہیں ہے۔

دوسرا باب

سب سے پہلا سخت حملہ اور معرکہ جنگ کی شدت

واقعی تاریخ کا ایک یادگار اور حیرت انگیز سانحہ ہے کہ تیس ہزار فوج کے سامنے ۷۲ بھوکے اور پیاسے ہوں اور فوج کثیر اسلحدہ قلیل سے

دشمنوں کے حلقہ سے نکال کر اپنی فوج کی طرف واپس لے چلے ابھی راستہ پورا طے نہیں ہوا تھا کہ دشمن کی فوج پیچھے تعاقب کے لئے نظر آئی اور وہ قریب پہنچ گئی حضرت عباسؓ ان لوگوں کو اپنے آگے آگے لئے خود بطور حفاظت پیچھے پیچھے چلے تاکہ ان کو کوئی گزند پہنچنے نہ پائے مگر دشمن کی فوج کے قریب آتے ہی زنجی بہادروں کے جوش کی انتہا نہ رہی اور وہ حضرت عباسؓ کی حفاظت سے نکل کر دشمنوں پر گھسیٹ پڑے اور باوجودیکہ دشمنوں سے بالکل بے حال تھے لیکن جان تو دشمن شیر زنی کی اور آخر ایک ہی جگہ پر گرے اور شہید ہو گئے۔
 جناب عباسؓ مجبوراً امام کی خدمت میں واپس آئے اور واقعہ کی اطلاع دی امام نے چند بار ان بہادروں کے لئے دعا سے رحمت کی۔

اس واقعہ میں چند خاص قابل توجہ امور ہیں۔

(الف) امام کا بحیثیت ایک سپہ سالار فوج کے اس درجہ اپنے سپاہیوں کا قدر شناس ہونا کہ جب وہ دشمنوں میں گھر گئے تو آپ نے کسی اور کو نہیں اپنے عزیز ترین بھائی اور علمدار شکر حضرت عباسؓ کو ان کی امداد کے لئے بھیجا۔
 (ب) امام کا انتہائی بھروسہ اپنے بھائی جناب عباسؓ کی شجاعت و فوج پر کہ پانچ بہادروں کی امداد کے لئے جو دشمن میں گھرے ہوئے تھے ایک عباسؓ کو بھیجا گیا اور کوئی اندیشہ نہیں کیا۔

(ج) حضرت عباسؓ کی مخصوص شجاعت اور فن جنگ میں مہارت جس کی بنا پر آپ نے جوش غضب میں بھرے ہوئے اور اپنے قبضہ میں آئے ہوئے شرکار پر اپنی فتح مندی کے دلوے رکھنے والی کثیر التعداد فوج پر تنہا حملہ کیا اور حلقہ دشمن میں گھرے ہوئے بہادروں سے دشمنوں کو ہٹا دیا اور پھر ان میں کامیابی حاصل کی اور بہادروں کو ان کے ہاتھوں سے چھڑا لیا۔ اور پھر ہی حیثیت سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ آپ کو اس حملہ میں کوئی بھی گزند پہنچا ہوا اور زخم لگا ہوا۔

سے نقصان پر نقصان اٹھائے اور شکست برداشت کرے اور اس کے بنائے کچھ نہ بنے۔ صبح سے دوپہر کے قریب کا وقت آ جائے اور حسینی فوج کی صف مثل ایک مضبوط و محکم آہنی دیوار کے سامنے موجود ہے۔ اس کے برخلاف فوج مخالف میں اضطراب ہو۔ ان کے نظم و نسق اور بندوبست میں بے بسی ہو اور وہ طریقہ جنگ میں کسی ایک صورت پر بہ قرار نہ رہ سکیں۔

طبری کا بیان ہے -

قاتلہم اصحاب الحسین قتالا شدیدواخذت خیالہم تھمت انماہم اثناون قتلون فاساواخذت لاجل علی جانب من اهل الکوفة الاکتشفہ فلما رای ذالک عمر رة بن قیس وهو علی اخیل اهل الکوفة ان خیلہ تنکشف من کل جانب بعث الی عمر بن سعد عبد الرحمن بن حصن، فقال اما تری ما تلتی خیلی منذ الیوم من ہذا العدة الیسیرة البعث الیہم الرجال الذمات۔ میری فوج کی کیا حالت ہے، اب آپ پیادوں کی فوج اور تیراندازوں کو بھیجے کہ وہ مقابلہ کریں؛

مترجم ہے اور بہت سخت مترجم شکست کا اعلان اور بہت کھلا ہوا اعلان، شکست اور کسی مترجم شکست، سواروں کا افسر بہت بار چکا اب پیادوں کی بارہا آئی۔ شہت بن لہجی پیادہ فوج کا افسر تھا۔

سید سالار اعظم عمر سعد کا پیغام پہنچا کہ تم آگے کیوں نہیں بڑھتے۔ دل پر چھایا ہوا وہ سب سمجھے یا فوج حسینی کی دعایت نیک دل حسن ظن نہ کھتے وائے رادین کا یہ بیان ہے کہ شہت بن لہجی کو حسین بن علی سے لڑنا اپنے ہمنام کے لحاظ سے بہت ناگوار تھا اس لئے اس نے جان بچانی مگر حقیقت حال کچھ اور کہتی ہے ہر حال اس نے صاف جواب دیا مگر اپنی شان خود داری کو محفوظ رکھنے کے پردہ میں کہا اور کتنے حقارت آمیز الفاظ میں کہا کہ افسوس ہے ایسی مہم کے سر کرنے کو اتنی فوج ناکافی سمجھی جائے اور مجھے بڑا ایک بڑا سردار ہوں نہ حمت دی جائے اور پھر تیراندازوں کی بھی ضرورت ہو؟ کیا میرے سوا کوئی اور اس مہم کے لئے نہیں ملتا۔ عمر سعد نے تجوہ ہو کہ حصین بن ہشیم۔ وہ ہی حصین جو قادیسیہ کی فوج کا افسر تھا وہی جس کے متعلق ہم نے متعدد بار اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ لوگ غلطی سے حصین بن ہشیم کہتے ہیں۔ اور یہ ہرگز صحیح نہیں ہے۔ اسی افسر کو اسی فوج کے ساتھ جو قادیسیہ کی سرحد میں تھی اور اس کے ساتھ پانچ سو تیراندازوں کو مامور کیا کہ وہ بڑھیں اور حسین بن علی کی فوج کے قریب جا کر یا اس سے تیروں کا مینہ برسا دیں۔

بن جنگ کے واقف کا اس امر سے واقف ہیں کہ تیروں کی زد کے لئے خاص درجہ کی مسافت ضروری ہے۔ دور کی تیراندازی جو مقررہ فاصلہ سے زیادہ پر ہو ہوائی قیروں کی حیثیت رکھتی ہے جس سے گزند نہ پہنچنا بہت آسان ہے لیکن قریب کی مسافت سے تیروں کا ہنگامہ خیر طوفان ایک بے پناہ حملہ ہے جس سے محفوظ رہنے کے لئے نہ فنون جنگ کام دے سکتے ہیں نہ شجاعت و بہادری کے حوصلے میں کہہ چکا ہوں کہ ہزدلانہ طریقہ جنگ ہے اور شجاعت کے نام کے لئے ننگ!

یہ ظاہر ہے کہ اصل لشکر گاہ دونوں جماعتوں کے ایک دوسرے سے کافی

فاصلہ یہ ہوتے ہیں۔ اور اسی صورت سے کہ بلا میں کبھی تھے۔ دونوں فوجوں کی صف آرائی ایسی ایسی جگہوں پر ہوتی ہے جن کے درمیان بہت بڑا میدان معرکہ جنگ اور میدان کا نہ زاد کی صورت میں موجود ہوتا ہے اور وہ کچھ کم مسافت نہیں ہوتی۔

پہلی مرتبہ کے تیروں کی بارش کا نشان یہ تھا کہ مگر سعد نے اپنے لشکر ہی سے جس کی صف آرائی کھلی تھی تیر چلا یا اور اس کے ساتھ فوج کے دوسرے لوگوں نے بھی تیر ہاٹے مگر ان تیروں کا اثر فوج حسینی پر کچھ نہیں پڑا اور نہ بڑا ناچا پئے تھا۔ سوائے اس کے کہ اعلان سحر ہو جائے اور کھلی طور سے آغاز جنگ۔ مگر اب جو تیر اندازی ہو رہی ہے اس کی نوعیت مختلف ہے یہ تیروں کا حملہ ہے پورے طور سے زد پڑا کہ کیا جا رہا ہے۔

تیر کا بچاؤ ڈھال نہیں ہے۔ تیر کا جواب نیزہ و شمشیر کوئی بھی نہیں۔ تیر کا بچاؤ خالی دینا ہو سکتا ہے مگر یہ تو دیکھنا چاہیے کہ یہ بچاؤ اس وقت کا لگے ہو سکتا ہے جب اتنی دھڑل میں کہ جس میں ایک انسان کھڑا ہو سکتا ہے یا ادھر ادھر ہو سکتا ہے کوئی بھی جگہ تیر کی زد سے خالی ہو لیکن عالم تصور میں اس منظر کو پیش کرنا کہ صرف ۲ آدمیوں کی صف ایستادہ ہے۔ اس کے کھڑے ہونے کے لئے کس قدر مسافت کی ضرورت ہے۔؟ اس کے سامنے پانچ سو یا ایک ہزار کی جماعت آتی ہے تو وہ اس پہلی جماعت سے کتنی زیادہ دور تک کتنی زیادہ مسافت تک ایستادہ ہوگی پھر ایک بڑے لشکر کی طرف سے ایک مرتبہ مجموعی طور پر ایک ہمت اور ہم آہنگ ہو کر ایک نشانہ پر ایک ہی مقصد پر یعنی اس پہلی جماعت کی صف کو پیش نظر رکھ کر بہت دور سے نہیں بلکہ اتنی دور سے جو ان کی زد میں لانے کے لئے ضروری ہو وقت واحد تیر چلیں تو کیا یہ ایک عظیم سیلاب کا بہاؤ ایک بڑے طوفان کا تغیر پیرا۔ ایک بڑے آندھی کا جھکڑ۔ لڑنے کی ایک بڑی چادر نہ ہوگی جو تیروں کی صورت میں چپ درلاست ہر طرف سے اس مختصر جماعت

کو ڈھانپ لے گی اور ان کے جسم کے کسی حصے اور داہنے بائیں کے کسی گوشے میں کبھی ایسا نقطہ نہیں ہو سکتا جو ان تیروں کی زد سے خالی ہو اور اس مختصر جماعت کے لئے امن و پناہ کا ذریعہ ہو۔

دوہرے انصاری سید الشہداء ۶۔ اس عظیم الشان تیروں کے سیلاب کا جواب ان کی طرف سے صرف یہی تھا کہ انھوں نے تلوار میں موت لیں۔ تیروں کے آتے ہوئے طوفان کا اپنے سینوں سے مقابلہ کرتے اور اس کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو دہلیتے ہوئے جا پڑے اور دشمن کی فوج کے اندر گھس گئے اور شمشیر زنی کرنے لگے۔

یہی وہ عظیم الشان حملہ اور محسوس کی جنگ ہے جو تار یخوں میں "حملہ اولیٰ" کے نام سے مشہور ہے اور مذکور ہے۔ اور یہ جنگ ظہر کے ایک گھنٹہ قبل ہوئی تھی۔

کیا کہنا اس قیامت خیز بہادری کا جس نے آخر میں پھر دشمن کو شکست دی اور فوج کو سپا کیا مگر نتیجہ اس حملہ کا فوج حسینی کے لئے بہت درد انگیز ضرور تھا۔ جس وقت میدان عساف ہوا اور کہ دو غبار دور ہو تو معلوم ہوا کہ مختصر تعداد بہت مختصر ہو گئی ہے۔ یہ کس آدمی انصاری سید الشہداء میں سے درجہ شہادت پر فائز ہو گئے ہیں جن میں سے بعض تیروں کے نشانہ تھے اور بعض جنگ منلو بہ میں لڑ بھر کر شہید ہوئے یہ سب وہ ہیں جن کی نسبت تاریخ میں یہ ملتا ہے قتلا فی الجملۃ اکاویف۔ یہ پہلے حملہ میں شہید ہوئے۔ اس کے علاوہ جتنے گھوڑے اصحاب سید الشہداء کی سواری میں تھے سب کے سب بے ہو گئے اور اصحاب جو سوار تھے وہ بھی اب پیادہ ہو گئے۔ جن میں میں زیادہ ریاکی جن کا گھوڑا نہ تھی اس کے پہلے ہو چکا تھا وہ بھی اس موقع پر بالکل پیادہ ہو گئے جس کا تذکرہ ان کے دشمن ابوب بن مشر ح حیوانی نے اس طرح کیا ہے کہ :-

اخاد الله عقرت بالحربين يزيد
فارسه حشاشته سمها فها
لبث ان اس صد الفرس وافطرح
ركبا فرتب عنه الحركا فله ليد
والسيف في يده وهو يقول
ان تعصوا في فان ابن الحرس
انصح من ذي ليد هن بدر
قال فما رايت احد الفيرحي
فسعيد.

میں وہ تھا جس نے عمر بن یزید کے
گھوڑے کو لیے کیا۔ بس ایک تیرا
لگا کہ فرس تھا کہ نہ میں پر آیا اور نہ
بجھلانگ مارا کہ اس کی پشت سے
زمین پر آئے معلوم ہوتا تھا کہ ایک
شیر ہے اور تلوار ہاتھ میں لئے تھے۔
یہ شعر بڑھ رہے تھے۔ اگر تم نے میرا
گھوڑا پے کر ڈالا تو کوئی حرج نہیں
میں ایک شریف انسان کا فرزند ہوں
اور فرس سے زیادہ شجاعت کا مالک ہوں
(سادہ کا بیان ہے کہ) میں نے کوئی
اس طرح کا شمشیر نہ دیکھا۔

والله واقعه كره بلاه كع بعض نكاح عقل اناني كوجيران كرتي ميں حيين
بن علي اور ان کے اصحاب کا اھول جنگ، فن سپہ گری وہ ایک کار نامہ ہے
جس کے رموز و امرات تک عقل پہنچی نہیں۔
کہ بلا میں حسیح فوج کی صف بندی کس طرح ہوئی تھی۔ نظم فوج کیونکر دست
کیا گیا تھا اور ترتیب کیا تھی۔

اگر اس طرح کی خونریزی لڑائیاں اس صورت کی عظیم شان تیرا ندری، ایسا
ہنگامہ خیر حملہ، کھسان کی لڑائی اور جنگ مفلوب، مگر حیرت، انتہائی حیرت سخت
حیرت ہے کہ اصحاب و انصار نے کس طرح کا انتظام کیا تھا کہ پچاس صحابی متام
ہو گئے۔ گھوڑے سب کے سب پے ہو گئے۔ میدان خون شہداء سے لانا نہ بن گیا

اور شمع امامت کے پر وائے آتش ظلم کی نذر ہو گئے۔ مگر یہ کیا، کوئی ایک تیر، ایک
معمولی زخم کسی ایک ہاتھی جوان، لڑ جوان، کسی ایک بچہ تک کو آیا ہو۔ اور
علوی حشاشی، عقیقی، جعفری کسی ایک خاندان کا کوئی ایک شخص بھی
درجہ شہادت بر فائز ہوا ہو ہر گز نہیں (غیر ممکن۔ دنیا کی کوئی تاریخ اس
کے بتلانے پر تیار نہیں۔ ایک راوی بھی اس کو ظاہر نہیں کرتا۔

کیا حسین بن علی اور ہاشمی جوان میدان جنگ میں موجود نہیں تھے؟
یہ کہنا بھی بالکل واقعات کے خلاف ہے۔ پھر کیا تھا؟ صاف معلوم ہوتا ہے کہ
ایک طرف وہ بہادر مقابلہ کر رہے تھے اپنی جان دے رہے تھے اور دوسری
طرف اپنے سرداروں اور آزادوں کی حفاظت کر رہے تھے۔ اور کامیاب حفاظت
اور کئی فداکارانہ اور وفادارانہ عزم و ارادہ کی طاقت کے وہ نمایاں پہلو ہیں
جن کی مثال واقعہ کربلا کے سوا ملنا غیر ممکن ہے۔

یہ تقریباً اکثر مورخین نے کی ہے کہ اس حملہ میں شہید ہونے والوں کی تعداد
پچاس تک پہنچی ہے۔

یاد رہے معلوم ہوتی تھی کہ ان تمام شہداء کے اسماء مکمل طور سے معلوم ہو
سکیں اور حقیقتاً وہ یکجا صورت سے کہیں نہ کو رہیں بھی نہیں مگر قدر ہوئی
جسٹ اور سستی کے کامیاب نتیجہ کی وجہ تلاش کے بعد میں نے ان تمام القاء
کے اسماء یکجا جمع کئے اور شمارہ کرنے پر پچاس کی تعداد پوری ہو گئی۔

حتی ارادہ ہے کہ میں اس سلسلہ کے چوتھے حصہ میں شہداء کے بتلانے کے بتلانے
کے حالات اور ان کے امتیازی خصوصیات سلسلہ کے ساتھ قلمبند کروں گا۔
اس موقع پر صرف نام درج کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

”بہارِ حملہ میں شہید ہونے والے اصحاب کے اَسْمَاء“ (بہ ترتیب حروف تہجی)

- (۱) ادیم بن امیہ عبیدی بصری
(۲) امیہ بن سعد بن زید طحالی
(۳) بشر بن عمرو بن احدث حضرمی کنجی
(۴) ہاشم بن حجاج موی عاقر بن ہاشم الحیتی
(۵) حبیلہ بن علی الشیبانی
(۶) جنادة بن کعب بن حارث انصاری خزرجی
(۷) یزید بن مالک بن قیس بن ثعلبہ تمیمی -
(۸) حارث بن امرء القیس بن عابس کنزی
(۹) حارث بن نہال موی حمزہ بن عبدالمطلب
(۱۰) حباب بن عاقر بن کعب التمیمی
(۱۱) حبشی بن قیس النہجمی
(۱۲) حجاج بن جدر التمیمی السعدی
(۱۳) حلاس بن عمرو لاذری العاسی
(۱۴) ذہیر بن عمر الکندی
(۱۵) زہیر بن سلیم بن عمرو لاذری
(۱۶) سالم بن عمرو بن عبد اللہ موی نبی المذنبہ اہل
(۱۷) سالم موی عاقر بن مسلم العبیدی -
(۱۸) سعد بن حارث موی علی بن ابی طالب
- (۱۹) سعد بن عبد اللہ موی عمر بن خالد لاذری
الصیقل لاذری -
(۲۰) سلمان بن مضارب بن قیس
(۲۱) سلیم موی الحسن
(۲۲) سواد بن منقر بن حابس النہجمی ہمدانی
(۲۳) شیب بن عبد اللہ موی حارث بن
سریح الہمدانی الجابری
(۲۴) شیب بن عبد اللہ المنہشلی البصری
(۲۵) عاقر بن مسلم بن حسان بن مترج
السعدی البصری -
(۲۶) عاقر بن مسلم العبیدی البصری
(۲۷) عباد بن مہاجر بن ابی المہاجر الجہمی -
(۲۸) عبد الرحمن بن عبد اللہ لاذری
(۲۹) عبد الرحمن بن مسعود بن حجاج لہتمی
(۳۰) عبد اللہ بن بشر الخثعمی -
(۳۱) عبد اللہ بن یزید بن ثبیط القیسی
العبیدی البصری -
(۳۲) عبید اللہ بن یزید بن ثبیط القیسی

- (۳۳) عقیقہ بن الصلت الجہمی
(۳۴) عمارہ بن ابی سلامہ الدرا لانی
(۳۵) عمار بن حسان بن مترج الطحالی
(۳۶) عمر بن ضبیقہ بن قیس بن ثعلبہ تمیمی
(۳۷) عمرو بن حذیب الحفصی
(۳۸) قارب بن عبد اللہ بن اریقط
(۳۹) قاصط بن عبد اللہ بن زہیر بن
حارث الثعلبی
(۴۰) قاسم بن حبیب بن ابی لہب لاذری
(۴۱) کردوس بن عبد اللہ بن زہیر الثعلبی
(۴۲) مالک بن سریح
(۴۳) جمع بن زیاد بن عمرو الجہمی
(۴۴) مسعود بن حجاج الیمتی
(۴۵) مسلم بن کثیر الاعرج لاذری -
(۴۶) مقسط بن عبد اللہ بن زہیر الثعلبی
(۴۷) مینع بن زیاد
(۴۸) نصر بن ابی نیر موی علی
بن ابی طالب علیہ السلام
(۴۹) نعمان بن عمرو لاذری
المراسیجی -
(۵۰) نعیم بن عجلان الانصاری
الزدرتی الخزرجی -

یہ وہ لوگ ہیں جن میں یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ کون سے شہید ہوئے اور کون بعد اس لئے کہ تیروں کی بارش اور گھمسان کی جنگ میں ترتیب قائم ہوتا غیر ممکن ہے۔ اور معلوم نہیں ہو سکتی۔

تیسرا باب

نیمہ گاہِ حسینی پر فوج کا ہجوم

اصحاب سید الشہداء کی بے مثال شجاعت

اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ حسین اس باپ کے بیٹے تھے جس کی عمر، نوجوانی سے لے کر بوڑھے تک میدان جنگ میں گزری اور حسین نے بھی

آنکھ کھول کر بڑے بڑے معرکے دیکھے، مگر حقیقت خود امام حسین نے کربلا میں جس طرح کی سید سالاری اور سیاست جنگ کا نمونہ پیش کیا ہے وہ ان کے پہلے خود اسلام کی تاریخ میں بھی موجود نہیں ہے گفت گوئے صلح کے قطع ہونے کے بعد جنگ کا یقین ہو چکا تھا۔ امام کے ساتھ جو تین تھیں اور بچے بھی تھے۔ آپ کے ساتھیوں کی تعداد انتہائی کم تھی۔ اور دشمن کی سپاہ حد سے زیادہ تھی۔ کوفہ میں عمومی اعلان کے بعد کہ جو قتل حسین کے لئے نہ جائے گا اس کا گھر گرا دیا جائے گا۔ اور وہ خود قتل ہو گا۔ کوفہ کے ہر طرح ہی کے لوگ کربلا میں جمع ہو گئے تھے۔ شمر جو ایک لپیٹ فطرت اور باش انسان تھا اس کے ساتھ بہت کینے بد معاش کوفہ کے آدمی معرکہ جنگ میں آگئے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ کسی قتل و غارت کے موقع پر اس قسم کی باتوں سے بھی نہیں چوکتے جنہیں شریف لوگ اور بڑے سپاہی اپنی برافروخت اور سپاہیانہ آن بان کے خلاف سمجھ کر ہرگز اختیار نہیں کرتے۔ حضرت نے ملاحظہ فرمایا کہ ان کا قیام کھلے ہوئے میدان میں دشمن کو چاروں طرف سے ہجوم کرنے کی دعوت دینا ہے اور اس صورت میں سر ایہدہ حرم کی حفاظت بھی آپ کی زندگی ہی میں غیر ممکن ہے۔

یہ خیال کر کے آپ نے کربلا کی سر زمین پر تمام اطراف میں گمہ دشمن کی ایک خاص موقع لٹ کر گاہ اور حرم سرا کے لئے مناسب نظر آیا بھائی تین جانب سے ایک سلسلہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں اور ٹیلوں کا مدور شکل سے اس طرح آکر ملتا تھا جس سے ہلال کی شکل پیدا ہو اسی کا نام "حائر" ہے یقیناً جو شخص اس دائرہ میں آجائے وہ تین طرف سے محفوظ ہو کر رہتا ہے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ ایک قلعہ میں پناہ لے لے گا مگر یہ پناہ وہی لے سکتا ہے

لہ کتاب شفاء الحین مصنف علامہ سید بہت الدین شہرستانی دام ظلہ

جس کے پاس کافی مقدار میں آب و طعام موجود ہو اور جو شخص سامان آب و طعام کا نہ رکھتا ہو وہ اس دائرہ میں محفوظ ہونا چاہئے لہذا وہ گویا اپنے تئیں موت کے سپرد کر رہا ہے اس لئے کہ مشرقی جانب کے کھلے ہوئے حفرہ پر دشمن ہجوم کر کے اسے بالکل محصور کر دے گا۔ اور بہت مختصر مدت میں تبھوک اور پیاس سے اس کی جان کو تلف کر سکے گا۔

لیکن امام کو اس کے پہلو میں جنوب کی طرف ایک طولانی سلسلہ ٹیلوں کا ملا ہوا اس پہلے موقع سے زیادہ مناسب صورت رکھتا تھا اس لئے کہ جو شخص اس کے دامن میں قیام کرے وہ شمال اور مغرب کی جانب سے چھوٹی پہاڑیوں میں محصور ہو گا اور مشرقی و جنوب کی جانب وسیع میدان جنگ و جدال، اور حرب و ضرب کے لئے موجود ملے گا۔

حضرت نے اپنے حرم سرا اور خیمہ گاہ کے لئے اسی جگہ کو منتخب فرمایا۔ اور اپنے اصحاب کو حکم دیا کہ وہ خیموں کو بالکل ایک دوسرے کے قریب برپا کریں اور ہر خیمہ کی طنابوں کو دوسرے خیمہ کی طنابوں کے ساتھ وابستہ کر دیں۔ اس کے علاوہ اپنے پشت کی جانب ایک خندق کھدوا کر اس میں لکڑیاں جمع کرادی تھیں کہ ان میں آگ دے دی جائے جس کی بنا پر اس طرف سے دشمن کے ہجوم کا اندیشہ نہ رہے۔ یہ تمام تیاریاں شب عاشورہ تک مکمل ہو گئی تھیں۔ اور صبح کو اس خندق میں آگ روشن کرکھی دی گئی۔ اس طرح فوج دشمن کو بالکل گھیرنے اور چاروں طرف سے حملہ کرنے کا موقع باقی نہ رہا۔

جب تک حسین کی فوج اپنی مختصر مقدار کے اعتبار سے زیادہ تعداد میں موجود تھی۔ اس وقت تک دشمنوں کو آگے بڑھنے کا موقع حاصل نہیں ہوا تھا لیکن اب جس وقت کہ پچاس آدمی فوج حسین کے سب کے سب درجہ شہادت پر فائز ہو چکے۔ اور جتنے الفدا حسین باقی رہے ان کے پاس گھوڑے

بہن باقی رہے، سب پیادہ ہو گئے تو اب فوج دشمن کی ہمیش بڑھ گئیں اور وہ خیام حسینی کے قریب آ گئے۔
 حسین کے اصحاب کی تعداد بہت کم تھی مگر ان کی جنگ کا یہ عالم تھا کہ طبری نے لکھا ہے۔

قالوہم حتی اتصف النهار اشتد قتال خلقنا اللہ

”انہوں نے جنگ کی یہاں تک کہ دوپہر کا وقت آ گیا۔ سخت ترین جنگ دنیا کی جو خدا نے خلق کی ہو“

یزیدی فوج کی کوشش تھی کہ وہ کسی طرح لپشت سے حملہ کر سکے اور ان بہادر روں کو گھیرے مگر لپشت کی جانب ان کے سیمے تھے جنہیں امام کے حکم سے اس طرح ایک دوسرے سے متصل اور طناب اندہ طناب قائم کیا گیا تھا کہ انہوں نے ایک مضبوط دیوار اور حصار کی شکل اختیار کر لی تھی اس لئے اس طرف سے حملہ غیر ممکن تھا۔

عمر سعد نے یہ دیکھا تو حکم دیا کہ خیموں کو ان کے چپ و راست سے گرا دیا جائے تاکہ پورے طور سے محاصرہ کرنا ممکن ہو۔ اصحاب سید الشہداء نے جو یہ دیکھا تو متفرق طور پر اپنے اپنے خیموں کے اندر داخل ہو کر منتظر بیٹھ گئے۔ جس خیمہ میں کوئی داخل ہوتا کہ طناب میں کاٹ کر اس خیمہ کو گرائے تو فوراً وہ قتل کیا جاتا اور اس کی لاش باہر پھینک دی جاتی عمر سعد کو اس تدبیر میں بھی شکست اٹھانا پڑی تو اس نے کہا کہ اچھا ان سب خیموں میں آگ لگا دو کسی خیمہ کے اندر جا کر گرانے کی کوشش نہ کرو۔

معلوم ہوتا ہے کہ امام حسین کا خیمہ اور حرم سر اے عہمت اور مسلسل خیموں کی قطار سے علیحدہ تھا اور جدا گانہ قائم تھا۔ فوج کے سپاہی جب ان خیموں میں آگ دینے لگے تو امام نے فرمایا آگ لگا دینے دو اس لئے کہ اگر انہوں نے آگ لگا دی

اور شعلے بھڑکنے لگے تو پھر بھی یہ اس طرف سے تو تمھارے اوپر حملہ کرنے سکیں گے۔ اور جوان کا مقصد ہے وہ پورا نہ ہوگا۔

اصحاب حسین نے ملاقات چھوڑ دی اور عمر سعد کی فوج آگ لگانے میں کامیاب ہوئی مگر نتیجے نے بتا دیا کہ عمر سعد ایسے ایک بڑی فوج کے افسر نے سیاست جنگ میں غلطی کی اور حسین ایسے چھوٹی فوج کے سپہ سالار کی رائے صرف بجز درست ہوئی۔ یعنی آگ لگانے سے دشمن کے لئے خود اس طرف کا راستہ بند ہو گیا اور مقابلہ کا موقع صرف سامنے ہی کی جانب سے باقی رہ گیا۔

اپنی تدبیر کے شکست کھانے کا بیجا افسوس تھا جس نے کمینہ طبیعت شمر کو براہ فرختہ کر دیا اور اس نے محض امام حسین کے خیمہ پر حملہ کر کے اپنا نیزہ خیمہ کے اوپر مارا اور کہا کہ لاؤ آگ! تاکہ میں اس گھر کو اس کے رہنے والوں سمیت جلا دوں۔ اس آواز کا اثر تھا کہ خیمہ میں ایک ستور نالہ و فریاد کا بلند ہو گیا جس سے خیرت دار پیکر شرافت منظر محمّد بن علیؑ کو بھی تاب نہ رہی اور پکارا کہ فرمایا۔
 ”اے شمر تو آگ اس لئے منگاہا ہے کہ میرے گھر کو میرے اہل و عیال سمیت جلا دے! خدا تجھے آگ سے جلنا نصیب کرے“

فوج کے دوسرے سپاہیوں نے شمر کو منع کیا اور شدت بن لعلی نے انھیں طور سے شمر کے پاس آ کر کہا۔

ماملت بیت مقللا اسوا من قولک ولا موفقا افتح من موفقا امرعبا للنداء امرت۔

”میں نے آج تک ایسی شرمناک بات نہیں سنی جیسی تو کہہ رہا ہے اور نہ اسے بدتر مرقام دیکھا جس کا تو نے ارادہ کیا ہے۔ تو عورتوں کو خوف زدہ کرتا ہے“

ان سب لوگوں کے کہنے سے شمر بھی کچھ مترنمہ سا ہوا اور اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ اتنی دیر میں نہ ہیر بن قین نے اپنے دس بہادر ساتھیوں کے ساتھ حملہ کیا اور

اتنا سخت حملہ کیا کہ شمر اور اس کے ساتھ والی فوج کو خیموں کے پاس سے دور ہٹایا اور ابوہریرہؓ کو جو شمر کا خاص آدمی اور اس کے عقیدے سے تھا قتل کر دیا۔ دشمن کی فوج نے جو اپنے ایک ممتاز سپاہی کو اس حملہ میں قتل ہوتے دیکھا پورے جوش و خروش سے ان دس آدمیوں پر ٹوٹ پڑے اور سخت خونریز لڑائی ہوئی مگر ان بہادروں نے کبھی بڑی پامردی سے مقابلہ کیا جس کے نتیجے میں دشمن کو شکست ہوئی مگر اس کے بعد اصحابِ حسینؑ میں سے بھی اکاڈگا افراد قتل ہوتے رہے۔ کثرت اور قلت کا مقابلہ کیا، طبری کے بیان کے موافق صورت یہ تھی کہ۔

”اذا قتلہ منہما الراجال والرجال مستبین فیہم واولادہم

کثیر لا قبیحین فیہم ما یقتل منہم
”ان میں سے ایک یا دو بھی قتل ہوتے تو اس سے نمایاں کمی پیدا ہوتی تھی اور وہ بہت کثیر تعداد میں تھے اس لئے جتنے بھی قتل ہوتے تھے کچھ پتہ ہی نہ چلتا تھا“

وہ اشخاص جو پہلے حملہ کے بعد سے دوپہر کے وقت تک نماز ظہر کے واقعہ سے پہلے شہید ہوئے ان میں سے بعض کے اسماء تاریخ میں حسب ذیل ہیں۔
(۱) بکر بن حماد بن عبد اللہ بن ثعلبہ اللہیمی یہ ان لوگوں میں سے تھے کہ جو عمر سعد کی فوج میں امام حسینؑ سے جنگ کو آئے تھے مگر جب جنگ چھڑی اور موت کا بازار گرم ہوا تو توفیق الہی نے دستگیری کی اور یہ فوج حسینؑ میں شامل ہو کر نصرتِ امام میں شہید ہوئے۔ ابصار العین میں ہے کہ قتل بلین بیدی الحسین بعد الجملۃ الاولى۔ یہ امام حسینؑ کی نصرت میں پہلے حملہ کے بعد قتل ہوئے۔

(۲) کنانہ بن عتق تغلیبی کے متعلق لکھا ہے قتل مبارک توفیق ما بین الجملۃ الاولى والظہر۔ یہ مبارز طلبی کی جنگ میں ”حملہ اولیٰ اور ظہر کے

درمیان میں شہید ہوئے۔
(۳) عمرو بن جنادة بن کعب خزرجی۔ کم سن نابالغ یتیم جس کے باپ جنادة بن کعب ”حملہ اولیٰ“ میں شہید ہوئے۔ بحر یہ سنت مسعودی اس بچہ کی بیوہ ماں نے بچہ کو ہلاکت کی کہ وہ بھی باہر نکلے۔ اور حسینؑ کی نصرت میں جنگ کرے بچہ خدمتِ امام میں آیا اور طالبِ اجازت ہوا۔ حضرت نے اجازت دینے سے انکار کیا بچہ نے پھر رخصت طلب کی۔ حضرت نے اصحاب کی طرف رخ کر کے فرمایا۔ ابھی تو اس کا باپ مگر کہ جنگ میں قتل ہو چکا ہے۔ اب بھلا اس کی ماں کے دل پر کیسا گم زورے گی جو یہ بھی جا کر قتل ہوئے۔

بچہ نے کہا آقا میری ماں ہی نے تو بھیجا ہے اور انھوں نے ہی تو مجھے یہ جنگ کا لباس پہنایا ہے۔

امام مجبور ہوئے اور اجازت دی۔ بچہ میدان میں آیا اور لڑ کر قتل ہوا سخت دل اور بے رحم فوج نے بچہ کا سر کاٹ کر فوج حسینؑ کی طرف پھینک دیا۔ بنت مسعود نے بچے کے سر کو واپس انوارِ دشمن کی جانب پھینک دیا اور خود بھی مجبور خیمہ لے کر دشمنوں پر حملہ کر دیا۔ امام نے جو یہ دیکھا اسے گوارا نہ کیا اور اس صورت کو خیمہ کی خاصی جانب واپس فرما دیا۔

واقعه کہ بلا کی ایسی مثالیں وہ ہیں جو دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہیں اور ہمیشہ بے نظیر صورت پر قائم رہیں گی۔

(۴) یزید بن حسین المشرقی، ان کا تذکرہ شیخ عبداللہ ماہی الغسانی طاب ثراہ کی کتاب تفسیح المقال میں ہے اور لکھا ہے۔

کان مع من جاہد من اصحابہ دشمن قتل قبل الظہر
”یہ ان اصحاب میں سے تھے جنہوں نے حضرت کی نصرت میں جنگ کی اور ظہر کے قبل شہید ہوئے“

پوتھاباب

ظہر کا ہنگام اور نماز ظہر کا ہنگام

میدان میں ایک طرف گرجی سے آگ برس رہی تھی دوسری طرف جنگ کی دوجہ سے خون کی بارش تھی اس عالم میں ظہر کا وقت آیا تو ابو شامہ عمر بن عبد اللہ صدائے امام کی خدمت میں عرض کیا۔

”مولا میں دیکھتا ہوں کہ یہ لوگ اب آپ کے بالکل قریب آگئے ہیں۔ اور یقینی ہے کہ آپ پر کوئی ایچ نہ آنے پائے گی جب تک میں الشاء اللہ آپ کے سامنے قتل نہ ہو جاؤں، میں چاہتا ہوں کہ اس نماز کو جس کا وقت آ رہی گیا ہے آپ کے ساتھ پڑھ لوں اس کے بعد خدا کی بارگاہ میں جاؤں۔“

امام نے سراٹھایا۔ اور فرمایا اذکرت الصلوات جعلک اللہ من اللصلین الذاکرین لفسم هذا اول وقتہا، تم نے نماز کو یاد کیا خدا تم کو نماز گزاروں اور یاد رکھنے والوں میں محسوب کرے۔ ہاں یہ نماز کا اول وقت ہے۔“

پھر حضرت نے فرمایا ان لوگوں سے کہو اتنی دیر تک جنگ سے ہاتھ روکیں کہ ہم لوگ نماز پڑھ لیں۔“

اللہ! اللہ! رسول کا فرزند جس کے گھر سے نماز کی بنیاد قائم ہوئی وہ نماز کی مہلت مانگے اور نہ ملے۔ بلکہ مہلت کے سوال پر حصین بن تیمیم صنف سے باہر نکلے اور یہ کہے کہ تمھاری نماز قبول نہیں ہے۔“

جس پر حبیب بن مظاہرے چین ہو جائیں اور یہ کہیں کہ فرزند رسول کی

نماز قبول ہو اور تیری نماز قبول ہو۔“

حصین بن تیمیم کو یہ سنا کر غصہ آتا ہے اور وہ حملہ کر دیتا ہے حبیب اس کے مقابلہ کو جاتے ہیں۔ حبیب نے جاتے ہی اس کے گھوڑے کے منہ پر تلوار ماری جس سے وہ بھڑکا اور حصین زمین پر آ رہا اس کے ساتھ ہونے فوراً اس کی حفاظت کی اور بڑی کر لے گئے۔ حبیب نے شتر بڑھنا شروع کئے۔ اقسام لو کہنا خد اعداوا او شطر کم ولیتہ اکتاوا

یا شتر قوم حسبا واولا

”قسم کھا کے کہتا ہوں کہ اگر ہم تعداد میں تمھارے برابر ہوتے یا تمھارے آدھے بھی ہوتے تو تم ضرور شکست کھا کے واپس جاتے اسے بدترین قوم حسب و نسب کے اعتبار سے، پھر جوش جہاد زیادہ بڑھا اور یہ نہ جہز پڑھنے لگے۔“

انا حبیب و ابی مظاہرہ فارس ہیجاء و حرب لتحصر
انتہا اعداۃ واکشد وخن ادونہ ہنکہ واصلبر
وخن اعلیٰ حجتہ و اظہر حقا و اتقی منکد و اعذرنا

میں حبیب ہوں اور میرے باپ مظاہر تھے۔ میں میدان جنگ اور اس موقع کا جب لڑائی کے شعلے بھڑک رہے ہوں۔ شہسوار ہوں۔ تمھارے پاس جنگ کا سامان ہم سے زیادہ ہے اور تعداد میں بھی ہم سے زیادہ ہو مگر ہم وفاداری و استقلال اور صبر و برداشت رکھتے ہیں اور حقانیت کا ثبوت اور سچائی کی طاقت اور خدا کا خوف اور اپنے حق بجانب ہونے کی سند تم سے زیادہ رکھتے ہیں۔“

اس کے بعد شدت کے ساتھ جنگ کی۔ ایک شخص نے بنی تیمیم میں سے جس کا نام بدیل بن ضریم تھا تلوار سے ان پر حملہ کیا۔ انھوں نے اس شخص کو قتل کر دیا۔ دوسری طرف سے دوسرے شخص نے نیزہ لگایا جس سے یہ گہرے گئے مگر پھر بھل کر چاہتے تھے اٹھیں کہ حصین بن تیمیم نے تلوار سر پر لگائی

جس سے حبیب خاک پر گھر پڑے۔ اور پہلے سپاہی نے اتر کر
سران کا قلم کھ لیا۔

دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ حبیب بن مظاہر کے قتل ہونے سے امام
حسین کے چہرہ پر شکستگی کے آثار نمایاں ہو گئے اور انتہائی صدمہ کا
اظہار ہوا۔

اس وقت حر بن یزید ریاحی نے جو اپنے گھوڑے کے بے ہونے کے
بعد پیادہ ہو چکے تھے اور اس کے پہلے کئی مرتبہ لڑ بھی چکے تھے زہیر بن قین کے
ساتھ مل کر دشمن پر حملہ کیا۔ حر جز پڑھ رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے۔
الیت لاقتل حتی ا قتلا ولن اصاب الیوم الا مقبلا
۱ ضرب ہم بالسيف ضربا مقبلا لانا کلا عنہم ولا مہللا
”میں نے تم کھائی ہے کہ قتل نہ ہوں گا جب تک کہ دشمنوں کو قتل نہ
کر لوں اور مارا نہ جاؤں مگر پیش قدمی کرنے ہی کی حالت میں، میں آج تلواریں
لگاؤں گا، فیصلہ کن تلواریں، نہ میرے قدم چھپے ہٹیں گے اور نہ کمزوری کا اظہار
ہوگا۔“

کبھی ریشتر پڑھتے تھے۔

اضرب فنی اعراضہم بالسيف عن بخیر من حمل معنی والخیف
”میں تمہیں زنی کروں گا اس بہترین انسان کی جانب سے جس نے سر نہ میں
شرم میں کبھی قیام کیا۔“

حر اور زہیر بن قین دونوں نے مل کر جنگ کرنا شروع کی۔ حالت یہ تھی
کہ ایک حملہ کرتا تھا اور جب وہ دشمنوں میں گھر جاتا تو دوسرا حملہ کر کے اُسے
دشمنوں کے حلقہ سے نجات دیتا تھا۔

گھوڑی دیر ہی صدمہ قائم رہی لیکن اس کے بعد پیادوں کی فوج نے

حر بن یزید کا سختی سے محاصرہ کیا اور زہیر بن قین کی کوشش ان کی مدافعت
میں ناکام ہوئی۔ کئی روز بہتاد پر فائز ہوئے۔

امام نے اپنے اس ناہر کی یہ قدر کی کہ جب اصحاب اٹھا کہ میدان سے
خیمہ گاہ کی طرف لائے اور حضرت کے سامنے دکھا تو حضرت خاک و خون پر
چہرہ سے صاف کرنے لگے اور فرمایا۔

انٹ الحی کہما سمعتک املک تم بلیٹیک حر ہو۔ تمہارے والدین نے
دانٹ الحی فی الدنیا و انبت الحی تمہارا نام حر بہت ٹھیک رکھا۔ تم دنیا
حق الاخرتہ میں بھی حر ہو اور آخرت میں بھی حر!

یعنی انسان کی حریت و شرافت کا جو سہر اس کے افعال ہی سے نمایاں ہوتا
ہے۔ قید و بند دنیا میں گم فتنہ اور ہواؤ ہو کس میں اسیر ہو کر حق و ناحق
کے امتیاز کو ہٹا دینے والا انسان ہرگز حریت ضمیر اور شرافت نفس کے
جوہر کا مالک نہیں ہے یقیناً حر نے تمام دنیاوی لطفات کو چھوڑ کر حق کے
ملاستے پر قدم رکھا تو وہ حر ثابت ہوئے اور حریت کے اصلی جوہر کو اپنے عمل
سے نمایاں کر دیا۔

جنگ ملوئی نہیں ہوئی تھی اور نماز کی مہلت نہیں مل سکی ایسے موقع کے لئے
شروع نے مخصوص حکم نماز نواف کا دیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ فوج کے دو حصے
ہو جائیں، ایک حصہ دشمن کے ساتھ مقابلہ کرے اور دوسرا حصہ نماز میں شریک
ہو۔ وہ ایک رکعت امام کے ساتھ پڑھے اور باقی نماز تخفیف کے ساتھ فروی
پڑھ کر تمام کرے اور جب یہ نماز ختم کر کے جائے اور دشمن کے سامنے کھڑا
ہو جائے تو وہ پہلا حصہ فوج کا میدان جنگ سے آ کر نماز میں شریک ہو۔ مگر یہ
تو اس وقت ہے جب فوج کی اتنی تعداد بھی ہو کہ اس کے دو حصے ہو سکیں اور
اس کا نصف حصہ دشمن کے ساتھ مقابلہ کر سکے۔ مگر فوج حسین، اس کی
تو مجموعی تعداد ہی اب بہت کم تھی۔ اس میں یہ صورت کہاں ممکن ہو سکتی تھی لیکن

حیئن کو تو اس دن تمام اسلامی تعلیمات کو عملی صورت میں پیش کرنا تھا انھوں نے اپنی اس مختصر فوج ہی میں اس طرح تقسیم کی۔

مشہور یہ ہے کہ آپ نے صرف زہیر بن قین اور سعید بن عبداللہ حنفی کو اپنے سامنے کھڑا کیا۔ میں نے اسی شہرت کی بنا پر ”اسوہ حسینی“ کی تقریروں میں یہ بحث کی ہے کہ یہ دو آدمی پورے جماعت کی کس طرح حفاظت کر سکتے ہیں اس کے سلسلے میں میں نے ہجرت قبلہ اور میدان کا زار کے محل وقوع پر تبصرہ کیا ہے۔ مگر علامہ مجلسی نے بحار میں جو روایت درج کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

فقال الحسين لن هير
بن القين وسعيد بن عبد الله
تقد ما امامي حتى اصلي الظهر
فتقد ما امامي حتى اصلي العشاء
اصحابي حتى يصلي بغير صلوات
الخوف -

امام نے زہیر بن قین اور سعید بن عبداللہ حنفی سے فرمایا کہ دونوں میرے سامنے آگے بڑھو یہاں تک کہ میں نماز ظہر پڑھ لوں۔
یہ دونوں آدمی اصحاب کی تقریباً نصف جماعت کے ساتھ آگے بڑھے اور حضرت نے نماز خوف ادا کی۔

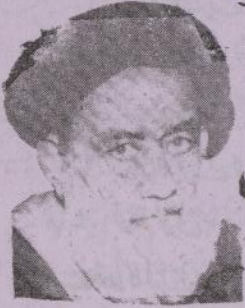
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعی نماز خوف کی جو صورت ہے اسی طرح نماز پڑھی گئی تھی۔ مگر پھر بھی اصحاب میں کی جرات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ کئی میں کمی پیدا ہوئی یعنی وہ تعداد ہی کتنی تھی۔ ان میں بھی نصف نماز میں مصروف ہوئے اور نصف تمام فوج کے لیے گورہ کے رہے۔

بہر حال یہ نماز تھی۔ اور یاد رکھنا! سعید بن عبداللہ حنفی نے عجیب استقلال اور وفاداری کا مظاہرہ کیا وہ خاص اہم کے سامنے جو تیر آنے لگتا تھا اس کو خود اپنے اوپر روکتے تھے یہاں تک کہ آخر زہیر بن قین پر گہرے اور روح نے جسم سے پروانہ کی، معلوم ہوا کہ

تیرہ تیران کے جسم میں پوست تھے۔ زہیر بن قین نے بڑی پامردی سے جنگ کی وہ کہہ رہے تھے۔ ؟

اذن وھم بالسيف عن حسين
میں زہیر بن قین اور قین کا فرزند ہوں۔ میں اپنی تلوار سے ان کو حسین کی جانب سے دور کروں گا۔

وہ پہلے عمر کے ساتھ بھی بہت لڑ چکے تھے اور اب پھر خوب شیرازی کی آغوش کو کثیر بن عبداللہ شیبی اور مہاجر بن اوس دو شخصوں نے ان پر حملہ کیا جن کے ہاتھ سے وہ درجہ شہادت تک فائز ہوئے۔



پانچواں باب

اصحاب کا خاتمہ

نماز ظہر کے بعد تمام اصحاب میں شہادت کا جذبہ زیادہ تیز ہو گیا تھا شیعہ امامت کے پھولنے جاننا ہی میں ایک دوسرے پر سبقت کرنے لگے۔ تیر اندازی میں بڑے مشتاق اور بیگانہ لڑو گاہ تھے انھوں نے اپنے تیروں کے سوافاد پر اپنے نام لکھ دیئے تھے ان کا ذکر اس کے پہلے بھی ہو چکا ہے۔

”انھوں نے تیر لگانا شروع کئے جو سب زہیر میں سمجھے ہوئے تھے۔ زبان پر یہ جملہ تھا کہ انا الجہلی انا علی دین علی، میں قبیلہ جبل کا آدمی علی کے دین پر ہوں۔“

ان تیروں نے بہت سے آدمیوں کو زخمی کیا اور بارہ آدمی لوجان سے

مارے گئے آخر دشمن نے ان کو گھیر کر باہر نکلنے شروع کیا یہاں تک کہ دونوں بازو ان کے شکستہ ہو گئے اس وقت وہ گرفتار نہ گئے گئے شتر کچھ سپاہیوں کی مدد سے ان کو بچھڑا کر عمر سعد کے پاس لے گیا۔

عمر سعد نے کہا، نافع یہ تم نے اپنے نفس کے ساتھ سلوک کیا؟ نافع کے سر سے خون بہ رہا تھا۔ اس حالت میں جواب دیا "میرے ضمیر سے تو خدا واقعہ ہے کہ میری نیت کیا تھی مگر خدا کی قسم مجھے خوشی ہے کہ میں نے بارہ آدمی تم میں سے جان سے مارے ہیں اور زخمیوں کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔"

مجھے مسرت ہے کہ میں نے اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کی اور میرے بازو لٹختے جاتے تو تم مجھے اس طرح گرفتار نہ کر سکتے۔ شمر نے کہا اس شخص کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے عمر سعد نے کہا تم ہی گرفتار کر کے لائے ہو تمہیں اختیار ہے۔ شمر نے تلوار کھینچی نافع نے کہا "اگر تم لوگ مسلمان ہوتے تو کبھی ہم لوگوں کے خون میں ہاتھ نہ بھرتے متکدہ ہے خدا کا کہ اس نے ہم لوگوں کی موت اپنے مخلوق میں سے بدترین لوگوں کے ہاتھوں سے قرار دیا۔"

شمر نے تلوار لگائی، نافع شہادت کے عظیم درجہ پر فائز ہوئے۔ لیست جو صلہ اور کمینہ فطرت شمر اس زخمی اور گرفتار شدہ مجاہد کو قتل کر کے فتح مندگی کا احساس کرنے لگا اور رجز کے استعارہ زبان پر جاری کر کے اصحاب امام حسین علیہ السلام پر حملہ آور ہوا۔

اصحاب امام کی اب یہ حالت تھی کہ ہر ایک چاہتا تھا ہم پر سے اپنی جان نثار کریں "حضرت نے فرمایا۔"

"آؤ! میرے قریب کھڑے ہو کہ جنگ کرو۔"

دونوں نے حضرت کے نزدیک ہی کھڑے ہو کہ جنگ کو ناسرور کیا اور شہید ہوئے۔

سیف بن حارث بن سریع و | دونوں چچا زاد بھائی اور ایک ماں
مالک بن عبد بن سریع | کی اولاد تھے، دونوں جوان امام
کی خدمت میں آئے اور بس نزدیک

کھڑے ہو کر رونے لگے۔ اصحاب کے دل کی بے چینیاں ان کے طرز عمل سے نمایاں، اور امام کا استقلال ان کی باتوں سے ہو گیا ہے ان کے منہ سے لہجہ و تم کی وجہ سے بات نہیں نکلتی، امام کے پاس کھڑے ہیں اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، امام فرماتے ہیں "کیوں میرے بھائی کے فرزندو، روتے کیوں ہو؟ کھڑی دیر میں ابھی دیکھو خوشی ہی خوشی تمہیں نصیب ہوگی۔ بہادرہ حال نثار عرض کرتے ہیں۔"

"ہماری جان آپ پر قربان۔ ہم اپنے لئے کھڑی روتے ہیں۔ ہمیں تو آپ کی بے کسی پر رونا آتا ہے۔ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے اور ہم سے اب آپ کی حفاظت ہوتی نہیں معلوم ہوتی۔"

حضرت نے فرمایا "خدا تم دونوں کو لے میرے کھینچو جزائے خیر سے اس صلہ کی وجہ سے اور ہمدردی کے لئے جو تمہیں میرے ساتھ ہے خدا تم کو بہترین جزا عطا کرے۔" ان دونوں جوانوں نے اپنی جان آقا پر فدا کی۔

بریز بن خنیس ہمدانی | پورے طور سے نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی شہادت ظہر سے قبل ہے یا ظہر کے بعد میرا خیال یہ ہے کہ وہ اوائل جنگ میں شہید ہوئے ہیں مجلسی نے بحار میں ان کی شہادت کو عمر بن یزید ہمدانی کے بعد لکھا ہے مگر یہ شاید اسی غلطی پر مبنی ہو کہ خود عمر کی شہادت کو اوائل جہاد میں بتلایا گیا ہے۔

بہر حال صورت یہ ہے کہ یزید بن معقل نے جو فوج عمر بن سعد میں تھا صف سے باہر نکل کر بریز آواز دی اور کہا کیوں بریز دیکھتے ہو خدا نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟ بریز نے کہا میرے ساتھ تو خدا نے اچھا ہی سلوک کیا۔ ہاں میرے ساتھ

س لوگ بڑا کیا۔ یزید نے کہا یہ تم جھوٹ کہتے ہو حالانکہ اس کے پہلے تمہیں جھوٹ بولنے کی عادت نہیں تھی اچھا پھر یاد ہے ایک دن ہم اور تم بنی نذران کے محلہ میں چہل قدمی کر رہے تھے تم اس موقع پر کہتے تھے کہ سچے امام اور حقیقی رہنما صرف علی بن ابی طالب ہیں۔ بریر نے کہا بے شک میری رائے سچی ہے اور اسی قول پر اب بھی قائم ہوں۔ یزید نے کہا میں تو تمہیں گمراہ سمجھتا ہوں۔ بریر نے کہا اچھا مہا بلہ کہنا چاہتے ہو؟ آؤ خدا سے دعا کریں کہ وہ جھوٹے پر لعنت کرے اور سچو سچی پر بھلائی کے ہاتھ سے باطل عقیدہ والے کو قتل کرانے پھر باہر نکل کر ہم دونوں آدمی جنگ کریں۔ یزید نے اس کو منظور کر لیا۔ دونوں میدان میں آگئے۔

یقیناً دونوں فوجوں کی آنکھیں لٹری ہوئی ہوں گی سچی اور باطل کا کھلا ہوا مقابلہ اور فیصلہ کن امتحان دونوں نے دعا کی اور اس کے بعد جنگ شروع کر دی۔ صرف دوضر ہتوں کے رد و بدل کی لذت آئی۔ پہلے یزید بن معقل نے وار لگایا جو بریر پر تھپچھتا ہوا بڑا اور کوئی زخم تک بریر کے نہیں آیا۔ اس کے بعد بریر نے تلوار لگائی تو وہ خود کو کاٹتی ہوئی کاٹ کر سر میں در آئی اور قدر آور انسان زمین پر گرنا معلوم ہوتا تھا کہ پہاڑ بھڑ پڑا۔

مباہلہ کا نتیجہ فیصلہ کن صورت میں نمایاں ہو گیا۔

(”قاتلان حسین کا مذہب“ رسالہ میں میں نے اس واقعہ

سے پورا پورا نتیجہ حاصل کیا ہے۔)

بریر نے اس جنگ میں فتح نہیں حاصل کی بلکہ دلیل حقیقت تھی جو مکمل طور سے فتح یاب ہوئی اور آفتاب کی طرح نمایاں ہوئی۔

کاش دیکھنے والوں کی آنکھیں کھلتیں مگر نہیں ادھر بریر اپنی تلوار دشمن کے کارے سے باہر نکال رہے تھے ادھر رضی بن منافذ عبدی نے

بریر پر حملہ کر دیا۔ بریر اس سے دوست و گمبیاں ہو گئے۔ اس نے دشمن مغلوب ہوا اور بریر اس کے سینہ پر سوار ہو گئے۔ مگر وردن والے مغلوب نے اپنے ساتھیوں کو مدد کے لئے پکارا۔ کعب بن جابر بن مروانہ دی آگے بڑھا کہ حملہ کرے، فوج والے دوسرے سپاہیوں نے منع بھی کیا کہ یہ بریر حافظ قرآن ہیں جو مسجد میں قرآن حفظ کرایا کرتے تھے مگر اس نے نہ مانا اور لہنت کی جانب سے بریر پر حملہ کر کے نیزہ لہنت کے پار کر دیا۔ پھر تلوار لگا کے بریر کا کام تمام کر دیا۔

امام کے سامنے آ کر کھڑے ہوئے اور پکارا
خزطلہ بن اسعد شہابی

یا قوم اذ اخاف علیکم مثل
یوم الاخر اب مثل و اب قوم نوح
وعاد و تمود و الذین من بعدہم
و ما اللہ یرید ظملا للعباد و یا قوم
اذ اخاف علیکم و یم التناویوم
توروت مدیرین ما لکم من اللہ
من عاصرو من ینزل اللہ فما
لہ من ضاد یا قوم لا تقتلوا حسینا
فیسحتکما اللہ لیداب و قد
خاب من افتری۔

خدا تم پر عذاب نازل کرے گا۔ سچ کہتا ہوں تم سے۔ جھوٹا ہمیشہ ناکام اور
یا کوس ہوتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے ایک جذبہ ہے اظہار حق کا جو بے چین کے ہوئے ہے۔
امام نے فرمایا۔ ”اے خزطلہ عذاب کے مستحق تو یہ اسی وقت ہو چکے جب

تمہاری دعوت حق کو مسترد کیا اور تمہارے مقابلہ کے لئے فوج کشی کر کے آئے
پھر جاؤ ایک اب۔ اب لو آؤ انہوں نے تمہارے نیکو کار اور پیادے بھائیوں کو
قتل بھی کیا۔

حنظلہ نے کہا "مولا، آپ کی معرفت مجھ سے زیادہ ہے۔ مجھ کو یہ درجہ
کہاں حاصل؟ اچھا تو آپ اجازت دیتے ہیں؟ ہم بھی جا کر اپنے بھائیوں
سے ملتی ہوں۔ حضرت نے فرمایا اچھا جاؤ اس عالم کی طرف جو اس دنیا سے
بدرجہ بہتر ہے۔ اور اس ملک کی جانب جو فنا ہونے والا نہیں۔"
حنظلہ نے کہا آمین آمین۔ یہ کہہ کر آگے بڑھے، جنگ کی اور شہید
ہو گئے۔

عابس بن ابی ثعلبہ کبریٰ کو ذکے ایک نام آور بزرگ مرتبہ
شخص تھے اپنے غلام شوزب کے ساتھ
امام کی نصرت کو آئے تھے۔ یہ غلام ان کو بہت عزیز تھا اور غلام بھی بہت
دوستا تھا۔ وہ متوجہ ہوئے اپنے غلام کی طرف اور کہا کیوں کیا ارادہ ہے؟ غلام
نے کہا "ارادہ کیا ہے؟ یہی کہ آپ کے ساتھ فرزند رسول کی نصرت میں جنگ
کردوں اور قتل ہوں۔" عابس نے کہا "شنا بائیں مجھے کچھ سے یہی امید
تھی۔ اچھا تو پھر بڑھ آگے اور امام کے اوپر جاؤ نشانہ کہ تاکہ امام تیری مصیبت
بھی اسی طرح دیکھ لیں جیسے اپنے دوسرے اصحاب کی اور میں بھی تیرے ہم ٹھاکر
لڑاؤں کا مستحق بن جاؤں یعنی۔ اس وقت اگر کوئی ایسا شخص موجود
ہوتا جو کچھ سے زیادہ مجھے عزیز ہو تو میں اُسے بھی اپنے سامنے بھیجتا تاکہ
اس کی مصیبت کو برداشت کرنے کا لڑاؤ حاصل کر تا کیونکہ آج تو ایسا
دن ہے جس میں جتنا انسان سے ہو سکے اتنا اجر لڑاؤ حاصل کرے۔ اس لئے کہ آج
عمل کا دفتر ختم ہو رہا ہے۔ اور اس کے بعد حساب ہی حساب ہے۔
کیا کہنا اس جذبہ اطاعت اور اخلاص معرفت کا کیا کہنا اس استغلال

داطمینان کا معلوم ہوتا ہے مصیبتیں خود اختیار ہی طور پر اٹھائی جا رہی ہیں
اور ان میں ترتیب و نظم قائم کیا گیا ہے۔ کوئی ناگہانی اور اچانک صورت
نہیں ہے۔

یہی وہ پہلو تھا جس۔ طاف سے جناب عباس نے اپنے بھائیوں کو اپنے
سامنے بھیجا۔ اس کا تذکرہ بعد کو آئے گا۔

یاد غلام آگے بڑھا امام حسین کو سلام کیا اور میدان میں جا کر لڑا اور شہید
ہوا اب عابس بن شیب خود امام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا۔

"بھادر و جسے زمین پر نزدیک یاد و کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو مجھے
آپ سے زیادہ عزیز اور آپ سے زیادہ محبوب ہو اگر مجھے قدرت ہوتی کہ میں اپنی
جان سے زیادہ کوئی عزیز بننے آپ کی خدمت میں پیش کر دوں۔ اور آپ نیز
نشانہ کردوں تو ایسا ہی کہ تا مگر اب تو میں میری جان ہی باقی ہے تو پھر اجازت دیجئے
میں خدا کو گواہ کئے دیتا ہوں کہ آپ اور آپ کے باپ کے دین پر ہی قائم
ہوں۔" معلوم ہے کہ دنیا کے سپہ سالار خود سپاہیوں کو میدان جنگ
میں بھیجتے اور لڑاتے ہیں مگر کہ بلا کا معرکہ اس سے مختلف تھا یہاں ہر انسان
اپنے دل کی حرکت اور ضمیر کی ہدایت سے جاں نثار کہ رہا تھا اور اس کو بھی ادا
رض میں کم محسوس کرنا تھا۔

عابس سلام بخصت کرنے کے بعد ہاتھ میں ننگی تلوار لئے میدان کی طرف
چلے پیشانی پر ایک دم تھا جو شاید پہلے حملوں میں آگیا تھا۔ فوج کو فرکا
ایک شخص ربیع بن ہبیم جو کہ بلا سے واپس ہوا تھا۔ بیان کرتا ہے کہ میں نے عابس
کو آتے دیکھا تو پہچان لیا میں انھیں اس کے پہلے لڑاؤ میں دیکھ چکا تھا
اور جانتا تھا کہ وہ یکتائے روزگار شجاع اور جنگ آہ ماہیں میں نے کہا
ایضا الناس هذا اسد الاسود سے اہل فوج پر شہرہ دل کا شیر ابن شیب
هذا ابن شیب لا یخون الیہ ہے اس کے مقابلہ کو تم میں سے کوئی باہر
احد منکم نہ نکلے۔

ان الفاظ سے فوج پر اتنی ہیبت چھائی کہ عالس نے ہر چند آواز میں دیں کہ
"الاس جل جس جل کوئی مرد میدان نہیں جو ایک مرد میدان کے مقابلہ کو آئے"
مگر فوج میں سے ایک شخص بھی باہر نہ نکلا۔

عمر سعد نے کہا اس بہادر کو پتھر مارنا شروع کر دو۔

واہ، کیا خوب اصل جنگ ہے اور کیا شجاعت و بہادری، چاروں

طرف سے پتھر برسنے لگے۔

عالس نے جو یہ دیکھا اپنی نذرہ اور خود بکتر آنا کہ پھینک دیا اور تلوار لے
فوج کے ادھر لڑنے پر طے کیا۔ سینکڑوں آدمی ان کے سامنے سے بھاگتے ہوئے
نظر آتے تھے۔ آخر فوج نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور وہ درجہ شہادت
پر فائز ہوئے۔

عمر بن قریظہ الفزاری نے پہلے تو حملہ کیا اور تلوار چلائی پھر امام کے
سامنے آکر کھڑے ہو گئے جو تیرا آنا اسے
اپنے اُد پر روکتے اور جو وہ ہوتا خود سپر بن جاتے تھے آخر نہ جنوں سے
پور ہو گئے۔ امام کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا "کیوں قرآن نذر رسول میں نے فرض
کو ادا کیا؟ حضرت نے فرمایا "ہاں تم جنت میں میرے آگے جاؤ گے۔ رسول خدا کو
میرا سلام پہنچا دینا اور کہنا کہ میں کبھی عنقریب آتا ہوں"
یہ سن کر بہادر جانباز جوش میں بھر گیا دشمنوں کی فوج میں گھس گیا اور
قتل ہوا۔

جون ابوذر غفاری کے حبشی غلام تھے۔ امام نے ان سے فرمایا کہ تمہیں
میں خصوصیت سے اجازت دیتا ہوں کہ تم چلے جاؤ! اس لئے کہ تم ہمارے
ساتھ راحت کے لئے تھے۔ اب ہمارا وجہ سے کوئی ضرورت نہیں کہ تم مصیبت
میں مبتلا ہو۔

باوفا غلام نے کہا

"بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ راحت کے زمانہ میں تمہیں آپ کے یہاں کے
پیالے چائے اور سختی میں آپ کا ساتھ چھوڑ دوں۔ خدا کی قسم میرے جسم
سے بربود آتی ہے اور میرا حسب و نسب لپیٹ ہے اور میرا رنگ سیاہ ہے۔
آپ اپنے صیغے میں مجھے بھی جنت کا سختی بناؤ رکھو تو میری پوختہ شو ہو جا
میرا حسب و نسب تریف ہو جائے۔ میرا رنگ سفید ہو جائے۔ بخدا میں آپ سے جدا
نہ ہوں گا جب تک یہ سیاہ خون آپ کے پاکیزہ خون میں مل نہ جائے۔"

یہ کہہ کر بہادر غلام میدان جنگ میں آیا اور یہ رجز پڑھنا شروع کی
کیف تری الکفار ضرب الاسبود جالسيف ض جلعن بنی محمد
اذب عنہم جالسلسان و جاليد ارجوبہ الجنة يوم المورس
ذرا کافر دیکھیں تو ایک سیاہ غلام کی تشبیہ تری کو اولاد رسول کی حمایت میں
نہان سے اور ہاتھ سے بلبران کی نصرت کروں گا۔ اور اس سے روز قیامت بہشت
کا امیدوار ہوں۔

جنگ کی اور شہادت حاصل کی۔ امام کے دل میں غلام کے الفاظ اثر کر گئے
تھے۔ آپ لاش پر تشریف لائے اور ہاتھ اٹھا کر یہ دعا کی کہ اللہم بیض جہم
وطیب مریکہ واحشرہ مع الابرار وعرف جینہ و بین محمد و آل محمد
یہ مورد دگار اس کے پیرہ کو روشن کر دے اور اس کی بدلہ کو خوشبو سے مبدل کر دے
اور اسے اچھے آدمیوں کے ساتھ کھنڈور فرما۔ اور اس میں محمد و آل محمد کے درمیان
شنا سانی قرار دے۔

امام زین العابدین کا بیان ہے کہ جب بنی اسد شہداء کو دفن کرنے قتل گاہ
میں آئے تو جون کے جسم سے مشک کی خوشبو آ رہی تھی۔

یہ امام حسین کا غلام تھا اور واضح نام تھا حافظ
غلام تری
قرآن تھا میدان جنگ میں آکر یہ رجز پڑھی۔
البحر من طعنی و ضمہ بنی یسطلی والبحر من سہمی و بنی یسطلی

ان احساساتی پیمیننی نیجالی یینشق قلب الحاسد المجبلی
 "سند میں میرے تیزہ دشمن کی گدھی سے آگ لگ جائے اور نقصا
 میرے تیروں کی پرواز سے مملو ہو جائے۔ جب میرا تلوار میرے ہاتھ میں
 چمکتی ہے۔ مغزور حاسد کا دل شکافتہ ہو جاتا ہے۔"
 یہ غلام جب لڑکھڑا اور زمین پر گرنا تو امام سر بائیں سے اپنا رخسارہ
 اس غلام کے رخسارہ پر رکھ کے گریہ فرماتے لگے۔ غلام نے آنکھ کھولی اور
 امام کی اس نبوت افزائی کا متاثر ہوا، لبوں پر مسکراہٹ آئی اور روح
 جسم سے مفارقت کر گئی۔

یہ صلہ جو امام نے اس غلام کے ساتھ کیا ہے بہت سے عزیزوں کے
 ساتھ بھی نہ کیا ہوگا۔

سب سے آخری شخص
 طبری کی تصریح کے موافق جو شہید ہوئے وہ
 سوید بن عمرو بن ابی المطران حنظلی تھے۔ اہل
 سیر کا بیان ہے کہ سوید نے جنگ کی اور زخمیوں سے جو رہوش ہو کر گرے۔
 یقین کیا گیا کہ وہ ختم ہو گئے۔ مگر ان میں سانس باقی تھی۔ جب امام حسین شہید
 ہو گئے اور یہ آواز بلند ہوئی کہ قتل الحظین۔ سوید کو غش سے
 افادہ ہوا۔ ایک چھری ان کے پاس موجود تھی انھوں نے اس چھری سے
 قریب کے بعض لوگوں پر حملہ کیا اور دشمنوں نے پھر ہجوم کر کے انھیں
 قتل کر دیا۔

دوسرے اصحاب
 حضرت امام عصر عجل اللہ فرجہ کی زیارت ناچیز
 میں اور اس زیارت میں جو اول رجب کے لئے
 وارد ہوئی ہے بہت سے دیگر اصحاب کا تذکرہ ہے اور ان کو سلام مخصوص
 کے ساتھ ممتاز کیا گیا ہے مگر ان کی جنگ کے خصوصی واقعات پورے طور پر
 محفوظ نہیں ہیں۔

ان کے نام اور جہاں تک ان کے متعلق معلومات حاصل ہیں۔ ہم
 ان اہل اللہ اُس حصے میں درج کر رہے ہیں کہ جو اصحاب کے حالات سے مخصوص
 قرار دیا جائے گا۔

مجموعی تعداد
 جہاں تک یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے شہید اُسے
 کہ بلا کی تعداد بحیثیت مجموعی ۲۷ سے زیادہ تھی۔ پچاس
 تو وہی تھے جو حملہ اولیٰ میں شہید ہوئے۔
 ممکن ہے کہ ان کے علاوہ شہداء جو جنگ کر کے شہید ہوئے۔ وہ
 بہتر ہی ہوں۔

مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ میں جہاں تک یقین کے ساتھ کہہ سکتا
 ہوں شہداء کی تعداد سو سے زیادہ اور دوسو سے کم ہے۔ اصحاب میں کچھ
 وہ تھے جو مکہ معظمہ سے ساتھ آئے تھے اور زیادہ تر وہی لوگ تھے جنہوں نے
 کوفہ سے حضرت کو دعوت دی تھی اور جناب مسلم کی بیعت بھی کی تھی اور
 پھر صورت حال کے تبدیل ہو جانے سے وہ کوفہ کے حالات کو قابو میں نہ رکھ سکے
 اور آخر انھوں نے کربلا میں آکر اپنی جان نثار کی اور اسی لئے میں کوفہ والوں
 کی وفاداری کو سید الشہداء کے معاملہ میں ہرگز متشوکت نظر سے نہیں دیکھتا
 ہوں۔ کوفہ کے وہ جاں نثار اور بہادر جو درحقیقت سید الشہداء کو بلوانے
 والے تھے ان میں سے جو جو پہنچ سکے وہ کربلا پہنچے اور اپنی جان کی نذر پیش
 کی۔ میں نے "قاتلان حسین کا مذہب" میں بھی اس پر تبصرہ کیا ہے اور
 حالات اصحاب میں بھی اس پر روشنی ڈالنے کا ارادہ ہے بعض لوگ وہ بھی تھے
 جو کوفہ سے عمر سعد کی فوج میں متریک ہو کر آئے تھے۔ اور جب تک گفتگو سے
 صلح ہوتی رہی وہ فوج عمر سعد میں رہے لیکن جب لڑائی ٹھن گئی اور
 صلح کی امید بالکل قطع ہو گئی تو وہ فوج عمر سعد سے نکل کر امام کی خدمت میں
 آگئے۔ اس کی منہ پور مثال میں صرف حمز بن یزید ریاحی کو پیش کیا جاسکتا ہے

مگر ایسے متعدد آدمی تھے ان کا بھی تذکرہ میں حالات اصحاب کے سلسلے میں کروں گا۔

اصحاب حنین نے جس پر جگر مری، جس جوان مردی جس ثبات و استقلال کے ساتھ جان دی ہے وہ دنیا میں یادگار ہے۔ اس کی قد نام مقرر نے یہ کی کہ زیارت کے سلسلہ میں نام بنام ان پر سلام کیا اور ان سب کو مخاطب کر کے یہ ارشاد فرمایا۔

”یا علی انتہ و امی طبت و طابت الابرار من الی فیہا و انتہ و فرزتہ و اللہ فترتہ اعظیما فی الیٰتی کنت معکم فاخوتہ معکم۔“
”میرے ماں باپ تم پر فلا۔ پاک و پاکیزہ ہوئے تم اور پاک ہوئی وہ زمین جہاں تم دفن ہوئے۔ تم بخدا اعظیم درجہ پر فائز ہوئے بکاش میں بھی تمہارے ساتھ ہوتا اور اسی درجہ پر فائز ہوتا۔“

ہم بھی برابر یہ آرزو کرتے ہیں اور یہی کلمہ زبان پر جاری کرتے ہیں مگر کیا ہم اپنے دل میں وہی جذبہ معرفت و اخلاص و عقیدت و وہی قوت عمل و وہی فرض شناسی بھی پیدا کرنے بلکہ تیار ہیں جو اصحاب حنین میں موجود تھی۔

بہٹاباب

عزیزوں کی باری
شہید اول



شبلیہ پتھری حضرت علی اکبرؑ

اب تک اصحاب تھے جو اپنے امام اور آقا زادوں کی حفاظت کر رہے

تھے انہوں نے دکھلا دیا کہ جب تک وہ زندہ رہے ان میں سے کسی کا بال بھی نہیں ہوا مگر اب؟ اب بس حنین تھے حنین کے فرزند تھے اور حنین کے بھائی بھتیجے تھے میں نے اسوہ حسینی کے سلسلہ میں اس صورت حال کی نزاکت پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ کیا حنین خاص اپنی اولاد کو محفوظ رکھتے اور پہلے بھائی کی اولاد چچا کی اولاد دوسرے سے بیزوں کو گنوا دیتے۔ ہرگز نہیں حنین نے سب سے پہلے اپنے جوان فرزند علی اکبر کو جو پہلو رسول کی تصویر تھا میدان جنگ میں جانے کی اجازت دی۔

امام کے دل پر اس وقت کیا گز رہی تھی۔ اس کو الفاظ سے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ آپ نے اپنے ہاتھ بارگاہ خدا میں بلند کئے اور کہا۔
اللہم اشہد علی ہذا لام القوم
فقد برز الیہم غلاما اثنیہ
الناس خلقا و خلقا و منطقا
برسولہ کذا ان انت قناتہ نبیہ
نظر فالق و جہس۔

خداوند گواہ رہنا ان لوگوں کے ظلم پر
کہ اب جا رہا ہے ان کی طرف وہ جوان
جو صورت و سیرت اور گفتار میں
تیرے رسول کے ساتھ سب سے
زیادہ مشابہ ہے جب ہم تیرے نمبر
کی زیارت کے مشتاق ہوتے تھے
تو اس کا چہرہ دیکھ لیتے تھے۔

علی اکبر میدان جنگ میں آئے اور یہ رجز پڑھنا شروع کیا۔
افاعلی بن حسین بن علی
تا اللہ لا یحکمہ فینا ابن الداعی

میں ہوں علی حسین کا بیٹا اور علی کا پوتا۔ ہم بخدا سب سے زیادہ حقدار ہیں رسولؐ کے پیروں کی قسم ہم ہر کوئی حکومت نہیں کر سکتا۔
یہ رجز نہیں ہے تبلیغی تقریر ہے اس میں اتنے مخمق الفاظ ہیں پورے طور سے اسباب و علل جنگ پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

اس میں اپنی ولایت کا ثبوت پیش کیا گیا ہے اور حکومت وقت کے تسلیم کرنے سے اپنے انکار کو ظاہر کیا گیا ہے۔
طبری نے صرف اتنا لکھا ہے کہ علی اکبر نے کئی حملے کئے۔ بجا میں ہے
فلا بد نزول لیا قتل حتی ضیع الناس من کثرة من قتل منهم
علی اکبر نے اتنی جنگ کی کہ دشمن کثرت مقتولین کی وجہ سے چیخ اٹھے۔
اس جنگ میں جوان مجاہد کو زخم بھی آگئے تھے۔ پیاس کا انتہا
بہت بڑھ گیا، اپنے باپ کے پیاس آخری مرحلت کو آئے اور کہا پیاس
نے مجھے مار ڈالا ہے اور لوہے کے بوجھ نے مجھے گرا بنا دیا ہے کیا
بھلا کہیں سے تھوڑا پانی بھی ہو سکے گا۔ جس سے مجھے جنگ کی طاقت پھر
آجاتی: امام کو اپنے فرزند کی اس تمنا کے نہ پورا ہوسکنے کی جلتی بھی

تکلیف نہ ہوتی کم تھی۔
آب نے اپنی انگوٹھی علی اکبر کو دی کہ اسے دہن میں رکھو اور جا کر دوبارہ
جنگ کرو مجھے امید ہے کہ اب کی اپنے جد بزرگوار کے ہاتھ سے ایسے جام سے
سیراب ہو گے جس کے بعد کبھی پیاس محسوس نہ ہوگی۔

علی اکبر دوبارہ میدان میں آئے۔ رجز بڑھا حملہ کیا اور پھر بہت
سے سپاہیوں کو قتل کیا۔ مرثیہ بن منقذ بن نعمان عبیدی نے کہا "اگر اب
کی مرتبہ اس جوان نے حملہ کیا اور میری طرف سے گزرتا تو میں ابھی اس کے
باپ کو اس کے غم میں مبتلا کر دوں گا" ایسا ہی ہوا۔

علی اکبر نے جب حملہ کیا مرہ پیاس آیا اور نیزہ سینہ پر لگایا علی اکبر گھوڑے
سے زمین پر گر گئے اور دشمنوں نے گدہ ہجوم کہ کے تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے
کر ڈالا۔

خیمہ چینی میں اس حادثہ نے تہلکہ ڈال دیا۔ مگر امام کا استقلال دیکھنے کے
قابل تھا، انھوں نے بس اتنا کہا کہ:

قتل اللہ فوما قتلک یا نبی
ما اجر اھم علی الرحمن وعلی
رسولہ وعلی انتھا وحرمتہ
الرسول علی الدنیا بعدک العفا۔
خدا فنا کر دے اس جماعت کو جس نے
مجھے قتل کیا ہے میرے فرزند کتنی
ہمتیں بڑھ گئیں ان لوگوں کی خدا
اور اس کے رسول کے مقابلے میں!
تیرے بعد دنیا کی زندگی پر خاک ہے۔

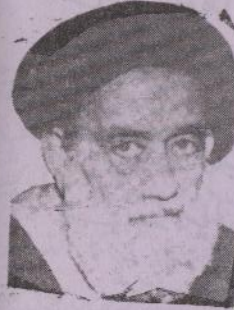
مگر سب سے زیادہ تکلیف وہ آخرت میں کے لئے اس وقت اہل حرم
کا اضطراب تھا، زینب وہ زینب جن کی نسبت مشہور ہے کہ علی اکبر کی
پرورش بھی انھوں نے ہی کی تھی۔ اس وقت مضطرب ہو کر علی اکبر کی لاش
پر آگئی تھیں اور کہہ رہی تھیں :-

"یا حبیبیہ یا تمرة فواد یا نور عیناہ"
آتے ہی دادہ لاش علی اکبر سے لپٹ گئیں حسین آئے اور ان کا ہاتھ پکڑ کر
سمجھاتے ہوئے خیمہ میں لے گئے۔

دادہ سے استقلال، دادہ سے ثبات قدم۔ اب آپ میدان میں آئے
اور نوز جو انوں سے بنی ہاتھ کے جو اٹھی تک موجود تھے کہا "بڑھو اپنے بھائی
کی لاش اٹھاؤ۔ سب نوجوان آگے بڑھے انھوں نے علی اکبر کی لاش کو
لا کر اس خیمے کے آگے لٹا دیا جو جنگ کے موقع پر بنو ہر کہ سپاہ قرار
دیا گیا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے بچے اس وقت گھبرا کر خیمہ سے باہر آگئے، بے
رحم دشمن کی فوج کو موقع مل گیا۔ عمر بن صبیح صیدائی نے عبداللہ بن مسلم
بن عقیل کو تیر لگایا جو بچہ کی پیشانی کی طرف آیا۔ بچہ نے گھبرا کر اپنا
ہاتھ پیشانی پر رکھ دیا۔ تیر نے ہاتھ کو پیشانی کے ساتھ چھید دیا۔ کسی
دوسرے نے بڑھ کر نیزہ لگایا۔ اور قتل کر دیا۔
دوسرے بعض چھوٹے بچے بھی اسی صورت سے قتل ہوئے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ وحشتیانہ بے رحیمی کے نمونے کہ بلا کے علاوہ کسی واقعے میں پیش آئے ہوں۔



سائلوں کا باب

قاسم بن الحسن کی یادگار شہادت

عین کربلا میں بڑے بڑے اہم اسلامی فریقوں کے عملی نمونے پیش کر رہے تھے انھوں نے اس وقت عبادت کے لئے ایک متب کی مہلت مانگی جب کسی اور کو عبادت کا خیال نہ آسکتا تھا۔ انھوں نے اس قیدل تعداد میں نماز خوف کے اصول پر عمل کر کے دکھلایا۔ جب کوئی اور اس اصول پر عمل نہیں کر سکتا تھا۔ انھوں نے اس طرح تمام حجّت کے منادوں کے لئے جس طرح کوئی طے کر نہ سکتا تھا انھوں نے ایسے سخت مواقع پر اپنے اصحاب اعزہ اور اہل حرم کے ساتھ حقوق الناس کے حصول کو ملحوظ رکھا جب کوئی ملحوظ نہ رکھ سکتا تھا۔

اسی صورت سے ایک اہم اسلامی فرض یعنی وصیت پر عمل کرنے کی اہمیت کو آپ نے اس طرح دنیا کے سامنے پیش کیا جس طرح کسی دوسرے سے ممکن نہ تھا۔

میں اکثر لکھ چکا ہوں اور پورے طور سے واضح کر چکا ہوں کہ آپ نے معصومین اپنی روزمرہ کی زندگی اور طرز عمل میں اسباب ظاہری کے پابند تھے اور جب تک کوئی خاص سبب اظہار معجزہ و کرامات کی صورت کا

نہ ہو وہ علم باطن کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے اور نہ اس پر عمل کرتے تھے۔ امام حسن اور امام حسین ان دونوں بھائیوں کی محبت آپس میں وسیعی ہی تھی جو دنیا کے بھائیوں کے لئے کامل نمونہ بن سکتی ہے محبت کے کہنتوں میں قوت اولاد کی باہمی شادی سے ہوتی ہے اور بہر حال شادی کے لئے جس طرح کی بھی اخلاقی و روحانی خصوصیتوں کی ضرورت ہے، وہ ایک امام کے تربیت یافتہ فرزند کے واسطے ایک امام کی تربیت یافتہ دختر سے زیادہ نہیں مل سکتی ہو سکتے۔

ایک لڑکے کا باپ اور لڑکی کا چچا اُسے ہر طرح سے آرزو اور تمنا بھی ہوتی ہے کہ وہ لڑکی بڑھتی ہوئی ہونے کے لحاظ سے مثل اس کے اولاد کے تھی دوسری حیثیت سے بھی اس کی لڑکی کے مثل بن جائے۔

یہ اسباب تھے جن کے لحاظ سے امام حسن نے آخری وقت اپنے چھوٹے بھائی امام حسین سے یہ وصیت کی تھی کہ ان کے بڑے فرزند حسن متقی کا عقدہ ان کی بڑی بھتیجی کے ساتھ اور چھوٹے فرزند قاسم کا عقدہ ان کی چھوٹی بھتیجی کے ساتھ کیا جائے۔

امام حسین نے بھی اپنے بھائی کی آخری اس وصیت کو منظور کر لیا تھا اور اس طرح یہ وصیت ان کے لئے نافذ اور واجب العمل ہو گئی تھی۔

فطرت اور طبیعت کے لحاظ سے جب تک غیر معمولی اسباب پیدا نہ ہوں شادی کا زمانہ اس وقت ہے جب پسر و دختر دونوں سرن تیز کو پہنچ جائیں اور بارخ ہو جائیں۔

امام حسن کی وفات کے موقع پر قاسم بہت کم سن تھے اس کے بعد دس برس امام حسین نے مدینہ میں خاموش زندگی بسر کی اور قاسم آپ کی تربیت میں مثل اولاد کے رہے۔ حسن متقی کی عمر اس وقت جوانی کے حدود میں تھی اس لئے ان کی شادی کر دی گئی مگر قاسم کی عمر اس وقت تک تیرہ چودہ سال

سے زیادہ نہیں ہوئی تھی ان اوقات میں ظاہری اسباب کے طائفہ سے شادی کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہونا چاہیے اور وصیت کے نفاذ میں تعجیل کی کوئی ضرورت نہیں اس لئے کہ اس کا موقع آیل ہے اور نہ وقت تنگ ہوا ہے۔

اب وہ موقع آیا کہ جب امام نے سفر عراق کیا۔ تمام مخصوص اعزہ آپ کے ساتھ تھے متعلقین بھی ہمراہ تھے۔ آپ کی صاحبزادیاں جو اکثر مورخین کی تحقیق کی بنا پر چار تھیں ایک بیماری کے سبب سے مدینہ میں چھوڑ دی گئی تھیں لیکن تین آپ کے ساتھ موجود تھیں۔ قاسم بھی آپ کے ہمراہ تھے۔ اولاد کے بعد اگر درجہ ہے تو بھتیجوں کا ہی ہے اور قاسم کا حضرت کم سن اور یتیم ہونے کی بنا پر اس درجہ خیال کرتے تھے کہ اتنا خیال اولاد کا کبھی شاید نہ فرماتے ہوں۔

سلسلہ شہدائے میدان جنگ میں جانے والوں میں طبری وغیرہ کے بیان کے مطابق علی اکبر کے بعد قاسم بن الحسن ہی ہیں۔ قاسم نے امام سے اجازت مانگی اور انتہائی اصرار سے ہند کے ساتھ مانگی علی اکبر کو میدان جنگ بھیجنے میں امام کی جانب سے ذرا بھی توقف نہ ہوا لیکن قاسم کی اجازت پر امام نے اس درجہ نازل فرمایا کہ ظاہری اسباب سے قاسم کو ایسی ہوگی اور وہ محزون و غمگین ہو کر خیمہ کے ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔

مگر امام حسن کے ہاتھ کا ایک لتونید جو بازو پر بطور وصیت نامہ کے بندھا تھا اسے کھول کر پڑھنے کا خیال آیا۔ دل کوڑھ اس ہوئی۔ اس میں آج ہی کے دن کی پیشنگوی تھی اور قاسم کو اپنی جاں نثار کرنے کی ہدایت تھی۔

قاسم کو اس سے بڑی تقویت حاصل ہوئی اور انھوں نے اسی کو اپنے بیچا کی خدمت میں بطور گزارش اجازت پیش کیا جس کے بعد امام کو یقین ہو گیا کہ اب قاسم ٹک نہیں سکتے۔ بیشک اب ظاہری اسباب کی بنا پر

اس وصیت کے نفاذ کا وقت معین ہو گیا تھا۔ جو حضرت امام حسن نے اپنے بھائی کو کی تھی۔

سین اسلامی شریعت کے محافظ تھے اور اسلام میں عقد نکاح کوئی رسمی تقریب نہیں ہے جس میں کسی جشن کی ضرورت ہو اور عیش و عشرت کے ہر گام کا اشتہار ہو۔

شادی ایک آئینی رشتہ ہے جو شرعی قانون کے تحت قائم ہوتا ہے اور جن کے لئے وہ اس وقت ایک فرض کی حیثیت رکھتا تھا جسے ادا کرنا ضروری تھا۔

شادی بیشک عقلی حیثیت سے اپنی مقاصد کے لئے ہے جن کے لئے طرفین کی زندگی کی امید بہت ضروری ہے لیکن ان عقلی مصالح کا لحاظ تو اس وقت سے تعلق رکھتا ہے جب وصیت ہو رہی تھی اور اس وقت ہم نے بتایا کہ اسباب ظاہری کی بنا پر وہ کسی طرح عقل کے خلاف نہیں تھی۔

مگر وصیت ہو چکنے اور اس کے قبول ہونے کے بعد اب اس میں صرف وصیت کے پورا کرنے میں اور اس فرض کو ادا کرنے کا پہلو رہ جاتا ہے جس کے ساتھ کسی عقلی مصلحت کی ضرورت نہیں ہے۔

امام اگر ایسا نہ کرتے تو ایک بہت بڑا اسلامی فریضہ تشنہ عمل رہ جاتا اس لئے امام نے اس لتونید کو دیکھنے کے بعد اب قاسم کو روکنے کا محل لڑنے پایا لیکن آبدیدہ ہو کر یہ فرمایا کہ اچھا تم اپنے والد بزرگوار کی وصیت پر عمل کر دو۔

مگر مجھے تو بھائی کی ایک وصیت ہے اس کو مجھے پورا کرنا چاہیے۔

یہ فرما کر قاسم کا ہاتھ پکڑا اور خیمہ کے اندر لائے۔ تبرکات کے صندوق میں سے بزرگوں کا لباس نکالا اور وہ قاسم کو پہنا کر اس اپنی صاحبزادی کا عفتو قاسم سے منسوب تھیں قاسم کے ساتھ پڑھ دیا۔

یقیناً یہ عقیدہ کوئی تقریب تشریحی کی حیثیت تو رکھتا نہیں تھا اس نے حقیقتہً مصیبت کی عظمت اور اس کی ندرت میں اضافہ کر دیا تھا اور تین ایسے حالات سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں اور اس سے بیوہ حضرت حسن اور زینبہ حضرت سید الشہداء پر جتنا بھی اثر نہ ہوتا تھا جبکہ معلوم تھا کہ جس کی ابھی شادی ہونے ہی ہے وہی ابھی مرنے جاتا ہے۔

یہ عوام کی سخت غلطی اور غفلتوں کی کوتاہی ہے کہ وہ قاسم کو ایک شب کا داماد اور فاطمہ کبریٰ کو ایک شب کی دلہن کہیں اور اسے تکیہ کلام بنا لیں حالانکہ حقیقتاً وہ چند لمحوں کا رشتہ تھا جو دنیا میں موت کے ہاتھوں قطع ہو گیا۔

قاسم کو شہادت کا شوق تھا اس لئے وہ دیر تک ٹھہر نہیں سکتے تھے سب سے رخصت ہوئے اور عروس سے بھی رخصت ہوئے۔

ہو اس وقت اگر بیوہ عروس تھی مگر اسے پہلے سے قاسم کے ساتھ وہ انس و محبت موجود تھی جو ایک گھر میں رہنے والے بچاؤ اور بھائی اور بہن میں کسی کے عالم میں ہونا چاہیے وہ ابھی اپنے بڑے بھائی علی اکبر کو روک چکی تھی اور اب قاسم کو مرنے جاتے دیکھتی تھی اور وہ خود عروسی کے معنی بالکل نہ جانتی ہوتی تھی وہ اپنی ماں اور چچی کو دیکھ رہی تھی کہ وہ کسی خاص طرح قاسم کی موت کو میری بربادی سمجھ رہی ہیں اور اس پر رورہی ہیں اور اس لئے جو کچھ بھی صدمہ و اندوہ اس کم سن صاحبزادی کو ہوتا وہ کم تھا۔

لیکن قاسم پر ان باتوں کا کوئی خاص اثر نہ تھا انھیں جنگ کا خیال تھا اور اسی کا حوصلہ بنی ہائیم کے بچے تلواروں سے کھیل کر بڑے ہوتے ہیں۔ چھین میں انسان جس چیز کی طرف بھی متوجہ ہو اس کا خیال بہت قوی ہوتا ہے۔ قاسم احساس کر رہے تھے کہ میرے بڑے بھائی علی اکبر نے بھی اپنی شجرت کے جوہر دکھائے ہیں اور مجھے بھی اپنی شجرت کا جوہر دکھانا چاہیے وہ اس کا تصور یہ کرنے کہتے ہیں کہ میں کس ہوں اس لئے بھائی کا میرا کوئی مقابلہ نہیں بلکہ وہ بڑی مستعدی اور ولولہ سے یہی سوچتے ہوں گے۔

کہ جو بھائی نے کیا اتنا ہی میں بھی کموں۔ اور ان سے کم نہ ہوں۔ اس کے علاوہ اس لشکر نے میرے بھائی کو قتل کر دیا پھر مجھے ان کے خون کا انتقام لینا چاہیے۔

میرے بابا نے اسی موقع کی تو مصیبت کی تھی۔ پھر مجھے اپنے باپ کی روح کو بھی تو خوش کرنا ہے۔

بچے ام سے نادر اور غیر معمولی مواقع سے نکلیں ہونے کے بجائے لذت اندوز ہوتے ہیں، قاسم سمجھ رہے تھے کہ اس وقت مجھے دوسری عورت حاصل ہو گئی امام نے مجھے اپنا داماد بنا لیا مجھے اپنے ہاتھ سے کپڑے پہنائے ہیں مجھے اس وقت پورے طور سے حق شجاعت ادا کرنا چاہیے تاکہ لوگ یہ نہ کہیں کہ چھوٹا بھائی بڑے بھائی سے کم نہیں رہا۔

یہ تمام خیالات ہوں گے جن کی بنا پر قاسم کے دل پر نہ تو ماں بھو بھی اور دوسرے اہل حرم کے رونے کا اثر ہوا۔ نہ عروس کے صدمہ کی طرف کوئی توجہ ہوئی وہ رخصت ہوئے اور سب سے رخصت ہو کر باہر تہجج کی خدمت میں گئے کہ اب تو کوئی انتظار نہیں رہا۔ اب تو مجھے اجازت میدان کارزار کی دیجئے۔ امام نے شاید بھائی کو یاد کر کے اس وقت بہت گریہ فرمایا۔ قاسم کے عمامہ کو اپنے ہاتھ سے باندھا اور اس کے دونوں گوشے سینے پر لٹکا دیئے ان کے پیراہن کو بصورت کفن چاک کر دیا۔

قاسم میدان جنگ میں آئے۔ چہرہ مثل ماہ شب چہارہ کے تھا اور یہ رجز پڑھنے لگے۔

ان تشرکتی فان ابن الحسن سبط النبی المصطفیٰ والمرتضیٰ
 ہذا حسین کا لاسی المرتضیٰ بین اناس لاسقوا صوب المزن
 اگر تم مجھے نہیں جانتے۔ تو اب معلوم کر لو کہ میں حسن کا فرزند ہوں اور پیغمبر کی اولاد میں ہوں۔ کیا غضب کی بات ہے کہ یہ حسین تمہارے درمیان مثل تین کی

کے کھو رہے ہو گئے ہیں۔ خدا کہے۔ ابر باراں اس جماعت کو سیراب کبھی نہ کرے۔
قاسم نے اپنی عمر کے لحاظ سے پیر معمولی خونریز جنگ کی۔

آخر کار دشمنوں کے ہاتھ سے زخمی ہو کر گئے اور ایسے چچا کو مدد کے
لئے آواز دی حسین کو اپنے بھتیجے کی مدد کے لئے پہنچنا تھا انھوں نے
غضبناک شیر کی طرح حملہ کیا اور فرزند رسولؐ کے حملہ سے فوج میں لہلہ
پڑ گیا۔ انیسویں ہے کہ اس ہنگامہ میں قاسمؓ کی لاش کو نہایت مصیبت ناک صدمہ
پہنچ گیا۔ آخر فوج منتشر ہوئی اور امام لاش قاسمؓ پر پہنچے۔

انتہائی غم و اندوہ کے ساتھ قاسمؓ کی لاش کو بھی لاکڑا اسی جگہ لٹایا
جہاں علیؑ کی لاش پہلے سے موجود تھی۔ یہ شادی وہ تھی جس سے
قاسمؓ کی شہادت نے ایک مخصوص یادگار حیثیت اختیار کر لی اور جس کو
سوز گہ حضرت جاویدم حرم کو ارشاد فرمایا پڑا۔

دو گھروں کی ان کے جانے سے بربادی ہوئی
حضرت قاسمؓ کی شادی بھی عجب شادی ہوئی



آٹھواں باب شہداء بنی ہاشم کی تفصیل

بنی ہاشم کے شہداء میں بھی قابل ترتیب قائم کرنا بہت مشکل ہے
جہاں تک کہ معلوم ہوتا ہے اصحاب کی شہادت کے بعد سب سے پہلے حضرت
علیؑ اکبرؑ شہید ہوئے۔ آپ کی شہادت سے ہاشمی لوجواؤں میں ایک خاص
ہوش پیدا ہو گیا تھا اور انھوں نے بوقت واحد حملہ کر دیا اور اولادِ مسلم چھوڑ

میں سے چند بہادر اس وقت قتل ہو گئے۔ پھر قاسم بن الحسن کی شہادت ہوئی
اور سب سے آخر میں اولادِ علی بن ابی طالب یعنی برادران حضرت سید الشہداء
سلام اللہ علیہم جن میں سب سے آخری شہید حضرت ابوالفضل العباسؑ ہیں
اور آپ کے اور برجاہدین کا خاتمہ ہو گیا ہے۔

پھر حضرت سید الشہداء نے جہاد کیا اور آپ کی شہادت ہوئی۔

اس لحاظ سے اس باب کو ہمیں حضرت قاسمؓ کی شہادت کے پہلے قائم کرنا
چاہیے تھا لیکن چونکہ بہر حال یہ باب غیر مرتب حیثیت رکھتا ہے اس لئے جہاں
تک مستند لفظ سے شہداء بنی ہاشم کے اسماء مل سکے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔
اولادِ مسلم و عقیل (۱) عبداللہ بن مسلم بن عقیل۔ سابق میں حضرت
علیؑ اکبرؑ کی شہادت کے بعد اس بچے کی شہادت کا تذکرہ ہو چکا۔ اس سے معلوم
ہوتا ہے کہ وہ کسن تھے اور بغیر جنگ کے شہید ہوئے مگر بحار میں ان کی ہجرت اور
جنگ موجود ہے مگر میرے خیال میں پہلی روایت درست ہے۔

(۲) محمد بن مسلم بن عقیل۔ البصائر العین فی انصار الحسن میں ہے کہ

حملہ بنو ابی طالب بعد قتل عبداللہ عبداللہ کے قتل ہونے کے بعد ابوطالب
جملة واحدة فصاح بھم الحسن کی اولاد نے ایک ساتھ حملہ کر دیا امام
صبرا علی الموت یا بنی عمومتی وقع فیہم نے آواز دی ہاں میرے چچا کے فرزندو
محمد بن مسلم قتلہ ابو مرہم موت کے مرحلہ کو سر کر دو جینا پچھ ان میں
اکثر آدمی ولقیط بن ایاس الجھنی۔ سے محمد بن مسلم شہید ہو کر گئے۔

ان کو ابو مرہم نے دیا اور لقیط بن ایاس جہنمی نے قتل کیا۔

(۳) عبدالرحمن بن عقیل۔ ابن شہر آشوب کا بیان ہے۔

تقدرو فی حملة ال ابی طالب بعد اہل القصاص وھول لقیول۔

وہ آل ابوطالب وائے حملہ میں جو انصار کے بعد تھا بڑھے اور یہ کہہ
رہے تھے۔

”میرے باپ عقیل ہیں۔ تم کو جو میری قرابت ہے، ہاشم سے اس کو جاننا چاہیے اور معلوم ہونا چاہیے کہ تمام سنی ہاشم میرے بھائی ہیں۔“
اس کے بعد جنگ کی اور سترہ آدمی قتل کئے پھر دشمنوں نے گھیر کر ان کو قتل کیا ان کے قاتل عثمان بن خالد بن اشیم جہنی اور بشر بن حوط سہمیانی تھے۔“

(۶) یعقوب بن عقیل بن ابی طالب۔ انھوں نے آگے بڑھ کر حملہ کیا اور وہ یہ رجز پڑھا ہے تھے۔
انا الغلام الا بطحی الطالبی من معشر فی ہاشم من غالب
و نحن حقاً ساداتہ الذوات

میں مکہ کا رہنے والا طالب کے خاندان کا ہاشم کی نسل سے اور غالب کے گھرانے سے ہوں۔ یقیناً ہم ہی تمام قبائل کے سردار ہیں۔“
پندرہ آدمی فوج کے قتل کئے اور بشر بن حوط کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔

اولاد جعفر (۱) عون۔ (۲) محمد فرزند ان عبد اللہ بن جعفر۔ ان دونوں مجاہدوں کی نسبت مرثیہ نگاروں میں اور ان کی وجہ سے عام اشخاص میں یہ روایت مشہرت پائی ہے کہ یہ دونوں حضرت زینب سلام اللہ علیہما کے فرزند امام حسین کے بھانجے تھے۔

اس کے برخلاف اہل علم کی زبان سے اکثر یہ سنا گیا اور خواص کے طبقہ میں یہ شہور ہو گیا کہ یہ روایت بالکل غلط ہے اور یہ دونوں حضرت عبد اللہ بن جعفر کے صاحبزادے تھے مگر جناب زینب کے بطن سے نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں روایتیں درست نہیں ہیں۔ حقیقت محمد بن جعفر زینب کے بطن سے نہیں تھے۔ ان کی والدہ کا نام تھا خواص بنت حفصہ بن لقیف بن ربیعہ بن عائد بن ثعلبہ بن حکابتہ بن صعصعہ بن علی بن بکر بن

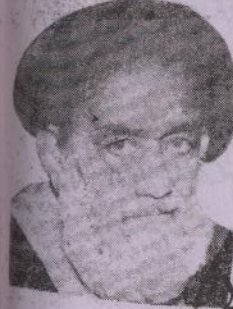
واہل خواص کی ماں تھیں ہند بنت سالم بن عبد العزیز بن محرم بن سنان بن مولتہ بن عامر بن مالک بن تیم اللات ابن ثعلبہ ہند کی ماں تھیں۔ میمونہ بنت بشر بن عمرو بن حادث بن ذہل بن سہیبان۔

مگر عون جناب زینب ہی کے بطن سے تھے۔ بیشک ان دونوں صاحبزادوں کی نسبت مرثیہ گوئیوں کی یہ روایت کہ وہ بہت کم سن تھے۔ درست نہیں معلوم ہوتی۔ اگرچہ ان کے سن کے متعلق کوئی قطع حد بندی نہیں کی جاسکتی مگر اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جوانی کے حدود میں تھے اور جناب قاسم کی طرح سے کم سن نہیں تھے۔ روز عاشورا پہلے محمد میدان جنگ میں گئے تھے۔ انھوں نے یہ رجز پڑھا۔

استکوا لی اللہ من العدا وان فعال قوم فی الزمان
قد بدوا معالم القس ان ومحکم التنزیل والتبیان
”خدا سے شکوہ کہتا ہوں دشمنوں کے ظلم و جفا کا۔ اس قوم کے افعال کا جو اندھی بنی ہوئی ہلاکت میں جا رہا ہے۔ انھوں نے قرآن کے نمایاں حکام کو بدل دیا اور کھلی ہوئی قرآنی آیتوں میں تبدیلی کی جنگ کی اور دس آدمی قتل کئے آخر عامر بن نہشل تمیمی کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔“

ان کے بعد عون بن عبد اللہ میدان میں آئے ان کا رجز یہ تھا۔
ان تنکروا و ان فانا ابن جعفر شہید صدق فی الحنان از مر
بطین فیہا بجناح اخضر کفی بھد اشرفانی المہشم
اگر مجھے نہ جانتے ہو تو لیجان لو کہ میں جعفر کی اولاد ہوں۔ وہ جعفر جو حق کے راستہ میں شہید ہوئے جن کو خدا نے بہشت میں یاں دیے عطا فرمائے کہ وہ مثل ملائکہ کے پرواز کریں۔ ان کے شرف کے لئے اتنا بہت کافی ہے۔
میں۔ اور اور اٹھا رہے پیارے قتل کرنے کے بعد عبد اللہ بن قطنہ طائی

کی تلوار سے درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔
 بعض کتب میں عون و محمد فرزندان جعفر کی شہادت بھی کہ بلا میں
 مذکور ہے لیکن یہ درست نہیں ہے۔ حقیقتہً عون اور محمد عبداللہ بن جعفر
 ہی کے فرزند تھے جو کہ بلا میں شہید ہوئے۔ لیکن محمد بن
 کے چچا تھے وہ کہ بلا سے بہت قبل جنگ صفین میں اور عون اس کے
 بھی پہلے قتل ہو چکے تھے۔



لواں باب

قس بنی ہاشم اور ان کے بھائی

چار فرزند امیر المؤمنین کے ام البنین فاطمہ بنت خزام کے بطن سے
 تھے (۱) حضرت عباس بن علی جو ان میں سب سے بڑے تھے۔
 (۲) عبداللہ بن علی بن ابی طالب۔

(۳) عثمان بن علی بن ابی طالب

(۴) جعفر بن علی بن ابی طالب جو سب میں چھوٹے تھے۔
 ان تینوں مؤخر الذکر بھائیوں کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ روز عاشور
 حالت یہ تھی کہ ہر شخص اپنے سے وابستہ انسان کو خود اپنے سامنے میدان
 میں بھیجتا تھا اور اسے بطور تحفہ اپنے ہاتھ سے پیش کرتا تھا پھر خود آگے
 بڑھ کر جان دے دیتا تھا۔

عباس بن ابی شیبہ کے واقعہ میں اس کی مثال دیکھ چکے اور ان کے
 الفاظ بھی نہ لیجئے جو کہ انھوں نے اپنے غلام شوزب سے کہے تھے

”میں چاہتا ہوں تمہاری مصیبت کو اٹھا کر اجر و ثواب کا مستحق بن
 لوں پھر خود میدان جنگ میں جاؤں“
 خود حضرت سید الشہداء نے یہی کیا کہ جب تک کوئی بھی ایسا رہا جو
 آپ کے سامنے شہید ہو اس وقت تک آپ نے خود اپنی جان نہیں دی۔
 اس پر مفصل طور سے ہم نے ”تین اور اسلام“ میں تبصرہ کیا ہے۔
 جناب عباس نے بھی اسی طرح روز عاشور اپنے بھائیوں کو یکے بعد
 دیگرے بلا یا اور ایک ایک کو جنگ کے لئے بھیجا۔

سب سے پہلے آپ نے عبداللہ کو بلا یا جو آپ کے بعد دوسرے
 بھائیوں میں سب سے بڑے تھے فرمایا۔

تقدّمہ چنانچہ حتیٰ امرای قتیلا و احسبک فانتہ لاولدک
 بڑھو بھائی آگے بڑھو تاکہ میں تمہیں قتل ہوتے اپنی آنکھ سے لوں
 اور اپنے لئے سامان آخرت سمجھوں۔ کیونکہ تمہارے لڑکوں کو اولاد ہی نہیں“

ہمارے بیان کے ہوئے نظام اور صورت واقعہ کو دیکھتے ہوئے
 اس آخری ٹکڑے کے معنی یہ ہیں کہ اگر تمہارے اولاد ہوتی تو تم اس کا
 انتظار کرتے کہ اپنے پہلے بیٹے کو اپنے سامنے قتل ہونے دے پھر خود جا
 مگر تمہارے کوئی اولاد تو ہے نہیں جس کے لئے تم انتظار کرو تو جاؤ خود ہی جاؤ
 میدان جنگ میں“

انتہائی کم عقلی سے کام لیا ہے جن لوگوں نے تمہارے کوئی اولاد نہیں
 ہے“ کے فقرہ کے معنی قرار دیئے ہیں کہ تم پہلے قتل ہو جاؤ تاکہ میں تمہارا
 میراث حاصل کروں اور اس کو اپنی اولاد کے لئے بطور مہر و کہ چھوڑ جاؤں“
 اس خود غرضی کی نسبت حضرت عباس کی طرف وہی دے سکتا ہے جو
 آپ کے مرتب سے واقعہ نہ ہوا دیکھ جب کہ الفاظ سے بھی اس کا کوئی تعلق
 نہیں حتیٰ امرای قتیلا و احسبک“ میں تم کو مقتول رکھیوں

اور اُسے اپنے لئے سببِ اجر سمجھوں۔ اسی کے بعد "فاتحہ کا دل لائی" اس لئے کہ تمہاری کوئی اولاد نہیں۔

میراث ملنے کو گزشتہ کلام سے بھلا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ سمجھنے کی بات ہے کہ اگر معاذ اللہ حضرت عباسؓ کا یہ مقصد ہوتا بھی تو یہ بات کہنے کی نہیں تھی کہ تم کو میں پہلے اس لئے بھیجتا ہوں تاکہ تمہاری میراث کا مالک بنوں۔

انسان کی سمجھ میں جب بات نہ آئے تو کہے نہیں۔ بہر حال یہ خیال بالکل غلط ہے اور حقیقی مفہوم کلام کا وہی ہے جس کا تذکرہ کیا گیا۔ عبداللہ میدان میں آئے اور جنگ کرنے کے بعد ہانی بن شہیدیت حضرت کی تلوار سے شہید ہوئے۔

اب جناب عباسؓ دوسرے بھائی عثمانؓ کی جانب متوجہ ہوئے اور انھیں میدان جنگ میں بھیجا۔ عبداللہ آگے بڑھے اور جنگ کی یہاں تک کہ شہید ہوئے۔

پھر تیسرے سب سے چھوٹے بھائی جعفرؓ کی طرف رخ کیا اور کہا کہ "جاؤ! جیسے تمہارے دونوں بھائیوں کا صدر میں نے برداشت کیا ویسے تمہارا ابھی برداشت کروں کیونکہ تم میں سے کسی کے بھی اولاد نہیں ہے۔"

جعفر نے بھی جہاد کیا اور دوسرے شہادت پر فائز ہوئے۔ اب جس وقت کہ بھائیوں میں بھی کوئی ایسا شخص باقی نہیں رہا جو امام کی نصرت کرے اور بنی ہاشم کے مجاہدین سب تمام ہو گئے لہذا حضرت ابو الفضلؓ عباسؓ امام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جنگ کی اجازت مانگی امام نے اپنے بھائی کو بہت عزت کی نگاہ سے دیکھا اور فرمایا "تم تو میرے علت دار ہو عباسؓ نے عرض کیا "اب مجھ سے ضبط ممکن نہیں اور زندگی سے سیر ہو گیا ہوں" امام نے فرمایا "اچھا ارادہ ہے کہ لیا ہے جنگ کا تو پانی کی فکر کرنا"

عباسؓ اس کے پہلے بھی ایک مرتبہ عاصمؓ کے قبل فرات پر جنگ کر کے پانی لایا تھے اور "سقا" کے لقب کے بھی مستحق ہوئے تھے۔ اس وقت پھر انھوں نے مشک بنی اور دشمن کی فوج پر حملہ کیا۔ اس طرح نہیں کہ گویا انھیں جنگ ہی منظور ہے بلکہ اس طرح جیسے وہ نہر کا راستہ صاف کرنا چاہتے ہیں اور نہر پر جانا منظور ہے۔

علیؓ کے بیٹے کا شیرازی اس کو شمش میں کامیاب ہوا۔ وہ نہر پر پہنچا بھی اور مشک کو پانی سے بھر اٹھی ہمیشہ خود عباسؓ پیاسے تھے اور بہت پیاسے انھوں نے ہاتھ میں پانی کا چلو لیا کہ بیٹے لگہ لگام کی پیاس کا خیال آ گیا تو نہرا چلو ہاتھ سے پھینک دیا اور پیاسے نہر سے نکل آئے۔ بھری ہوئی مشک دوش بہر لئے خیمہ کی جانب روانہ ہو گئے مگر فوج عمر سعدؓ جسے اپنی شکست کا ٹھکانہ بھی تھا اب پورے اجتماع کے ساتھ راہ ہوئی۔ عباسؓ کی آزادی جنگ میں باقی نہ تھی ان کے دوش پر مشک موجود تھی جس کے ساتھ وہ لڑ نہیں سکتے تھے مگر واہ کہ بہادر کہ اس نے اسی عالم میں جنگ کی۔ وہ جوش و خروش سے حملے کر رہے تھے۔ اور ان کی زبان پر یہ شعر تھے۔

لا تهاب الموت اذ الموت فرقاً
حقی ادری فی المصالیت لفق
انی انا العباس اغدو بالمتق
ولا اهاب الموت یوم الملتقی

"میں کبھی موت سے نہیں ڈرتا۔ موت کتنے ہی نعرے لگائے جب تک کہ میں تلواروں کے سایہ میں زمین پر گر نہ جاؤں میں عباسؓ ہوں، مشک لے جاؤں گا اور ضرور لے جاؤں گا اور جنگ کے ہن گام میں موت کی کوئی پرواہ نہ کروں گا۔"

آخر دشمنوں نے احساس کر لیا کہ جب تک عباسؓ کے ہاتھ موجود ہیں کامیابی مشکل ہے حکیم بن طفیل طائیؓ نے کہیں گاہ سے آکر داپنے ہاتھ پر تلوار لگائی۔ عباسؓ کو اپنی جان سے زیادہ علم کا خیال تھا۔ انھوں نے علم کو گرتے نہیں دیا بائیں شانہ پر لیا اور یہ کہا۔

واللہ ان قطعہ یکینی ان احافی ابداعن حینی
خدا کی قسم اگر تم نے میرا ہاتھ قطع کر دیا تو یہ نہ سمجھو کہ میں اب اپنے
دین کی حمایت نہ کروں گا اس فرض کو تو میں ہمیشہ انجام دیتا ہوں۔
زید بن درقاہ جہتی نے بائیں ہاتھ پر بھی تلوار لگائی اور اسے قطع کر دیا
عباس نے علم کو اپنے سینے سے لگایا اس کے ساتھ قبیلہ تمیم کے ایک شخص نے
سر پر ایک گدڑ لگایا جس سے جناب عباس نے زمین پر گرے اور بلند آواز سے پکار
کہ کہا بھائی میری نین لے لیجئے۔

امام پر اس آواز کا کیا اثر ہوا؟ اس کا اظہار غیر ممکن ہے۔

وہ مثل باز شکاری کے جھپٹے اور زخمی بھائی کی لاش پر پہنچے۔ دیکھا
دونوں ہاتھ قطع ہیں۔ پستیانی شکستہ ہے۔ آنکھ پر تیر ہے۔ نہ خون سے چوڑ
ہیں۔ امام جھک گئے اور سر ہانے بیٹھ گئے۔ یہاں تک کہ شیر دل بھائی کی روح
نے جسم سے مفارقت کی اب کوئی اور نہیں تھا جس کا حسین کو سہارا ہو تا وہ
بھائی کی لاش سے اٹھ کھڑے ہوئے اور آگے بڑھے۔ تلوار ہاتھ میں تھی جو کشت و
خروش کا عالم تھا۔ داہنے اور بائیں دشمن پر حملہ کر رہے تھے۔

اور تاریخ کے الفاظ یہ ہیں۔

یفرؤن بسین ید یہ کما تفر الملحزنی اذا شد الذب
”وہ اس طرح آپ کے سامنے سے بھاگ رہے تھے جیسے بکریاں بھاگتی ہیں
اس وقت جب بھیڑ یا حملہ کرے۔“
اور ما کہہ رہے تھے۔

این تفرؤن وقد قتل تراخی این تفرؤن وقد قتم عسندی
”اب بھاگتے کہاں ہو تم نے میرے بھائی کو تو مار ڈالا۔ بھاگتے کہاں ہو تم نے
میرے ہاتھ کو تو توڑ ڈالا۔“
اس کے بعد آپ اپنی جگہ پر آکر تہنا کھڑے ہو گئے۔

ابصار العین میں صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ
کان العباس آخر من قتل من المحاربین لاعداء الحسين
علیہ السلام ولم یقتل بعد الا الفلحان الصغار من آل
ابی طالب الذین لم یجولوا السلاح
”عباس سب سے آخری شخص تھے جو دشمنان کلام سے جنگ کر کے شہید
ہوئے۔ ان کے اور جو قتل ہوئے وہ چھوٹے چھوٹے بچے آل ابوطالب
میں سے تھے جن کے پاس ہتھیار نہیں تھے۔“



دسواں باب

ششماہنہ بچہ کی عظیم الشان شہادت

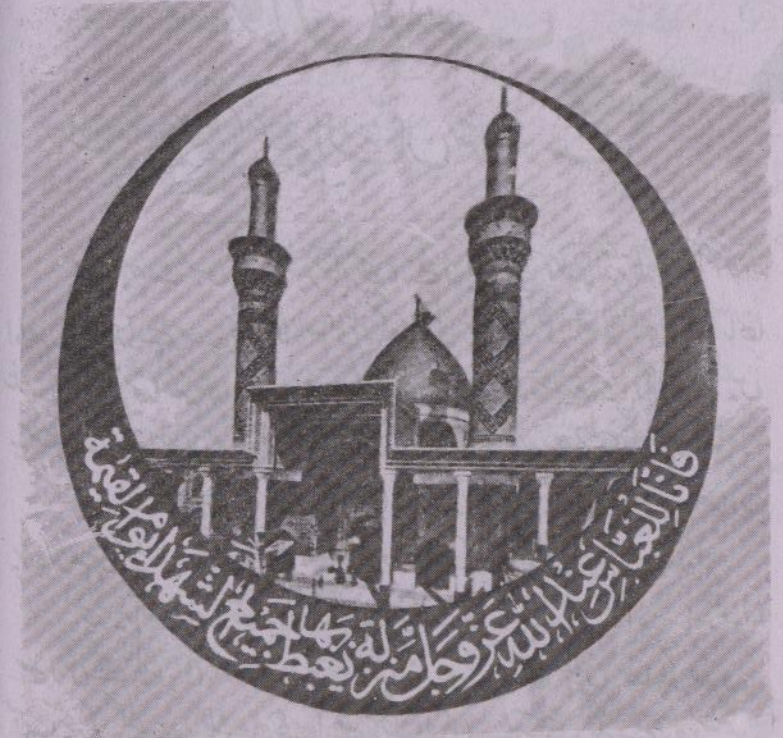
بچہ، بہت کسن بچہ، شیر خوار بچہ، بے زبان بچہ، عبد اللہ نام تھا اور
امام نے چونکہ اپنے سب بچوں کا نام علی رکھا تھا اس لئے علی اصغر کا بھی کہا جاتا تھا
شہید چھوٹا تھا مگر شہادت اس کی اتنی عظیم ہے کہ درحقیقت اگر کہ بلا میں
یہ شہادت واقع نہ ہوتی تو اس کی عظمت میں ایک بہت بڑی کمی ہو جاتی۔

ماں باپ کو چھوٹے بچوں سے انتہائی محبت ہوتی ہے۔ امام جب شہادت
پر عازم ہو گئے تو درخیمہ پر آکر اس بچہ کو دیکھنے کے لئے اہل حرم سے منگوا یا۔

بچہ پیاسا ضرور تھا اور یقیناً بہت پیاسا تھا۔ کہتے ہیں کہ آپ نے دستوں
سے اس کے لئے پانی مانگا۔ تاریخ کا بیان ہے کہ یہ کبھی نہیں تھا بلکہ صرف
آپ بچہ کو گلے سے لٹکائے ہوئے اسے رخصت کر رہے تھے۔ مگر بے رحم دشمن

کو یہ بھی گوارا نہیں ہوا۔
زمین آسمان کانپ گئے۔ انسانیت نے فریاد کی۔ رحمہم علیہ آٹھ آٹھ آنسو
روئی۔

جب حمید بن کاہل اسدی نے تیر جیلہ کمان میں جوڑے اچھے کی گہرں پر لگایا
اور بچے اپنے باپ کے آغوش میں تمام ہو گیا۔
یہ عیشیں کا آخری ہدیہ تھا جو خدا کی بارگاہ میں اس طرح پیش ہوا
اور آج یوں کے لئے صرف اپنی جان کا مرحلہ تھا۔ جس کے طے کرنے کے
لئے وہ بہت پہلے سے تیار تھے۔



محمد وصی خاں صدر مرکزی تنظیم عزا (رجسٹرڈ)
نے اپنی تصنیف کردہ کتاب سید العلماء کی
خدمت میں پیش کی جس کو سرکار دیکھ رہے ہیں۔



شہید کربلا کی خاندانی خصوصیات اور فداکارانہ روایت

یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے حضرت ابراہیم خلیل سے آپ یلین الاقوامی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی یہود و نصاریٰ اور مسلمان سب آپ کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس لئے حضرت سید الشہداء کے نسبى خصوصیات کو آپ کے تقاروف کے لئے یہیں سے شروع کرنا مناسب ہے، اور پھر قربانی کا سلسلہ بھی یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت ابراہیم کی ذات کو اسلام کا مورث اعلیٰ بھی سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ آپ ہی نے اس جماعت کا جو راہ حق میں ان کے پیچھے آئے سب سے پہلے "مسلم" نام رکھا۔ قرآن مجید میں ان کی تصریح موجود ہے۔ ہوسمما کہہ المسلمین من قبل اور ان کی دعا بھی بارگاہ الہی میں مذکور ہے۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مسلمانين لك ومن ذریتنا امة مسلمة لك۔

حضرت ابراہیم کے دو بیٹے تھے۔ اسحاق اور اسمعیل۔ اسحاق سلسلہ انبیاء سے بنی اسرائیل کے مورث اعلیٰ ہیں اور اسمعیل ہمارے رسول محمد مصطفیٰ صلعم کے دادا ہیں۔ یہیں سے ہمارے رسول کا خاندان نثریت دوسرے سلسلے سے الگ ہوا۔ آپ کو معلوم ہے کہ کچھ خاص داخلی اسباب

کے ماتحت حضرت ابراہیم نے اپنے فرزند اسمعیل کو شیر خوارگی کے عالم میں ان کی ماں ہاجرہ کے ساتھ مکہ کی سرزمین پر پہنچا دیا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں خانہ کعبہ ہے اس خانہ کعبہ کی تعمیر ان ہی باپ بیٹے ابراہیم اور اسمعیل نے کی۔

خانہ کعبہ بن کر تیار ہوا۔ اور تمام اطراف ملک کے لوگوں کا نقطہ اجتماع بن گیا۔ یہاں ہر کنزیت شروع ہوئی آل ابراہیم کی یہی خانہ کعبہ کے بانی یہی خانہ کعبہ کے محافظ۔ اور کعبہ کیا؟ تمام قبائل عرب کا مرکز۔ قدرت نے ان باپ بیٹوں کا امتحان لینا چاہا۔ باپ مامولہ ہو گیا کیسے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرے۔ یہی وہ ہے جس کی یادگار عید قربان میں آج تک قائم کی جاتی ہے۔

گو یا اس سلسلہ شرافت کا آغاز ہی نفس کی قربانی سے ہوا۔ آگے بڑھے سلسلہ پہنچا نضر بن کنانہ تک، ان کی اولاد قریش کہلائی۔ جس طرح تمام دنیا میں آل ابراہیم کو خاص امتیازات حاصل ہوئے۔ آل ابراہیم میں اولاد اسمعیل خاص خصوصیات کی حامل ہوئی۔ اب اولاد اسمعیل میں قبیلہ قریش کو امتیازی خصوصیات حاصل ہوئے۔ خانہ کعبہ کی ذمہ داری، اس کی حفاظت سقایت اور تولیت سب قریش سے مخصوص تھیں، تمام عرب ان کی عزت کرتے تھے۔

قریش میں ہاشم پیدا ہوئے جو تمام خصوصیات کے حامل بنے، یہاں سے

بنی اُمیہ کی شاخ الگ تھی ان کے مورث اعلیٰ نے ہاشم سے منازعت کی، مگر شکست کھائی نتیجہ یہ ہوا کہ خانہ کعبہ کے حقوق کو لیت، سقایت اور تمام انتظامات ہاشم کے پاس رہے اور بنی اُمیہ اس سے محروم ہو گئے۔ اس طرح آل ہاشم کا امتیاز آل اُمیہ کے مقابلہ میں تسلیم ہو گیا۔

ہاشم کے فرزند عبدالمطلب بڑی بلند شخصیت رکھتے تھے یہ لایطحا ان کا خطاب ہوا اور یہی لقب ہے جو انکی اولاد میں رہ گیا۔ جس سے آج تک آل رسول سادات کہلاتے ہیں، ان کا اعتماد، توکل اور خدا پر بھروسہ اس وقت پورے طور پر ظاہر ہوا۔ جب امہ ہر نے یمن سے آکر کعبہ پر حملہ کیا، یہ اصحاب الفیل کا مشہور واقعہ ہے۔ اس وقت عبدالمطلب بارگاہ الہی میں دست دعا بلند کئے ہوئے تھے۔ نتیجہ معلوم ہے کہ خدائی لشکر نے اصحاب الفیل کو برباد کر دیا۔ یہ تھے عبدالمطلب جو محافظ حرم بھی تھے اور محافظ حرم ثابت بھی ہوئے۔

عبدالمطلب کے کئی بیٹے تھے، جن میں سے دو عبد اللہ اور ابو طالب تھے۔ عبد اللہ نے اسمعیل کا درجہ حاصل کر کے ذبیح کا لقب لیا یعنی ان کو عبدالمطلب نے رضائے الہی کے لئے قربانی کے محل پر پیش کیا تھا۔ اور وہ بھی فدیہ پاکر محفوظ ہوئے۔ مگر ان کا انتقال باپ کے سہنے ہو گیا۔ اس لئے عبدالمطلب کے تمام امتیازات ابو طالب کو حاصل ہوئے، ابو طالب شیخ الخطا اور سردار قریش مشہور ہوئے۔ دیکھئے وہ خصوصیات جو بکھرے ہوئے تھے کس طرح سمٹے آتے ہیں۔ ایک نقطہ یہ ابو طالب حاصل ہوئے تمام موارد انبیاء تمام امانتوں کے جو ابراہیم کی چھوڑی ہوئی تھیں جو اسمعیل کی متروکہ تھیں، اور سب بڑی امانت وہ رسول کی ذات تھی اس طرح جتنی امانتیں رسول کی ذات سے متعلق سمجھی جاسکتی ہیں ان سب کی حفاظت قدرت کی جانب سے ابو طالب کے متعلق ہوئیں۔ تاریخیں بتلاتی

ہیں کہ ابو طالب نے کس شان سے امانت داری کے فرض کو انجام دیا۔ اب آپ دیکھیں کہ یہ زمین مشرف کس آسمان پر پہنچتی ہے۔ آل ابراہیم آل اسمعیل نسل قریش، آل ہاشم کی جتنی عورتیں تھیں وہ ایک امر کنیز پر طواف کر رہی ہیں ابو طالب نے حضرت محمد مصطفیٰ کی پرورش میں جان کو جان سمجھا۔ انھوں نے اپنی اولاد کو رسول پر جان نزاری کی مشق کرائی۔ اس وقت جب یہ لوگ مشعب ابی طالب میں محصور تھے تو اس خیال سے کہ ہمیں دشمن شب کو اچانک حملہ کر کے حضرت محمد مصطفیٰ کو قتل نہ کر دے۔ ابو طالب آپ کو ایک بستر بہرہ دے نہ دیتے تھے بلکہ اپنی اولاد کو بار بار رکا رکا آپ کے بستر پر لٹاتے تھے اور آپ کو ان کے بستر پر منتقل کر دیتے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ محمد کے بدلے جو بھی میرا فرزند قتل ہو جائے کوئی پرواہ نہیں! مگر رسول کی جان بچ جائے۔ اس ذوق قربانی کو بھی یاد رکھئے گا۔ یہ بھی کس کی خاطر ہے چاہے کہیئے محمد کی خاطر اور چاہے کہیئے اسلام کی خاطر! ابو طالب کی آنکوش میں حضرت محمد مصطفیٰ کی جب تربیت ہو رہی تھی۔ ابھی آپ کی عمر نہ جوانی ہی کی منزل میں تھی کہ آپ کی سچائی اور امانت داری کو تمام عربوں نے تسلیم کر لیا اور آپ کو صادق اور امین کا لقب دیا یہاں تک کہ بہنی امانتیں آپ کے پاس رکھوانا شروع کیں، اس کے علاوہ اہم معاملات میں آپ کے تصفیہ کو قابل قبول سمجھا۔ خانہ کعبہ کی مرمت کے موقع پر حجر انود کے رکھے جانے کا قصہ مشہور ہے۔ محمد مصطفیٰ کی عمر ۳۰ برس کی تھی اس وقت ابو طالب کے یہاں وہ فرزند پیدا ہوا جس کا نام تھا علی! محمد مصطفیٰ نے علیؑ کی پرورش اپنے متعلق کر لی۔ اب علیؑ محمدؐ کے آنکوش تربیت میں تھے۔ وہ دس برس کے تھے جب حضرت محمد مصطفیٰ اس پیغام کے پہنچانے پر مامور ہوئے جس کا نام ہے اسلام! یہ پوچھنا صورت واقعہ کے لحاظ سے اصول فطرت

کے خلاف ہے کہ علیؑ نے اس پیغام کو کب قبول کیا؟ وہ رسول کے ہر وقت ساتھ تھے اور آپ ہی کی تربیت میں تھے اس لئے ہر ہر وقت جو رسول کا راستہ تھا وہ علیؑ کا تھا۔ عمر کے لحاظ سے ابھی علیؑ بچہ ہی تھے۔ اور تربیت سے بے نیاز نہیں تھے۔ اس لئے مجھے کہنے دیجئے کہ رسول کی آنکھ میں دو چیزیں پرورش پا رہی تھیں ایک اسلام اور دوسرے علیؑ۔ علیؑ اور اسلام میں وہی بستگی تھی جو ایک آنکھ میں رہنے والے دو بچوں میں آہیں میں ہوتی ہے۔

رسولؐ کو اپنے پیغام کی اشاعت میں بڑی تکلیفیں دی گئیں۔ کوڑا کرکٹ سر پر پھینکا گیا، سچے رسول سے جسم جرح کیا گیا۔ ان سب کو آپ نے گوارہ کیا۔ کابے کے لئے اسلام کی خاطر۔ آنحضرتؐ کے قتل پر آمادہ ہو گئے اور ایک ہوا گیا کہ رات کے وقت آپ کو قتل کر ڈالیں گے۔ رسولؐ نے طے کر لیا کہ وہ اپنے مقاصد کی حفاظت کے لئے مکہ معظمہ کی سہ ذمہ میں کو چھوڑ دیں اور مخفی طور سے رات کے وقت نکل کر مدینہ چلے جائیں۔ اسی کا نام ہے ہجرت۔ اس موقع پر آپ نے اپنے چچا زاد بھائی علی بن ابی طالب کو مقرر کیا کہ وہ آپ کے بستر پر آپ کی چادر اوڑھ کر سو رہیں۔ علیؑ بستر رسول پر سو رہے۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ کھینچ ہوئی تلواریں دشمنوں کی ارد گرد موجود تھیں۔ سب قتل ہی کے ارادے سے آئے تھے، یہ تو اتفاق کی بات ہے اور قدرت کا انتظام ہے کہ علیؑ کی جان بچ گئی ورنہ سامان قتل مکمل تھا اور علیؑ اپنی جان دے چکے تھے۔ یہ کس کی خاطر۔! رسول کی ایک بیٹی تھیں فاطمہ زہراؑ۔ جنھیں آپ بہت عزیز رکھتے تھے۔ ہجرت کے دوسرے سال آپ نے اس بیٹی کا عقد علی بن ابی طالب کے ساتھ کر دیا۔ اب آپ جانتے ہیں فاطمہ کون ہیں؟ دختر داعیؑ اسلام، دختر پیغمبر اسلام، اور علیؑ کون ہیں؟ محافظ اسلام، تجاہد اسلام

فخریہ اسلام! ان ہی دونوں علیؑ اور فاطمہؑ کے فرزند تھے حسین! اب کیا حسینؑ مٹھا سکتے تھے اپنے خاندانی خصوصیات اور قدیم روایات کو؟ حسینؑ نے دیکھا نہیں مگر کانوں سے تو سنتے رہے کہ ہمارے مورث اعلیٰ ابراہیمؑ خدا کی رضا کے لئے بیٹے کے ذبح پر تیار ہو گئے ہمارے پر دادا عبدالمطلب نے اپنے بیٹے عبداللہؑ کو قربان گاہ عبودیت میں پیش کیا۔ حسینؑ نے سنا کہ پیغمبر اسلام کے سینہ سپر رہے۔ میرے دادا ابوطالبؑ کبھی اسی اسلام کے لئے بہتر کھائے، میرے نانا رسول اللہؐ نے! حسینؑ نے سنا کہ جب اسلام کی حفاظت کا مسئلہ پیش تھا تو تلواروں کے حصار میں بستر پر کون لیٹا تھا۔ میرے باپ علیؑ ابن ابی طالبؑ، پھر ہر سخت موقع پر اسلام کے لئے جہاد کس نے کیا؟ علیؑ ابن ابی طالبؑ تھے۔ کیا ان تمام واقعات اور قدیم روایات کے ہوتے ہوئے حسینؑ یمنہ سوچتے کہ اب اسلام پر وقت بڑھ رہا ہے تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟ بچے جب اپنے بزرگوں کے حالات سنتے ہیں تو ان میں بچپن ہی سے ولولہ پیدا ہو جاتا ہے کہ ہم بھی ایسا ہی کر کے دکھائیں، حسینؑ بچپن سے ولولہ رکھتے تھے، منتظر تھے اور مشتاق تھے کہ اسلام کی خدمت کا موقع آئے تو میں بھی اسے کر کے دکھاؤں۔ آیا وقت سلاطین میں حسینؑ کو اس اسلام کی خاطر وہ سب کچھ نذر کر دینا بڑا جوان کے پاس سرمایہ تھا۔ انھوں نے اتنی بڑھی قربانی پیش کر دی جس کی نظیر نہ اس کے پہلے نظر آتی ہے، اور نہ اس کے بعد!

● آج جبکہ اسلام کو بڑی ضرورت قربانی کی ہے اس یادگار کا قاسم کہنا مسلمانوں کے لئے حیات بخش ہے دیکھنا ہے مسلمان اپنے اس فرض کو کس طرح انجام دیتے ہیں۔

ردحوالہ اشاعت امامیہ مشن پاکستان لاہور ۱۱۷



حسین اور اسلام

حسین تاریخی دُنیا میں محتاج تعارف نہیں ہیں، ان کی شخصیت اور عظیم کارنامے کم و بول افراد کے سر عقیدت کو خم کے رہوئے ہیں۔ کسی نے ممکن ہے کہ ان کے عظیم کارنامہ زندگی کے مطالعہ اور ان کے حیرت انگیز ثبات قدم اور استقلال و تدبیر سے بھرے ہوئے بہتال اقدام قربانی کے حالات پر اطلاع حاصل کرنے کا موقع نہ پایا ہو لیکن کم سے کم اس نے حسین کا نام ضرور سنا ہو گا۔ اور اتنا ضرور جانتا ہو گا کہ وہ کسی بڑے تاریخی واقعہ کا مرکز ہیں۔ ممکن ہے یہ خیال بھی اس کے دل میں کبھی آتا ہو کہ یہ حسین کون تھے اور آیتنا اس واقعہ کے خصوصیت کیا ہیں جو اس بڑے انسان کی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ اچھا تو پھر آئیے اور صبر و سکون کے چند لمحے مجھ کو عاریتاً دیجئے۔

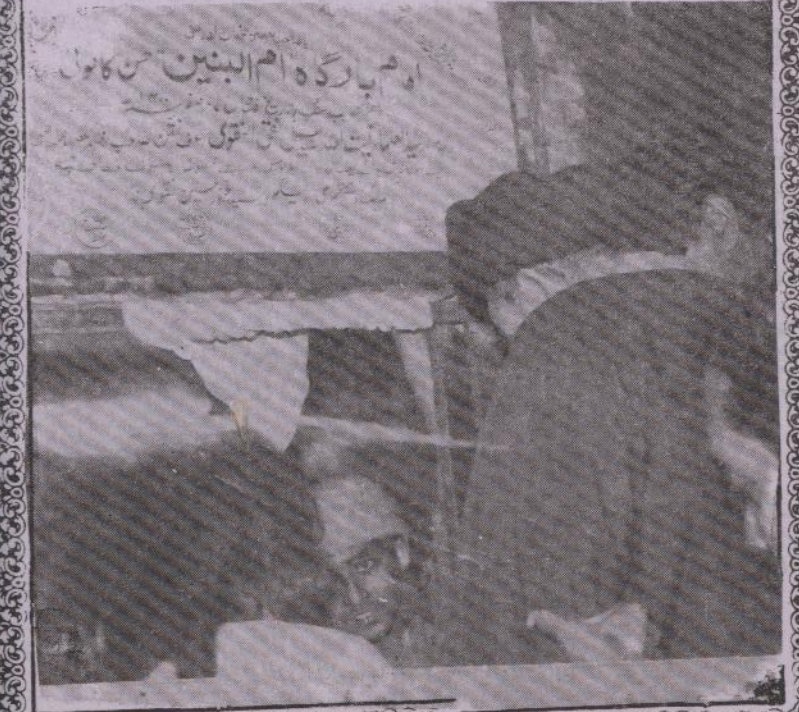
میں آپ کو حسین اور ان کے مشن سے جس کے سلسلہ میں انھوں نے بڑھی سے بڑھی قربانی پیش کرنے میں دریغ نہیں کیا مختصر لفظوں میں سنا سنا کر ڈل جس سے آپ کو حسین اور ان کے اقدامات کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کا موقع مل سکے۔

حسین کے ساتھ اسلام کا
روحانی تعلق :-

ساتویں صدی عیسوی میں جبکہ دُنیا تاریکی کے عظیم دور سے



امام بارگاہ اُم البنین حسن کالونی کی رسم تہذیب بنگ



گذر رہی تھی اور انسانی تمدن کی کج بستی تفرقہ اور فساد کے طوفان سے ڈرنا اقل
تھی جنہ پرہ نمائے عرب سے اسلام کا آفتاب طالع ہوا جس کی
ابتدائی کرنیں اگرچہ حجاز کے مرکزی مقام مکہ معظمہ سے ظاہر ہوئی تھیں
لیکن رفتہ رفتہ اس کی روشنی مشرق و مغرب عالم پر چھا گئی اور دنیا
کو روشن کر دیا۔

یہ ہر دین پر اور عالمگیر مذہب جس کا نام ہے اسلام، اپنے ابتدائی
دور میں ترقی و امتیاز کی حیثیت سے دو عظیم شخصیتوں کی جانشانی
اور انتھک کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ایک پیغمبر اسلام محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ
وآلہ وسلم اور دوسرے ان کے چچا زاد بھائی علی ابن ابی طالب۔!

اگرچہ دوسرے بہت سے صحابہ رسول نے جو خدمات انجام دی
ہیں اور جہاں نشاندہی و فداکاری کے فرض کو ادا کیا ہے اس کو نظر انداز
نہیں کیا جاسکتا اور وہ تاریخ میں سنہری حروفوں سے لکھے جانے کے
قابل ہیں۔

لیکن حقیقتاً ان ہی دو بزرگوں کے ثبات قدم جیہ تناک استقلال
اور اپنے خون کو پسینہ سمجھ لینے کا اثر تھا کہ اسلام کی بنیادیں قائم ہوئیں
اور جیہ تناک تیزی کے ساتھ اس کی امتیازت ہوئی۔

قدرت کو ان دونوں بھائیوں کے اتحاد کو مضبوط سے مضبوط تر
بنانا تھا، حضرت رسول اکرم کی اکلوتی بیٹی حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا
کے ساتھ حضرت علی ابن ابی طالب کا عقد ہوا۔ اور اس طرح علی کو بھائی
ہونے کے علاوہ ایک قسم کی فرزندگی بھی رسول سے حاصل ہو گئی۔ اور یہ
دونوں سلسلے کہ جو امتیازت میں متحد تھے اور زیادہ استحکام کے ساتھ ایک نقطہ پر

جمع ہو گئے۔

ان ہی مال باپ حضرت فاطمہ اور علی ابن ابی طالب سے دو نیکے
متولد ہوئے جن کا نام تھا حسن اور حسین اور عین اس وقت جب
اسلام ایک نو عمر بچہ کی حیثیت سے رسول اسلام کی آغوش میں پرورش
پا رہا تھا ان دونوں بچوں کی ولادت ہوئی جن کی پرورش بھی رسول
کی آغوش میں شروع ہوئی اور اس طرح ان دونوں کا اور اسلام کا
گہوارہ تربیت ایک قرار پایا۔ ایک طرف نانا کہ جو بانی اسلام تھے اور
کار گزار یاں سامنے تھیں اور اس ماحول کے باعث اسلام کے ساتھ
روحانی تعلق اور رومی ارتباط ان دونوں بچوں میں بچپن ہی سے راسخ
ہو گیا اور جتنی عمر بڑھتی گئی گفت اسلام کا جذبہ مستحکم تر ہوتا گیا۔
مذہبی عقائد سے جن کی بنیاد پر یہ دونوں بزرگ (حسن و حسین)
امام مخلص اور حقیقی ذمہ دار اسلام قرار پاتے ہیں۔ بالکل الگ ہو کر
تاریخی اعتبار سے بھی یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ان دونوں بزرگوں کی زندگی
پابندی شریعت اور حفظان اصول مذہب کی حیثیت سے اسلامی
تعلیمات کا مکمل آئینہ اور احکام شریعت کا مجسم نمونہ تھی اور اس لئے
بھی اسلام اور شریعت اسلام کے ساتھ جتنی گہری ہمدردی ان کو ہوتی
تھی کسی کو نہیں۔

بنی امیہ کا دور حکومت

تاریخ کا ایک سیاہ ورق

پیغمبر اسلام کی وفات اسلام کے لئے ایک سخت ترین مصیبت

تھی جس کے بعد ہی سے اس کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے
 شروع شروع میں کچھ عرصہ تک اس کی سادگی اور حقیقت پروردہ کی
 ظاہری جاہ و عزت سے بے تعلقی اور مادی سادہ و سامان سے
 کنارہ کشی ایک حد تک محفوظ تھی لیکن ادھر فتوحات نے ترقی کی ہتھیروں
 کسری کے ممالک پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا۔ سنا ہانہ ترک و احتشام
 اور سلطنتی جاہ و جلال سے آنکھیں دوچار ہوئیں۔ ادھر اسلامی
 افراد میں بھی کستور آرائی اور جہان بینی کے جذبات نے پروردہ کی پائی
 اور نہ ہی پابندیوں کے بجائے سیاسی منصوبہ بازیوں اور کمزوریوں
 کے مقابلہ میں جاہلانہ طاقتوں کے مظاہرہ کا دور دورہ ہو گیا۔

رسول اور ان کے خاندان (بنی ہاشم) کے قدیمی حریف بنی امیہ
 کو جو برابر رسول سے اشتیاق اسلام کے خلاف اپنی طاقت کے آخری
 نفس تک جنگ کرتے رہے۔ اور سب سے آخر میں امید کے تمام
 رشتے منقطع ہو جانے کے بعد بادل ناخوشاستا اسلام لائے تھے، ان
 انقلابات میں اپنے منصوبوں کے پورا کرنے کا اچھا موقع ملا۔

خلیفہ ثانی (حضرت عمر بن الخطاب) ہی کے دور میں شام پر
 ان کا تسلط ہو گیا تھا۔ جو صرف گورنری کی حیثیت سے تھا لیکن قدم
 جمانے کے لئے بہت کافی تھا۔

تیسرے دور میں اتفاقات روزگار سے مرکزی حکومت یعنی
 خلافت کا سہرا بھی بنی امیہ کے سر پر بندھا اور اس گروہ کو اسلام کے
 ساتھ اپنے دیرینہ منصوبوں کے پورا کرنے کا پورا موقع مل گیا۔

خلیفہ ثالث کے ساتھ حسن ظن رکھنے والا شاید یہ کہے گا کہ
 صاف و سادہ لوح خلیفہ وقت کو اپنے خاندانی افراد کے اعراض و
 مقاصد اور ان کے اطوار و حالات کی اطلاع نہ تھی لیکن یہ سب حقیقت

ہے کہ اس عہد میں صحابہ رسول اور صحیحہ اسلامی فرزندوں کے ساتھ انتہائی ستمناک
 برتاؤ اختیار کئے گئے اور انہوں کی برائی اور ان کے بدترین مظالم کی جھلک
 انتہا تک پہنچ گئی جس کے بعد پانی ٹھوسے اور پناہ ہو گیا۔ اور مظالم کو برداشت کرتے کرتے
 صبر کے پیمانے لبریز ہو گئے جن کا براہ راست نتیجہ قتل خلیفہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔
 تاریخ کے مطالعہ سے اس قتل کی بہت کچھ ذمہ داری بنی امیہ کے سر دکھائی
 دیتی ہے۔

اس کے بعد حالات نے پلٹا دکھایا اور تمام جماعت صحابہ نے بھی جو اہل
 صل و عفت سمجھے جاتی تھی حضرت علی کی خلافت کو تسلیم کر لیا اور سب نے باتفاق آپ
 کی بیعت کی لیکن شام کے گورنر معاویہ بن ابی سفیان جو وہاں پورے طور پر قبضہ
 جما چکے تھے اس منفقہ فیصلہ کے سامنے سرنگوں نہ ہونا تھے نہ ہوئے اور
 انتقام خون نیتان کے بہانے سے علی بن ابی طالب سے برسر پیکار ہوئے جو پانچ
 جنگ حلیفین کے سیکڑوں معرکے جن میں ہزاروں مسلمانوں کا خون پانی کی
 طرح بہہ لیا اسی کا کرشمہ تھے۔

آخر اس جنگ کا فیصلہ ایک نکارہ مصالحت کے ساتھ ہوا جس میں اگر
 دیانت و امانت کا جو سہرا فرما ہوتا تو یقیناً مسلمانوں کے درمیان سے ناگوارہ
 اختلاف کا خاتمہ ہو سکتا تھا لیکن افسوس کہ جس دور کے بڑھتے ہوئے
 سیلاب نے اس ظاہری مصالحت کو فتنہ و فساد کا پیش خیمہ قرار دے دیا اور
 اختلاف و فتنہ کی خلیج پہلے سے زیادہ وسیع ہو گئی۔

یہ وہ وقت تھا کہ شام کے تخت پر بنی امیہ کے قدم پوری طاقت کے
 ساتھ جم گئے تھے۔ ادھر امیر المؤمنین علی کو مسجد کوفہ میں شہید کیا گیا اور
 شام میں مخالفت اہل بیت کا طوفان پوری قوت پر بلند ہو گیا اور دشمن بلکہ
 تمام بلاد اسلامیہ کے منبروں پر کمال جرات کے ساتھ اہل بیت رسول پر لعن و
 طعن کا بازار گرم ہو گیا۔

اس زمانہ کے بعض اہم خصوصیات معاویہ اگرچہ صحابہ رسول کے ایک فرد سمجھے جاتے ہیں لیکن ان کے دور حکومت کے یہ افسوسناک خصوصیات ہیں جو اسلامی تاریخ میں جلی حروف سے ہر قوم نظر آتے ہیں اور ان سے اس زمانہ میں اسلام کے ضعف و کس میرسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۱) وضع احادیث اور خدا و رسول پر افتراء و بہتان کوئی جرم نہ رہا بلکہ اس پر مخصوص مصالح کے تحت میں جائزہ و انعام دیا جاتا تھا چنانچہ ابو الحسن علی بن محمد مدائنی نے جو اسلامی مؤرخین میں بڑے پایہ کا شخص ہے، کتاب الاحادیث میں اس زمانہ کے حالات درج کرتے ہوئے لکھا ہے۔

”معاویہ نے تمام عمال کو لکھا کہ جو شخص حضرت عثمان کی فضیلت میں کسی حدیث کو بیان کرے اس کا پورا نام مع یتہ کے میرے پاس بھیج دو اور پوری طرح جائزہ و انعام سے اس کو مالا مال کر دو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فضیلت عثمان میں احادیث کثرت سے ہو گئے اور ایک مدت تک یہ سلسلہ قائم رہا۔“

پھر گوہر نوروں کو لکھا گیا کہ

”عثمان کی فضیلت میں احادیث کا بہت کافی ذخیرہ جمع ہو گیا ہے اب تمام دیگر صحابہ کے فضائل میں روایت احادیث کی طرف لوگوں کو دعوت دو اور جو کوئی فضیلت بھی ابو تراب کی نسبت احادیث میں وارد ہوئی ہے اس کے مقابل دوسرے صحابہ کے لئے بھی بیان کر دو۔ علی اور ان کے تابعوں کی دلیل کے باطل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ہے۔“

بس پھر کیا تھا، فرمان لوگوں کے سامنے بڑھا گیا اور سیکڑوں حدیثیں صحابہ کبار کے مناقب میں تصنیف ہو گئیں جن کی کچھ اصلیت نہ تھی۔ و اعظیہ ان کو منبروں پر پڑھتے اور معلمین مکتب بچوں کو قرآن کی طرح حفظ کراتے تھے بلکہ لڑکیوں، عورتوں اور غلاموں کینزوں تک کو یاد کرنا ضروری سمجھتے تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سچے اسلامی روایات بھی ان بے حقیقت اخبار کے ساتھ مخلوط ہو کر بے اعتبار بن گئے اور علمی تحقیق و تدقیق میں ایک بہت بڑا رخنہ پڑ گیا۔

(۲) سب فرشتہ اور اکابر اہل اسلام کو گالیاں دینے کا دستور نکل آیا دمشق و شام کے منبروں پر چالیس برس تک یہ رسم اور ہوتی رہی اور علی بن ابی طالب کی نسبت اس جسارت کا سلسلہ قائم رہا۔

(۳) بلاد اسلامیہ میں شراب بہت آزادی کے ساتھ استعمال کی جانے لگی اور

اس کی خرید و فروخت میں کوئی لڑک باقی نہیں رہی چنانچہ عبدالرحمن بن سہل انصاری (صحابی رسول) نے شراب کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے نیرہ کی لڑک سے ان مشکوں کو پھاڑ ڈالا۔ معاویہ کو معلوم ہوا تو کہا ”اس بڑھے کو چھوڑ دو اس کی عقل جاتی رہی ہے۔ عبدالرحمن نے سنا تو کہا ”خدا کی قسم میری عقل نہیں گئی ہے مگر رسالت کا سب نے مخالفت فرمائی ہے اس سے کہ شراب ہمارے شکم میں داخل ہو یا برتنوں میں رکھی جائے“ (دیکھو کتاب

اسد الغابہ، ابن اثیر ج ۳ ص ۲۹۹ و اصابہ حافظ ابن حجر عسقلانی ج ۲ ص ۲۹۹)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں شراب کی درآمد مسلمانوں میں بہت خوبی سے ہو گئی تھی اور اگر کوئی سچا مسلمان تعرض کرتا تھا تو اسے دیوانہ اور بے عقل کا خطاب دیا جاتا تھا۔

(۴) بے گناہ مسلمانوں کا خون بہت بے دردی سے بہایا جانے لگا، سیکڑوں کلمہ گوئیوں کی گزریں نہیر تیغ ہو گئیں، سمرقند بن جندب اور بسری بن اوطا اور زیاد بن ابیہ کی سیاہ کاریاں اسی عہد کا نامہ عمل ہیں۔

عبداللہ بن عباس کے دو کسبے ماں کی گود میں ذبح کر دیئے گئے جس سے وہ مجنون ہو گئیں۔ (ملاحظہ ہو اسٹیغاب ابن عبد البر مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد جلد اول ص ۶۶)

(۵) مذہب کا وقار بالکل کم ہو رہا تھا اور بڑے سے بڑے ارکان مذہبی کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔

معاویہ نے بڑے فخر سے جاریہ بن قدامہ اور احنف دو شخصوں کی نسبت کہا کہ "میں نے ان سے ان کا مذہب مول لے لیا ہے" (استیعاب ج ۱ صفحہ ۱۵۱) مہر کے لوگوں نے دربار میں آکر السلام علیکم جیسا رسول اللہ کہا اور اس کو گوارا کر لیا گیا، سزا دینا تو بڑی بات تھی مہموی سی نہ بانی تہذیب بھی نہ کی گئی (ملاحظہ ہو تاریخ طبری ج ۱ صفحہ ۱۸۴)

ان دونوں واقعوں کو ہم نے اپنے رسالہ "قاتلان حسین کا مذہب" میں تفصیل سے لکھا ہے جن سے اس وقت کے اسلامی احساسات و جذبات کی کمزوری کا پتہ چلتا ہے۔

بہر حال معاویہ کا نہ کسی نہ کسی طرح بسر ہو گیا اور انھوں نے اپنی عمر گزار دی مگر مسلمانوں کے سر پر ظلم و ستم کے ایسے دیوتا کہ سوار کر گئے۔ جس نے اسلام کے شیرازہ کو بالکل درہم برہم کر دیا یزید کے اخلاق و عادات سے معاویہ بے خبر تھے؟ نہیں ہرگز نہیں یزید کے خصوصیات سے واقف تھے اور

اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حجر مکی اپنی کتاب "تطہیر اللسان والجنان" میں جو انھوں نے معاویہ کے مناقب و فضائل میں تصنیف کی ہے لکھتے ہیں کہ

"ایک روز امیر معاویہ رونے لگے، مروان نے کہا کیوں کیا ہوا؟

آپ کے رونے کا سبب؟ جواب دیا کہ

"دنیا میں کون راحت تھی جو میں نے نہ اٹھائی ہو۔ اب

سن زیادہ ہو گیا، بڑیاں گھل گئیں، جسم کمزور ہو گیا۔ لیکن

اگر مجھ پر یزید کی محبت کا غلبہ نہ ہوتا تو میں اپنے لئے راہ راست

کو حاصل کر لیتا" (حاشیہ صواعق حرقہ مطبوعہ مصر صفحہ ۵۶) علامہ ابن حجر لکھتے ہیں۔

"ان الفاظ میں معاویہ نے پورے طور پر اقرار کر لیا ہے کہ یزید کی محبت نے ان کو ہدایت کے راستوں سے اندھا بنا دیا ہے اور اسی فرط محبت نے مسلمانوں کو ان کے بعد ایسے فاسق و فاجر کے ہاتھوں میں مبتلا کر دیا جو ان کی ہلاکت کا باعث ہوا"

(حاشیہ صواعق حرقہ صفحہ ۵۸)

اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ امیر شام اپنے بیٹے یزید کے افعال و عادات سے بے خبر تھے اور اس کی وہی بھدی نیک نیتی بہر معنی تھی، یزید کی بیعت ملاؤں سے نہ بردستی کی گئی۔ اور زور و جواہر کے خزانے اس کے لئے وقف کر دیئے گئے۔ یزید تخت خلافت پر متمکن ہوا اور اس کے نسق و سجدہ نے دنیا کو پیر کر دیا ہر طرف معصیت خدا اور مخالف مشرکیت کا بانڈ بگم ہوا، مذہب بائبکچہ اطفال اور اسلام زینت طارق نسیاں بن گیا یزید کے افعال و عادات کے تفصیلی تذکرہ سے ان صفحات کو پیر نہیں کیا جاسکتا، اسلام کی مستند تاریخیں ان واقعات کو اپنے اندر محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ واقعہ ہی نے مختصر الفاظ میں جس طرح یزید کی بدکرداری کی تصویر کھینچی ہے وہ حسب ذیل ہے۔

"وہ ایسا شخص تھا کہ اپنے باپ کی منکوہ کنیزوں اور اپنی

بہنوں، بیٹیوں تک کو نہ چھوڑتا تھا، شراب پیتا تھا اور نماز

کو ترک کرتا تھا" (ملاحظہ ہو صواعق حرقہ، علامہ ابن حجر کی صفحہ ۱۳۵)

اب بتائیے کہ کیا اسلامی بادشاہ یا خلیفۃ المسلمین اور محبوبوں میں کچھ بھی فرق ہوا؟ اکثر بڑے فاسق اشخاص بھی اپنی ماں، بہنوں

بیٹیوں سے مقابلتہ بہت کہنا محبت و غیرت اور انسانیت کے خلاف سمجھتے ہیں۔

بادشاہ وقت کے ان عادات و اخلاق کو دیکھ کر دنیا نے رنگ پکڑ لیا تھا

اور نہ ہیبت بالکل فنا ہو گئی تھی۔ لطف یہ ہے کہ بڑے بڑے صحابہ کرام تسلیم
 ختم کئے ہوئے تھے اور کسی کے دہن سے صدائے اعتراض بلند نہ ہوئی
 تھی۔ سوائے پانچ شخصوں کے تمام صحابہ و تابعین یزید کو خلیفہ
 رسول تسلیم کر چکے تھے، ان پانچ میں سب سے پہلا نام حسین بن علی کا ہے
 اور آپ کی دیکھا دیکھی عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر اور عبدالرحمن
 بن ابی بکر اور عبداللہ بن عباس ہیں۔

یزید کی طرف سے کوشش شروع ہوئی کہ ان کو بھی پابند بنا یا جائے
 سب سے زیادہ امام حسین علیہ السلام کے حلقہ بیعت میں داخل ہونے
 کے لئے اہتمام کیا گیا۔

گذشتہ تاریخ اور اسلام کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے ظاہر ہے کہ
 علی بن ابی طالب کا فرزند اور خاندان رسول کا سب سے بزرگ شخص اگر ان حالات
 کی موجودگی میں یزید کی بیعت کر لیتا تو اسلام کا نام بھی باقی نہ رہ سکتا۔

حسن مجتبیٰ کی صلح جاہدہ کربلا کی تہدید تھی ہر اقدام چولپے
 وقت پر ہو وہ

مفید نتیجہ خیز اور مؤثر ہوتا ہے لیکن اگر وقت سے پہلے کیا جائے تو وہ
 نتیجتاً مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوتا ہے بلکہ اپنے کرنے والے کو اکثر
 ہمیشہ کے لئے مورد الزام بنا دیتا ہے۔

واقعات کی رفتار یکساں نہیں رہتی بلکہ تدریجی حیثیت سے
 ترقی کرتی ہے اور ان کا طریقہ علاج بھی اسی اعتبار سے مختلف ہو جاتا
 ہے۔ عالم کا نظام اسکا پر ہونا قرار پایا ہے اس میں تغیر و تبدل کا امکان
 نہیں!۔

زخم رسیدہ پکے ہوئے جزد و بدن ہاتھ یا پیر کا علاج کر دو۔ پھل ہے
 لگاؤ، ہر ہم بدلو۔ ضرورت ہو تو بار بار نشتر دلاؤ۔ پھر اگر اچھا نہ ہو اور

اس کی سمیت کے جسم میں سرایت کرنے کا خوف ہو تو اسے کاٹ کر پھینک دو
 کسی کو اور افسوس کا سہی نہ ہو گا لیکن اگر زخم پیدا ہونے کے ساتھ ہی یا کوئی
 علاج معالجہ کرنے کے پہلے ہی کاٹ ڈالے تو ضرور مورد الزام اور عام طور پر
 بے عقل سمجھے جاتے حالانکہ یہ طرز عمل وہی تھا جو بعد میں اختیار کئے جانے پر
 مدد و وسوسہ سمجھا جا رہا تھا دستور گزار حالات کی اصلاح کے لئے قربانی

اور وہ کبھی جان کی قربانی کامیاب اور مؤثر تر نہیں سمجھے ہے لیکن سب سے آخری
 جب تمام وسائل و ذرائع ختم ہو جائیں اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہو اس
 وقت اس کا درجہ ہے۔ وہ جہاں تک آخری رہے وہیں تک حملہ

ہے اور اگر اس سے پہلے عمل میں آگئی تو اس پر جلد بازی غیر موقع تناہی
 اور ناقصت اندیشی وغیرہ کا الزام آجانا ضروری ہے جس کے بعد اس کو جی
 بجا نہیں سمجھا جا سکتا اور اسی کے ساتھ اس کی کامیابی اور تاثیر خفیت
 حالات کی اصلاح کے لئے احتجاج و استغاثہ مصالحت و درواداری

شرط و شروط اور قرار داد معاہدہ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا اختیار کیا
 جانا ابتدائی حدود میں ضروری ہے۔

بے شک جب یہ سب وسائل و ذرائع اختیار کئے جانے کے
 بعد ناکام ثابت ہوں تو پھر "آزمودہ را آزمودن جہل است" کے نظریہ

انسان سے ان ذرائع کا مطالبہ نہ ہو سکے گا۔ اور اس کی رفتار اقدام عمل
 میں جب تک قائم ہے کامیابی کی توقع ہے ورنہ نہیں۔ ایک بات ہو جانے
 پر پہلے ہی دن مرنے مارنے پر آمادہ ہو جانے والا مضروب الغضب

کہا جائے گا۔ وہ کسی تعریف کا مستحق نہیں۔ برخلاف اس کے اگر تمام
 دیگر ذرائع و اسباب کے ذریعہ سے اتمام حجت کے بعد انسان کسی اہم مقصد
 کے لئے جان دینے پر تیار ہو جائے تو فداکاری و جاں نثاری اور مؤثر

قربانی قرار پائے گی۔

ایک انسان اگر اپنے افعال و اعمال میں توازن کو ملحوظ رکھتا اور اپنی کارگزاریوں میں صرف جذبات کا فرمانبردار نہیں بلکہ عقلی بخود و تدبیر کا پابند ہے تو اسے اس نظام کا پابند ہونا ضروری ہے۔

ستم کی اموی سلطنت کے ہاتھوں بیشک مذہبِ خطرہ میں تھا اور حتی و صداقت پامال ہو رہے تھے جس کی اصلاح کے لئے قربانی درکار تھی۔ لیکن اس قربانی کے تحت بجائے قرار پانے کے لئے دوسرے پُر امن اور صلح پر مبنی وسائل و ذرائع کے صرف کئے جانے کی ضرورت تھی۔ بے شک اگر امام حسین ایسی ایک البغیر کسی قسم کے سابقہ حالات کے بزمید کی بیعت سے کنارہ کشی کر کے باوجود فقدانِ الخوان و النصار مخالفیت پر جس کا لائحہ عملی نتیجہ آپ کا قتل ہونا تھا، تیار ہو جاتے اور ایسا کرتے تو ان سوالوں کا پیدا ہونا ناگزیر تھا کہ آج امام نے اتحادِ عمل کے ساتھ حالات کی درستگی کی کوشش کیوں نہ کی؟ مخصوص شرائط کے ساتھ صلح کر کے اپنے مقاصد کو کیوں نہ حاصل کیا۔؟ کم سے کم امور سلطنت سے بے تعلق اختیار کر کے مدینہ رسول میں قیام پذیر کیوں نہ رہے اور کہ بلا کہ اپنے کو معرضِ خطرے میں کس لئے ڈالا؟

یہ سوالات پیدا ہونے کے بعد جن کا کوئی صحیح حل بھی موجود نہ تھا یقیناً آپ کا قتل ہونا صرف جذبات کی کار فرمائی کا نتیجہ قرار پاتا اور اس لئے نہ قابل ستائش ہوتا اور نہ مؤثر و کامیاب لیکن واقعہ یہ تھا کہ امام حسین کا اقدام عمل یا قربانی ایک مکمل نظام کے تحت واقع ہوا تھا جس کے لئے برسوں کی طویل مدت کے حالات موقع کو قریب لایا ہے تھے یہاں تک کہ اس میں اس کا وقت آ گیا۔

شروع شروع میں امام حسین کا صلح کر لینا اور مخصوص شرائط معاہدہ کے ساتھ سلطنت کی ذمہ داریوں سے کنارہ کش ہو کر دس برس

خاموشی کی زندگی بسر کرنا اور پھر دس ہی برس تک خود امام حسین کا بھی عملی حیثیت سے خاموشی رکھ کر حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے اکثر زبانی یا مکتوبی احتجاج کرتے رہنا لیکن باوجود اس کے حالات کا رد و بہ اصلاح ہونے کے بدلے بدلے بد سے بدتر ہوتے جانا، شرائط معاہدہ کا ٹھکرادیا جانا، صلح نامہ کے دفعات کا پامال ہو جانا، زبانی احتجاج و استفادہ پر کوئی شنوائی نہ ہونا بلکہ اپنے انسانیت سوز اور اسلام کش افعال پر بیعتیں از پیشہ اصرار کیا جانا اور اس سلسلے میں پانی کا سیر اور پینا ہو جانا اور معاملات کا احد سے گذر جانا وہ تھا جسے امام حسین کے لئے اس عظیم اقدام کا موقع پیدا کر دیا تھا کہ جو انھوں نے کہ بلا کی سر زمین پر انجام دیا۔

یہ افروض تاریخی حالات سے بے خبری کا نتیجہ ہو گا کہ امام حسین نے خود اپنی جان کو معرضِ خطرہ میں ڈالا۔ اگر وہ مدینے میں قیام کرتے اور مدینہ سے برسرِ بر خاش نہ ہوتے تو آپ کا خون کہ بلا کی زمین پر نہ بہتا۔ یہ خیال بالکل بے حقیقت ہے۔ بنی امیہ کی عداوت۔ خیال برہم اور خصوصاً علی بن ابی طالب کی اولاد سے اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ وہ کسی طرح ان کو چین سے بیٹھے نہیں دے سکتے تھے اور انکی خاموشی، سستی بھی ان کی آنکھوں میں خابین کہ کھٹکتی تھی۔ حسن مجتبیٰ نے باوجود صلح جوئی اور خاموشی و کنارہ کشی کے کیا پھل پایا؟ یہ کہ نہ ہر قاتل کے اثر سے کلیجے کے ٹکڑے ہوئے اور دہمنوں کی ظلم و بیداد کا خاموش افسانہ سناتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے۔ جناب خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی اپنی کتاب یزید نامہ صفحہ ۸۳ میں لکھتے ہیں:-

”پہلا خون سیدنا حضرت امام حسن کا ہے جو تاریخ کی روایت سے قطعاً امیر معاویہ کے اوپر ثابت ہے اور کوئی قدیم و جدید حکمہ تاریخی و قانونی ان کی بریت اس قتل سے نہیں کہہ سکتا“

کون کہہ سکتا ہے کہ اگر حضرت امام حسینؑ نواق میں نہ آتے اور مدینہ میں قیام فرماتے تو ان کے قتل کے لئے کوئی ایسا ہی خاموش حربہ استعمال نہ کر دیا جاتا جس طرح امام حسنؑ پر استعمال کیا گیا۔

اس وقت آب کی جان بھی جاتی اور افراد بشر کے سامنے حقیقت کے واضح ہونے کا بھی کوئی طریقہ نہ ہوتا بلکہ جس طرح اس سے پہلے امام حسنؑ کی شہادت سے انکار کیا جاتا تھا اسی طرح حضرت کی شہادت سے بھی انکار کرنا ضروری خیال کیا جاتا اور یہ یقیناً یزید کی فتح اور حسینؑ کی شکست قرار دیا جاسکتی تھی کیونکہ اس حالت میں اول الذکر نے اپنے مقصد کو حاصل کیا۔ حسینؑ کے وجود کو دنیا سے محو کر دیا اور پھر عالم کے سامنے اپنے کو بری بھی ثابت کر دیا۔ اور حسینؑ اپنی جان سے ہاتھ دھوتے اور کوئی نتیجہ خیر انہیں بھی دنیا میں نہ چھوڑتے بھلا حسینؑ سے محبہ العقول تدبیر و استقلال کی مالک ہستی سے کب توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اس پہلو پر متوجہ ہوئے حسینؑ نے اپنے معاملہ کو دو مختلف صورتوں میں منحصر کیا یا۔ ایک یہ کہ خاموش طریقہ پر اپنی جان سے ہاتھ دھوئیں اور دین اسلام اور شریعت نبویہ بھی یزید کے افعال و اقوال سے محو ہو کر رہے۔ دوسرے یہ کہ اپنی ہستی کو ظاہری صورت میں دستِ فنا کے سپرد کر کے ہمیشہ گئے واسطے اپنی اور اپنے نانا کی تحریک کو زندہ کر کے اسلام کا ایک پائیدار نقش چھوڑ دیں، فرزند رسولؐ نے اپنے عظیم تدبیر و عاقبت اندیشی سے کام لے کر دوسری صورت کو ترجیح دی اور اسلام کو زندہ کرنے کے ساتھ موت کو اپنے اور اسلام دونوں کی بقا کے مقابلہ میں اختیار کیا۔ حسینؑ نے اپنی جان دے کر اپنے مخالفین کے مفاد کو ہمیشہ کے لئے پامال کر دیا اور یہی وہ عظیم فتح ہے جس کو حضرت نے ظاہری صورت میں فنا ہو کر حاصل کیا۔

حسین کا اقدامِ عالَمِ تبلیغی شہادتِ اٹھانا

اور
تدبیر و سیاست کا بہترین نمونہ تھا

امام حسینؑ درحقیقت مدینہ سے اس بات کا بیڑہ اٹھا کر نکلے تھے کہ دنیا کے سامنے سچی کو سچی اور باطل کو باطل ظاہر کر دیں چنانچہ آپ نے اپنے مقصد کی اشاعت اور یزید کے سنگِ انسانیت افعال کو طشت از بام کرنے میں وہ تمام وسائل و ذرائع اختیار کئے جو آپ کے عظیم تدبیر و سیاست کا پتہ دیتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ حسینؑ نے مدینہ رسول چھوڑنے کے بعد مکہ معظمہ کو اپنے قیام کے لئے منتخب کیا۔ مکہ معظمہ کا قیام سطحی نظروں میں تو اس غرض کیلئے تھا کہ اس مقام مقدس میں خونریزی حرام ہے۔ لہذا آپ کی زندگی دشمنوں کے نظروں سے محفوظ رہے گی یہ لفظ نظر ایسے شخص کے لئے تسلیم کیا جاسکتا ہے جس کو آخر تک اپنی جان بچانا منظور ہو مگر حسینؑ کو جو مرنے پر کمر باندھ کر چلے تھے اور پورے طور سے آخر تک کے ردِ نما ہونے والے واقعات پیش نظر رکھتے تھے جس کو برابر الفاظ میں بتلاتے بھی رہتے تھے ان کی نسبت اس خیال کو کوئی وقت نہیں دی جاسکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ مکہ معظمہ قلبِ جزیرۃ العرب اور عالم اسلام کا مرکز تھا اطراف و جوانب کے قافلے برابر آتے رہتے تھے اور علاوہ فریضہ حج

جو اسلامی شریعت کی تدوین سے ہر مستطیع مسلمان پر واجب ہے اور جس کی بدولت شہر حج میں چاروں طرف سے مختلف قبائل عرب کا آنا ضروری ہے خود عرب کے قدیم روایات اور سابقہ عملدہ آمد کی وجہ سے جو صدیوں سے قائم تھا اور اسلام نے بھی جس کو باطل کرنے کی ضرورت نہ سمجھی تھی عرب کے اس خطے کو تمام مختلف اخیال قبائل عرب کا محل اجتماع ہونا لازمی تھا۔ وہ مشہور کالفر نیس جو مشرق و سخن اور حمیر و فرخت کے لئے قائم ہوتی تھیں جن کو اسواق العرب کہا جاتا ہے۔ ذی القعدہ سے لے کر محرم تک مکہ و طائف اور مدینہ کے درمیان ہی قائم ہوتی تھیں۔

امام حسین کی شخصیت دنیائے عرب میں کوئی اجنبیت نہ رکھتی تھی، اگرچہ نہ ہی احساسات مردہ ہو گئے ہوں اور حسین کو ان کے ذاتی مراتب کے ساتھ لوگ نہ پہچانتے ہوں لیکن رسول کا نواسا، سلطان حجاز و عراق کا فرزند، ملک عرب کا سب سے زیادہ سخی و جواد جس کے گھر سے کبھی کوئی سائل محروم نہیں پھرا، بنی ہاشم کا بزرگ خاندان، یہ عہد ان وہ تھے جن سے کوئی بھی ناواقف نہ تھا اور کسی کو ان کے انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ حضرت امام حسین نے پہلی زمانہ کہ جو تمام قبائل عرب کے اجتماع کا تھا مکہ میں اپنے قیام کے لئے بخیرینہ کیا ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ حسین اپنے لئے کوئی بڑا لشکر جمع کرنا چاہتے تھے اور ان قبائل عرب کے ساتھ ردالبطرتھا کہ اپنی حیثیت کو مضبوط بنا کر یزید سے مقابلہ کا خیال رکھتے تھے، ہنسی ہرگز نہیں، اگر آپ ایسا چاہتے تو کر سکتے تھے اور مضبوط تحریک ہونے کی صورت میں ممکن نہ تھا کہ اس میں کامیابی نہ ہوتی۔ یہ سن بالکل نزدیک تھا جس کا اسلام علی بن ابی طالب کا پانچواں منہ تھا اور اس کی وجہ سے وہاں کے رہنے والے کوئی ابن ابی طالب اور

اور ان کے گھرانے سے پوری ہمدردی حاصل تھی۔ طائف بھی کچھ اولاد رسول کا مخالف نہ تھا لیکن فرزند رسولؐ کو عالمگیری اور جہانبانی کا شوق نہ تھا، وہ اپنے کو ایک عظیم الشان بادشاہ تسلیم کرنے کی ہوس نہ رکھتے تھے۔ آپ کا قیام مکہ معظمہ میں صرف اس لئے تھا کہ جمہور عرب کے اندر صورت حالات کی طرف ایک لوجہ پیدا ہو جائے اور یزید کا فعال و اعمال کا چرچا ہونے لگے۔

حسین کے قتل کے لئے حجاج کے لباس میں ستام سے کچھ لوگ بھیجے گئے ہوں یا حضرت کے یا بزرگیز کہ لیے جانے کا سامان کیا گیا ہو بہر حال نامعلوم اسباب و علل کے ماتحت امام کا بیت الحرام سے رخصت ہونا اور زمانہ حج کے گزرنے کا انتظار کبھی نہ کرنا اس کو امام کے تبلیغی مقصد میں پورا داخل ہے۔

ایسی ایک اختلاف توقع حسین کا حج کو ترک کر دینا اور بہت نام اہل و عیال کے ساتھ مکہ معظمہ سے نکل کھڑا ہونا ایسی حالت میں کہ حج کا نہ مانہ بہت کم باقی تھا اس نے تمام قبائل عرب کے نمائندوں میں ایک لہر دوڑا دی اور اگر کوئی تاریخ اس موقع کی قلمبند کی گئی ہوتی تو اس میں ضرور نظر آتا کہ اس موقع پر کن خیالات کا اظہار کیا جاتا تھا۔

حسین بن علیؑ کہاں چلے گئے؟ حج بھی نہ کیا؟ ان تمام اہل و عیال و اقربا کے ساتھ اپنے نانانی قبر کے جوار کو کیوں چھوڑ دیا؟ (یزید کے خوف سے) کیوں؟ یزید کیا چاہتا ہے؟ (حسین سے بیعت کا طالب ہے) لا حول ولا قوۃ بھلا ایسا کیوں ہو سکتا ہے؟ فرزند رسولؐ اور یزید ایسے شراب خوردین اور زنا کار فاسق و فاجر کی بیعت کرے۔! اچھا پھر مکہ معظمہ میں کیوں

قیام نہ کیا؟ کس لئے حج کو بھی ترک کر دیا؟ جان کا خطرہ تھا شاید
مکہ میں حسینؑ کے قتل کرنے کے لئے شام سے کچھ لوگ بھیجے گئے تھے
تو یہ! لوتہ!۔ اس سے بڑھ کر سفاکی و ظلم کیا ہوگا کہ فرزند رسولؐ کو
حرم میں بھی پھینک لینے دیا جائے؟

یہ تذکرے وہ ہوں گے جو مکہ معظمہ اور اس کے اطراف و جوانب
میں اکثر باخبر حلقوں میں بہت اہمیت کے ساتھ جا رہی تھے۔

وہ زمانہ کہ جب طریق مرسلت و محابرت مسدود تھے۔ تاریکیوں
وغیرہ خبر رسانی کے ذرائع نایاب، اس سے بڑھ کر کوئی طریقہ واقعات کی
اشاعت کا نہیں ہو سکتا تھا۔ مکہ سے روزانہ لوگ آتے جاتے رہتے تھے
جو شخص تازہ اپنے شہر میں آیا اس کو بھی تازہ واقعات کے ضمن میں حسینؑ
کے نقل و حرکت اور اس کے اسباب و علل کا بیان کرنا ضروری تھا اس
کا نتیجہ یہ نہیں تھا کہ امام کے لئے کوئی بڑا لشکر جمع ہو جائے لیکن مطلب
صرف اتنا تھا کہ پیسے سے ان حالات کی اشاعت ہو جانے کے سبب آپ
کی شہادت عام طور سے نامعلوم اسباب و علل کا نتیجہ قرار نہ پائے جسے
اہل شام کو اپنے دل سے اس کے لئے مخصوص وجوہ تراشنے کا موقع مل جائے
اور حسینؑ کی مظلومیت و حقانیت مخفی ہو جائے۔ یقیناً اگر امام کی طرف سے
ان طریق نشرو اشاعت کو عمل میں نہ لایا جاتا تو بڑی زبرد کی طرف سے امام کی
شہادت کو طرح طرح کے لباس پہنائے جاتے اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ حسینؑ کا
خون رائیحاں چلا جاتا۔ بایں معنی کہ آپ اپنی جان بھی ہاتھ سے کھوتے
اور کوئی ہمدردی بھی افراد بشر کے قلوب میں جھوٹ کر نہ جاتے اور
نہ وہ مقصد جو آپ کا تھا حاصل ہوتا مگر خدا کی قدرت دیکھیے کہ امام
شہید ہوئے اور تمام دُنیا نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ آپ ناحق شہید
کئے گئے، شام کا حاکم اور اس کے دشمن انسانیت و زراعت اور ساتھی کسی

تہمت تراشنے کا موقع بھی نہ پاسکے اسے خداوند عالم کی قوت قاہرہ کے
لجدر حسینؑ کے تدبیر سے تعلق ہے اور وہ اسباب و علل شہادت کے
نشرو اشاعت کا نتیجہ تھا۔ حسینؑ نے اپنی نقل و حرکت کے وجوہ کو زندگی
ہی سے عالم اسلام میں شائع کر کے دشمنوں کی زبانیں بند کر دیں اور
اپنی مظلومی کے سامنے دنیا کے سر تسلیم کو خم کر لیا اور اس سے بڑھ کر
حقانیت کی تبلیغ کیا ہو سکتی ہے۔؟

حسینؑ کا قافلہ خاموش مبلغ تھا

حج کا زمانہ تھا عراق، یمن، طائف وغیرہ سب طرف سے قبائل مکہ
میں آ رہے تھے، ادھر امام حسینؑ اپنے اہل و عیال، اقربا و اور انصار کو اصحاب
کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ ختمہ و خمر گاہ تمام اسباب ساتھ لئے ایک بڑے
قافلہ کی صورت میں مکہ سے جا رہے تھے، عام مسافرت میں زندگی گزارنے
دالے واقف ہیں کہ راستہ میں چار پانچ آدمیوں کا بھی قافلہ نظر آئے
تو کھوج ہوتی ہے کہ یہ کون لوگ ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ پھر کہاں
امام حسینؑ کا شاندار قافلہ اور اصحاب و اعداؤں کا مختصر لشکر۔ اُس پر طرہ یہ کہ
حج کو دو دن باقی رہے۔ مکہ معظمہ کی طرف سے آ رہا تھا۔ جبکہ دُنیا مکہ معظمہ
کی طرف حج کے لئے متوجہ ہے!

یہ وجوہ یقیناً جاذب نظر اور جالب توجہ ہے اور ایک اجنبی
شخص کو یہ پوچھنا ضروری تھا کہ یہ کس کا لشکر ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟
اور حسینؑ کا نام معلوم ہونے پر وہی سوالات جو ہم نے اس کے قبل درج کئے
ہیں۔ چنانچہ تاریخیں شاہد ہیں۔

فرزدوق سے ملاقات امام کی یونہی اتفاقی طور پر ہوئی تھی اور عبداللہ

بن مبلغ و عمر بن عبدالرحمن خزرجی بھی راستے میں خلاف توقع امام سے دوچار ہو گئے اور پھر جو گفتگو ہوئی وہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ حسین بن علیؑ اور ہاشمی جو انوں کا شاندار قافلہ جو خانہ کعبہ کو بجزواری چھوڑ کر جنگوں میں راہ پیمانہ تھا خود ایک خاموش مبلغ اور داعی حق تھا جو دور کے لوگوں کو تحقیق حالات اور کشف حقائق پر مجبور کر دیتا تھا۔

کر بلا کی سرزمین پر تبلیغ

راستے کے تمام اہم واقعات کو چھوڑتے ہوئے امام کی اس عظیم الشان تبلیغ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو کر بلا کی سرزمین پر حسین سے ظاہر ہوئی وہ وقت کہ جب خون کے پیاسے دشمنوں نے چاروں طرف سے امام پر راستہ بند کر دیا تھا اور تیس ہزار کے لشکر نے دین مذہب بلکہ انسانیت و غیرت کو خیر باد کہہ کر فرزند رسولؐ کے قتل پر کمر باندھ لی تھی ان کا گمراہی سے باز آنا ناممکن تھا اور حسین اس بات سے واقف تھے لیکن ایک مبلغ مذہب اور داعی حق کا فریضہ ہے کہ وہ حق کی آواز کو بلند کرے اور تبلیغ دعوت میں کوتاہی نہ کرے۔ اور اس عرض کو امام نے خوب ادا کیا۔

ایک شب کی مہلت نماز کیلئے اور مفاد اسلام نئی بے نظیر تبلیغ

۹ محرم کو اس وقت کہ جب خونخوار لشکر کی یورش تھی اور حسین

اور انکی محقر جماعت کے قتل کے لئے حملہ کر دیا گیا تھا، حسین نے اپنے بھائی کو بھیج کر ایک شب کی مہلت مانگی کیوں؟ کیا اس لئے کہ حسین اپنے اہل حرم سے رخصت ہو لیں، اپنے عزیزوں کو دل بھر کر ایک رات اور دیکھ لیں یا ایک شب میں کوئی سامان جنگ کر لیں؟ نہیں بلکہ صرف اس لئے کہ آج رات بھر خدا کی عبادت کر لیں۔ چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا شب اس طرح گذاری کہ دھند روی کنویں النخل، آپ جماعت کی آوازیں ذکر الہی اور تسبیح کے ساتھ اس طرح گونج رہی تھیں جیسے تنہا کی مکھی کے چھتے سے آواز آتی ہے۔

اس طرح انھوں نے دکھلا دیا کہ سخت ترین مواقع پر کس طرح اصول مذہب کا خیال رکھا جاتا ہے اور یہ کہ مذہبی جذبہ عالم کے جذبہ سے زیادہ برتر طاقت ہے۔

عاشور کے دن نماز ظہر گذشتہ موقع سے سخت اور زیادہ کٹھن وہ موقع تھا

جب لڑائی شروع ہو چکی تھی حسین محقر لشکر کے بہت سے لڑکوں کو قتل ہو چکے تھے اور کمزوری محسوس ہونے لگی تھی۔ تیروں کی بادش تھی اور کمانوں کے کھلنے کی گونج لیکن اس حالت میں بھی نماز ظہر جماعت ادا کی گئی اور ایسی نماز کہ جس کی نظیر عالم کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔

امام رو بہ قبلہ اور مجاہدین کی صفیں بیچھے اور دو بہادر، امام کے آگے سینہ سپر بنے ہوئے کہ جو تیر آئے وہ اپنے اوپر روکیں جس کا نتیجہ یہ تھا کہ نماز ختم ہوتے ہوتے ان دونوں بہادروں میں سے ایک سعید بن عبداللہ حنفی زمین پر گر کر مر گئے اور دوسرے نہیں اور دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

یہ تھے حقانیت کے مظاہرات اور صداقت کے نمونے جو اگرچہ اپنے

اپنے وقت وقوع میں خاموشی کے ساتھ عمل میں آئے لیکن انھوں نے دنیا کو دعوت
حق کی بے زور آواز سے مملو کر دیا اور افراد اسلام کے اسلامی احساسات کو جھنجھوڑ
کر بیدار کر دیا اور دوسری طرف یزید اور ہوا خواہان یزید کے ظالمانہ افعال اور
اسلام کش حرکات کا پردہ چاک کیا۔

تبلیغ حق کے دیگر مظاہرات

عاشور سے کی صبح
سے لے کر عصر تک کے
واقعات اگر ہم کھنچا جائیں

تو ہر سالہ کافی نہیں ہو سکتا۔ تاریخ شاہد ہے کہ حسین فوج کا ہر جوان ایک مبلغ
کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہر ہمدانی کامیابہ حبیب بن مظاہر کا مکالمہ، نہ ہر ہمدانی
کا نظریہ و تمام انصار و افریباہ کے وہ رجز جن میں سے ہر ایک حسین شہادت
کے اسباب و علل بیان کرنے میں ایک مبلغ کا حکم رکھتا تھا۔ اس کا اثر ظاہر
ہو یا نہ ہو لیکن ایک مبلغ کی کامیابی یہ نہیں ہے کہ اس کی آواز نہ بہ لیبیک
کہے دے زیادہ تعداد میں پیدا ہو جائیں بلکہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ وہ
سخت اور کٹھن موقعوں پر اور دشوار گزار منازل میں اپنے فریضہ کو ادا کرے
اور جو دعوت و اظہار کا حق ہے اس کو پورا کر سکے۔

حسینی فوج کے تمام جوان داد و شجاعت دے کر رخصت ہو چکے، ہاتھی
خانان کے بچے بھی اپنے بڑے بزرگ کی حمایت میں کام آگئے۔ صرف مظلوم حسین
باقی ہیں اور دشمنوں کا حلقہ ہے۔ دل پر مصائب کا بوجھ اور آنکھوں میں
دنیا تار یک ہے مگر وہ مبلغ اہلجی۔ ربانی داعی مذہب اپنے فریضہ سے ایک
لمحے کے لئے غافل نہیں ہے وہ خطبے پڑھتا ہے۔ تقریریں کرتا ہے صحابہ رسول
کو گواہ بنا کر اپنی حقیقت کا ثبوت دیتا ہے۔ کیا اس امید پر کہ یزیدی لشکر
آپ کی حالت پر رحم کھائے گا۔ وہ درہم و دینارہ کی جلوہ آرائی اور اشرافیوں
کی جھنکار اور حکومت و سلطنت کی طمع و حرص سے آزاد ہو کر راستے پر آجائے گا؟

لوالہ حضرت امام حسین حقیقت سے بے خبر نہ تھے مگر بخی نوع بشر کو
حالات سے واقف اور باخبر بنانا چاہتے تھے۔ آپ نے کوئی دقیقہ اظہار
حق میں اٹھا نہیں رکھا اور آخری نفس تک اپنے فرض کو ادا کر گئے۔
اس وقت بھی کہ جب شمر کا بجز بوسہ گاہ مصطفیٰ نے فریب آجکا تھا
اور امانت کا چراغ گل ہو رہا تھا حسین نے اپنے قاتل کے سامنے تبلیغ کی
اور اپنے نانا کی صداقت و حقانیت کو ثابت کر دکھایا۔

تو شمر ذرا لمبے چہرہ سے نقاب اٹھا، شمر نے نقاب ہٹائی "حضرت
نے فرمایا۔ میرے نانا رسول نے سچ کہا تھا کہ اے حسین تیرا قاتل
ایک مبرص (کوڑھی) شخص ہو گا۔"

روح لک الفدا! اے حسین بن علی آپ نے مرتے دم تک اپنے فریضہ
سے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ آپ نے اپنے نانا کے قول کی تصدیق نہ کرنا بھی
ثابت کر دیا۔ آپ کے خون کا ہر قطرہ جو کہ بلا کی زمین پر گرے ہا تھا آپ
کی مظلومیت کا مرنے والا اور ملت اسلامیہ کا واحد مبلغ تھا۔

واقعہ کربلا کے بعض روشن پہلو

مشترکہ ضرورت کے وقت دوسرے کو اپنے
اشارہ و مواسا نفس پر مقدم کرنا ایشارہ ہے اور سخت موقع پر دوسرے
کو مبتلا پا کر خود شریک مصیبت اور ہمدرد ہو جانے کا نام مواسات ہے۔
ان دونوں صفتوں کا بہتر اور مکمل ترین نمونہ زمین کہ بلا کے مجاہدین نے
پیش کیا ان میں سے ہر فرد نے امام کے نفس کی حفاظت کو اپنے نفس و بدن پر
اس طرح مقدم سمجھ لیا تھا کہ وہ اپنے تئیں جیتے جی مدد و سمجھ لے سکتے۔
سید الشہداء مصلیٰ پر نماز ظہر ادا کر رہے ہیں اور دشمنوں کے
تیروں کی بوچھاڑ ہے۔ سعید بن عبد اللہ اور نہ ہریر بن قین امام کے سامنے

سیر بنے ہوئے کھڑے ہیں اور ابھی نماز ختم نہیں ہوتی کہ سعید زخموں سے
چوہہ ہو کر زہیلن پر گر جاتے ہیں۔

اور خود امام نے مفاد ملی کی حفاظت کے لیے نفس بلکہ نفس سے
عزیز تر اولاد و اولادوں سے بھی بالاتر عزت و ناموس پر اس طرح
مقدم کیا کہ خود دنیا کی ہر چیز سے ہاتھ دھولیا اور اپنے کو عالم بھر کے
مصائب و آلام کا نشانہ بنا کر اور کیا۔ لیکن دین اسلام کو قائم کر گئے۔
اور مواصلات کا یہ عالم کہ کوئی مصیبت انصار و اصحاب پر نہیں پڑی
جس میں امام نے ان کا ساتھ نہ دیا ہو۔ انصار و اصحاب کی شہادت کے لحاظ
مختلف تھے لیکن جب امام مظلوم کی شہادت پر ایک نظر کی جاتی ہے تو صاف
معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک عنوان کے ساتھ مخصوص نہ تھی۔ بلکہ ایک سلسلے
کے قتل کی جتنی صورتیں ہو سکتی ہیں وہ اس ایک ذات میں جمع ہو گئی
تھیں۔

حسین اس دن صرف اپنی جان نہیں دے رہے تھے بلکہ دنیا کو
ایثار مواصلات کا نہ بھولنے کے قابل سبق دے رہے تھے اور بے نظیر
مثال قائم کر رہے تھے۔

ثبات و استقلال | سخت اور دشوار گزار مصائب
کے باوجود قدم میں لغزش نہ
ہونا ثبات و استقلال ہے اور اس امتحان میں کہ بلا کے مجاہدین کا
ممبر سب سے اول ہے ان کے دشوار گزار مصائب کی نوعیت عالم سے جدا
تھی۔ سرد و گرم دن کے باہمی ارتباط کا ایک مرتبہ دم شمشیر سے قطع
ہو جانا ایک جاننا زہا ہی کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن
تین دن کی بے آبی اور زخموں کی کثرت کے سبب کلیجہ کے اندر آگ
بھڑکنے پر لحظہ احتیاط و نزاع روح کی تکلیف برداشت کرنے سے کم نہ تھا۔

کم سن بچوں کو ماہی ہے آب کی طرح تڑپتے دیکھنا اپنے ہاتھ سے اپنی زندگی
کے عزیز ترین سرمایہ اولاد کو کھینچ ہوئی تلواروں اور بھرتے ہوئے
یتروں میں بھیجنا۔ نہیں بلکہ اپنے ہاتھ پر جگر کے ٹکڑے کو نشانہ مقرر
ہونا دینا ہر انسان کا کام نہیں۔ ان کے استقلال و ثبات قدم کی نظیر
تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اور انھوں نے اس کے ذریعہ جو حیرت
انگیز کامیابی حاصل کی اس کی مثال بھی ملنا ناممکن ہے وہ فنا نہیں ہوئے
بلکہ پختہ کے لئے خود زندہ ہوئے اور ہزاروں کو زندہ کر گئے۔ دور
فلک میں جب تک اسلام کا دور ہے ان کی یاد سچے مسلمانوں کے دلوں میں
ہمیشہ تازہ رہے گی۔ اور سرشک دم کے سبب صد وائے پندرہ ان کا درد ہوتا
رہے گا۔

عزت اس اور موت کا موازنہ

مجاہد کربلا کا نعرہ شیرانہ | الموت اوطی من رکوب العاس
زندگی عزیز تر ہے اور فطرت انسانی میں حیات دنیا کی محبت و دلچسپی
کہ دی گئی ہے۔ انسان اس کی خاطر سخت ترین دنیا کے مشکلات کو برداشت
کرتا اور سرد و گرم عالم کا تحمل کرتا ہے اس کی طبیعت اگر افراتجمل وغیرہ
کے سبب حد اعتدال سے خارج نہیں ہوئی ہے تو وہ اپنی جان کی حفاظت
میں مانی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتا اور تمام ممکن ذرائع جن سے اسکی
ہستی کی بقا ممکن ہے صرف کہ حاضر و رہی سمجھتا ہے، اسلام نے بھی
اس فطری رجحان کو روکنے کی کوئی وجہ نہیں پائی بلکہ لاکھوں ابا و اجداد
اطی التہلک کے حکیمانہ حکم سے حفاظت نفس اور زندگی کی نگہداشت
کو فریضہ لازمی قرار دیا لیکن فلک اعظم کے دور اور ریل و نہار کی آمد و رفت میں

ایسے نازک مواقع پیش آجایا کرتے ہیں، جب جذبات نفسانہ میں تلاطم اور طبعی عقلی رجحانات میں تضاد م ہوتا ہے، زندگی اپنی تمام دلفریبیوں کے باوجود اتنی مہیب صورت میں نظر آتی ہے کہ انسان بے اختیار اس سے آنکھ بند کر لینا پسند کر لیتا ہے اور وہ اسی محبوب زندگی سے جس پر وہ ہر شے کو قربان کرتا تھا ہاتھ دھونے میں لذت محسوس کرتا ہے۔ یہ صورت کبھی بے عقلی، ستمبانی، جھالارہ، ناعاقبت اندیشی کے رجحانات سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اس موقع پر جان دینے سے نہ عقل بڑھ کر مر جیا کہتی اور نہ شروع تباہی کی آواز دیتی ہے۔ لیکن جس وقت موت سے بدتر زندگی یا زندگی سے بہتر موت میں معاملہ بڑھ گیا ہو، جس وقت حیات دنیا، اہم ترین مقاصد کے پامال ہونے کا پیش خیمہ ہو اور جس وقت عزت نفس اور فنائے ظاہر کا سوال درپیش ہو جبکہ میزان عقل نے صورت حال کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے موت کو حیات پر ترجیح دے دی ہو تو اس وقت موت کے منہ میں جا بڑھنے والے دائمی حیات کے مالک ہوا جاتے ہیں۔ عزت دار ہستیوں ہمیشہ عزت کا صدقہ جان کو سمجھی ہیں۔ حسین بن علیؑ نے کہ بلا میں جو راستہ اپنے لئے مقرر کر لیا تھا وہ اسی اصول پر مبنی تھا، انکی زبان سے نکلی ہوئی لفظیں اگرچہ وسیع صحرائے کہلا میں گونج کر فنا ہو گئیں لیکن ان کا پائندہ مفہوم اب کبھی عزت دار اقوام کے صحیفہ حیات کا سرنامہ اور ان کے دیباچہ زندگی کا عنوان اول ہے۔

(الہوت اولیٰ من سواکوب العاسا) سنگ و عمار کے برداشت کرنے سے موت کا آنا بہتر ہے۔

ان کی یہ تحفہ لفظیں علی ہمت کی منادی اور عزت نفس کی ترجمان ہیں اور ان ہی کو حسین نے عملی صورت سے دنیا کو دکھلا دیا۔



اصول کی حمایت اور قربانی

حسین کی قربانی دنیا سے نرالی تھی

اس قربانی کے انتظامات عجیب و غریب تھے

- کہ بلا کے مجاہد حسین بن علیؑ کا اصول حق کی حمایت!
- شریعت اسلامیہ کی نگہداشت!
- جابر و ظالم طاقت کے مقابلہ میں روحانی و مذہبی خودداری کی حفاظت تھی، انھوں نے اپنے آخری نفس تک اس اصول کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ وہ اگر پہلی ہی مرتبہ اپنی جان کی قربانی پیش کر دیتے تو بہت ممکن تھا اس قسم کی قربانیاں کم سہی لیکن بے مثال ہیں۔ سقراط نے بھی زہر کے جام کو اٹھا کر پی لیا تھا اور اپنی جان کو مقصد پر سے قربان کر دیا تھا لیکن حسین بن علیؑ کا مقصد بہت اہم تھا۔ وہ اپنی قربانی کی نوعیت ہی عالم سے جدا گانہ قرار دینا چاہتے تھے، ان کا مقصد یہ تھا کہ اپنی طرف نسبت رکھنے والی ہر عربینہ شے کو خود اپنے ہاتھ سے قربان کر میں اور بوی اپنے نفس کے سوا کچھ باقی نہ رہ جائے تو اس متعارف گراں مایہ کو قربانی کے میدان میں پیش کر دیں انھوں نے سب سے پہلے اپنے راحت و آرام، وطن کی اطمینانی زندگی کو قربان کیا جس کے سلسلے میں ان کو ہر طرح کی تکلیف برداشت کرنا پڑی۔

روز عاشورہ کی قربانیوں کے سلسلے میں اپنے محبوب ترین اصحاب

انصار، ساتھ کے کھیلے ہوئے احباب کو قربان کیا، عزیزوں کی باری آئی اور ایک ایک کر کے ان سب کو میدان قربانی میں بھیجا، اپنے دست و پانہ و فادہ بھائی قمر بنی ہاشم کو قربان کیا، اپنے پیارے کم سن بھتیجے قاسم بن الحسن کو قربان کیا، اپنے دل کی موت، آنکھوں کی روشنی اور پیری کے سہارے علی اکبر کو قربان کیا۔

باغ اُمید کی آخری کوئیل اور غنیمت ناست گفتمہ علی اصغر کو خود اپنے ہاتھوں پر لاکر قربان کیا، ابھی تک دل کے ٹکڑوں کی قربانی ہو رہی تھی اب اعضائے بدن تک لذت پہنچی۔ ان کو ایک ایک کر کے قربان کیا گوشت و پوست، سینہ و دست، دل و جگر، چہرہ و جبلیں بلکہ سطح جسم کا چمچہ چمپ اور اجزائے بدن کا ہر ذرہ قربان کیا لذت یہ پہنچی کہ تیزوں کو جگہ نہ ملتی اور دشمنوں کی تلواروں، نیزوں کو جس جگہ کے بعد بھی خالی مکان نظر نہ آتا تھا۔ جب جسم کا ہر حصہ اور دل کا ہر ٹکڑا قربان ہو چکا۔ اصحاب و انصار اور اقرباء میں سے تو پہلے ہی کوئی باقی نہیں رہا تھا انصاف جسم کی قربانی کا بھی امکان نہ رہا۔ ایک ایک نیزہ پر سینکڑوں نیزے اور ایک تلوار پر سینکڑوں تلواریں پڑ چکیں اور تیر بھی اپنا پورا حوصلہ نکال چکے، اب حسین کے لئے کوئی چارہ کار نہ تھا، کوئی قربانی کے قابل شے باقی نہیں رہی تھی صرف ایک رشتہ حیات تھا جو روح و بدن کے اور پوری کسمکس حیات کے باوجود قائم تھا اور ایک سرور گردن کا ارتباط تھا جس میں اب تک جدائی نہ ہوئی تھی۔

اس باہمت مظلوم کے لئے گزشتہ تمام قربانی کے مرحلوں کو طے کرنے کے بعد یہ قربانی کا مرحلہ بالکل آسان تھا بلکہ اس میں خاص لذت محسوس ہو رہی تھی، عصر کے ہوتے ہوتے حسین اس قربانی میں بھی کامیاب ہو گئے اور خنجر شتر سے کچھ دیر راند و نیا ز کے بعد ایک طرف نفس کی آمد نہ

کا سلسلہ اور نفس و بدن کا ظاہری حلقہ انصار قطع ہوا اور دوسری طرف سرگردن کے ارتباط میں جدائی پیدا ہوئی۔

آسمان لاکھوں برس گزشتہ کرے، زمانہ کے دوق گونا گوں نغمہ سوزوں کے ساتھ سامنے آئیں اور اللہ جانیں لیکن اتنی شاندار مکمل منظم اور مرتب قربانی کی مثال پیدا نہیں ہو سکتی۔

حسین کی شہادت کے بعد

فاطمہ زہرا کا چاند غروب ہو چکا ہے اور دشمن اپنے مقصد میں ظاہری صورتوں سے کامیاب ہو چکے ہیں، اب کوہ و شام کے بانزار ہیں اور بنی ہاشم کے گھرنے کی معزز خواتین اور نیزوں پر کربلا میں سفید ہونے والے مظلوموں کے سر نصب ہیں سطح نظر سے دیکھنے والے اس منظر کو اہلبیت رسول کے لئے سخت توہین و ذلت کا باعث سمجھ رہے ہوں گے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس وقت حسین کی تبلیغ انتہائے شباب پہنچ گئی ہے اور دعوت حق کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو گیا ہے۔ اگر حشمت حقیقت میں سے نظر کیجئے تو نیزہ پر سر حسین جس کی پیشانی پر سجدہ معبود کا نشان بڑا ہوا ہے۔

(سیما ہر فی وجوہہم من اثر السجود) چہرہ سے نڈر ساطع ہے۔ بھونٹ تلاوت قرآن مجید میں مشغول ہیں۔ (ام حسبت ان اصحاب الکھف والرفیقہ کا لوازم ایسا نتا عجبا) دوسری طرف محدرات عصمت جوان ناخروہوں کے مجمع میں چادر و مقنع سے محروم ہونے کے بعد بھی غیرت و حیا کا مجسمہ، اخلاق محمدیہ کی تصویر جاہ و جلال کی چادروں میں پہنچاں، طہارت و عفت کے اندر ملبوس اور ان کے وہ سخاوت و وقایح سے مملو خطے کا نہ تھا تفرع عن لسان ابی سہما۔ (زینب گویا علی بن ابی طالب کی زبان کے ساتھ کلام

شہادتِ ارکرا

کسی کے دل میں اتنی طاقت ہے کہ وہ آج شہادتِ زار کر لیا کی سیر کرے۔ ایک دل الجھانے والی خاموشی، ایک دم گھٹانے والی اداسی، وہ قافلہ جو دوسری محرم کو اس زمین پر اترا تھا آج اپنا اسباب باندھ کر چلا جا چکا ہے اس لئے سناٹا چھایا ہوا ہے یقیناً یہ منظر دل ہلا دینے والا ہے مگر انسان بھی عجیب چیز ہے، وہ ہر نئے حادثہ کی کیفیتیں دیکھنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ چاہے بعد میں اس کو تکلیف بھی پہنچے پھر بھی وہ واقعات ضرور معلوم کرنا ہے جب ایسا ہے تو ذرا دل مضبوط کر کے میرے ساتھ چلو اور کہ بلا کے مختلف مناظر کی اس وقت سیر کرو۔

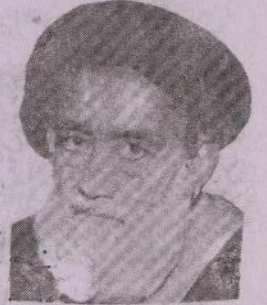
وہ دیکھو ایک بے شمار خیموں اور چھولہ لہریوں کا سلسلہ جن میں سے اکثر میں چراغ روشن ہیں اور وہ بہت سے خیموں کے چھرمٹ میں ایک بڑا خیمہ جس میں تیز روشنی ہے ضرور یہ روشنی ہمتا رہی نگاہ کو سب سے پہلے جذب کرے گی اس لئے چلو یہاں دیکھ لیں کہ کیا ہو رہا ہے۔

یہ یمنی فوج کے سالار عمر سعد کا خیمہ ہے، جہاں اس وقت فتح کی خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔ تمام بڑے افسر جمع ہیں۔ پیغمبر اسلام کے لڑائے کا تین دن کی بھوک پیاس میں خیمہ ظلم سے کلا کاٹنے والے اپنے کارنامے پر ناز کر رہے ہیں اور ایک ایک شہید کی سجاوٹ کے تذکرہ کے ساتھ اس کے قتل کرنے والے کی تعریفیں ہو رہی ہیں اگرچہ سیکڑوں خیموں سے اس وقت زخیموں کی کماہ کی آواز اور بلیسیوں سے منقولین کے غم میں نالہ و شہوں کی آوازیں بھی بلند ہیں مگر نتیجہ کی کامیابی نے کانٹوں کو اس طرح کی آوازوں

کہ رہی تھیں۔ یہ چیزیں وہ ہیں جنہوں نے صداقت کے سیکڑوں میں روح چھونک دی۔ دنیا کی آنکھوں کے سامنے سے جہالت و ضلالت کے پتروں کو چاک کر کے پھینک دیا، عالم کو شرق سے لے کر غرب تک حسین بن علی کا مرتبہ حوال اور بڑید کے احوال و احوال سے بیزار و متنفر کر دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آج عالم کے گوشہ گوشہ اور دنیا کے ہر چہ میں حسین کا نام ہے اور حجاز کا حقیقی بادشاہ کہہ دوڑوں افراد کے دلوں پر قیامت تک کے لئے حکومت کر رہا ہے اور بنی امیہ کے جبروت و عزت کا چراغ ہمیشہ کے لئے اس طرح گل ہو گیا کہ کوئی نام لینے والا بھی نہیں ہے عالم نے دیکھ لیا کہ کون ظالم تھا اور کون مظلوم؟

ظلم کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اور مظلومیت کی نشان کیا ہے۔؟

(بحوالہ پیام عمل لاہور ۲۷ اپریل ۱۹۸۰ء)



سے بند کر دیا ہے اور شرب ناب کے دور کے ساتھ فتح و فلاح کا تہ سب کو
بیخود بنا کے ہوئے ہے۔

یقین ہے کہ ہم سینہ میں ایک شریف انسانی دل رکھتے ہو۔ اس لئے
اس منظر کو دیکھ کر خوشی میں شریک ہونے کے بجائے نفرت و حقارت کے
جذبات محسوس کرنے لگو گے سمجھا اور ضمیر ملامت کرے گا اور تمھاری انسانیت
بیخبر اٹھے گی۔ بھلا وہ فتح بھی کوئی فتح ہے جسے کم از کم تیس ہزار کی فوج
بہتر بھوکوں اور پیاسوں کے مقابلہ میں اپنے لاتعداد سپاہیوں کو کھوکھو کر
جنگ مغلوبہ سے حاصل کرے۔ وہ بہتر جن میں سب لڑتے کے قابل
بھی نہ ہوں بلکہ ان میں اسی برس کا بڈھا اور رتھ پھینکنا کچھ بھی داخل ہو گیا
اس فتح پر ناز کرنا انتہا درجہ کی کم ظرفی اور لیسٹ نگاہی نہیں ہے؟ کیا یہ
فتح حقیقتاً فتح ہے، نہیں نہیں وہ شکست ہے جن کے گمراہ ملت اس
فوج اور اس کی ظالم حکومت پر ہمیشہ کے واسطے چھائی رہے گی۔

یہ خیالات یہاں کے طب و نشاۃ کے سامان خوشی و مسرت کے
شادیاؤں اور ناؤ نوش کی ڈیسیوں کو ایک حساس دل کے لئے بے کیف
بنا دیتے ہیں۔ جی گھبرانے لگتا ہے اور بے ساختہ دل چاہتا ہے کہ یہاں
سے نکل کر میدان کی کھلی ہوا میں سانس لے کر غم غلط کیا جائے وہ دیکھو
سزہ فرات لہریں لے رہی ہے، پانی دور سے نظر آ رہا ہے کیونکہ راستہ
صاف ہے۔ وہ پہر پوتیلین دن سے اس پانی پر بیٹھا ہوا تھا اٹھ چکا ہے۔ وہ
ہزاروں سپاہیوں کے پرے جو رات دن گئے رہتے تھے آج ہٹائے جا چکے
ہیں اس لئے کہ وہ شیر جن کے نیم جان بنانے کے لئے پانی کی بندش ہوتی
تھی لڑ بھڑ کر ساحل فنا کے اس پار پہنچ چکے ہیں۔

دور یا کا کنارہ پریشان دل کے سکون کے لئے بہترین جگہ ہے، مگر
دوریا کے ساحل پر خون کی بو آ رہی ہے۔ موت کے قدموں کے نشان
ہر طرف نظر آتے ہیں کسی شیر کے نغروں کی صدا اب تک گونج رہی ہے۔
گرے ہوئے خون کا سلسلہ رہنمائی کرتا ہوا آگے لے جاتا ہے قدم چھلکتے

ہیں، دل دھڑکتا ہے۔ ایک نہ معلوم رعب کا احساس اور درباش کی صدا
دیتا ہے غور سے دیکھو تو معلوم ہو گا کہ ترائی میں ایک شیر آرام کر رہا ہے
جس کے گمراہ پیش بہت دور تک ساحل کی تمام بالو خوں سے گندھی
ہوتی ہے جسم تمام زخموں سے چوڑا ہے۔ سر شکافتہ ہے۔ ہاتھ دلوں
جسم سے جلا ہیں مگر کٹے ہوئے ہاتھ کے نشانہ میں مشک کاتسہ اب تک
پھنسا ہوا ہے وہ مشک جس میں سویرا خ ہے اور اس کا پانی تمام لہرے چکا ہے
جس نے بہادر کے جسم سے بہے ہوئے خون کی روانی میں انفا کر کے زمین
مقتل کو دور تک رنگین بنا دیا ہے۔ ڈھال لڑ بہت دور پڑی ہے مگر
تلوار دہن کے قریب ہے۔ جھنڈا جو ہوا میں لہرا رہا تھا وہ اب نہ میں
پڑ ہے مگر بہادر کا سینہ علم کا اب بھی محافظ ہے۔

یہ ہے علی کا شیر۔ حسین کا قوت بازو۔ اور علمدار۔ پیاسی سیکندہ
کا سقا۔ قرنی ہاسٹم عباس جو حسین فوج کا سب سے آخری سپاہی تھا
جس نے سب سے آخر میں حسین سے اجازت جہاد طلب کی مگر امام نے پھر بھی
لڑنے کی اجازت نہیں دی فقط چچوں کی پیاس بجھانے کے لئے پانی کی سیل
پیدا کرنے کا حکم دیا۔ وفادار عباس کی یہ یادگار کامیابی تھی کہ وہ فوج
کا پرہ ہٹا کر مشک میں پانی بھر لینے میں کامیاب ہوئے مگر فسوس کہ بھرا
ہوئی مشک کو لے کر خمیہ تک پہنچنا ممکن نہ ہوا۔ تیرے مشک کو چھید کر تمام
پانی بہایا اور عباس نے سینکڑوں زخم کھا کر اپنے جسم کا تمام خون بہا دیا۔
عباس مشک و علم کے ہوتے ہوئے بھی دشمن کے احساس میں بے بس

نہیں تھے آخر دلوں ہاتھ جلا کر دیئے گئے مگر پھر بھی عباس جب تک
خود دکھوڑے سے نہیں گمراہ علم کو زمین پر نہیں گرنے دیا۔ مگر وہ علم
اس کے بعد بھی حقیقت میں گرنے نہیں پایا۔ آج ہزاروں علم اسی ایک
علم کی یاد میں ہزاروں کے ہاتھوں میں بلند ہوتے ہیں اور ہر تضرع یہ خانہ
میں حسین کے نام کی تضرع تو ایک ہوتی ہے مگر علم کثرت کے ساتھ
نصب ہوتے ہیں۔ یہ اشارہ ہے اس کا کہ عباس کو دیکھو ایک تضرع ہے

ان کا علم آج تک اونچا ہے اور ہمیشہ اونچا رہے گا کیونکہ حق کا جھنڈا کبھی سرنگوں نہیں ہوتا۔

یہ منظر یقینی اگر ایک طرف دل میں جوش، ولولہ، حتی پر مٹنے کا حوصلہ پیدا کرتا اور لوگوں میں خون کی روانی بڑھاتا ہے تو دوسری طرف ایک ایسے بہادر کی لاش کا یہ جاں فرسا عالم دل کی کہیں بھی ٹوٹنے لگتا ہے بے ساختہ آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں اور وہ آنسو جو بزدلی کے نہیں بلکہ بہادری کی قدر و قیمت کے احساس کا نتیجہ ہیں اور عزم و ہمت کی آگ کو افسردہ نہیں بلکہ اس کی شعلہ افزائی میں اور اضافہ کرتے ہیں۔

دل تو جانتا ہے کہ عزت کے اسی ایک منظر میں عرق ہو جائے مگر سال کی بلندی سے صحرا کا گلگوں تختہ صاف نظر آتا ہے اور نگاہ کو کشتاں کشتاں اپنی طرف لے جاتا ہے۔

یہاں کوئی ایک ہی مرقع نہیں ہے جو تو جہ کام کر بن سکے بلکہ سچ سچ "شہادت نثار" تو پہلی جگہ ہے، دُور تک لہو کا چھڑکاؤ ہے۔ حاجا خون کے تھکے بدن لگے ہیں۔ ٹوٹے ہوئے نیزے، شکستہ تلواریں، کٹے ہوئے تیروں کے انبار میں جو ادھر ادھر لگے ہوئے ہیں، دشمنوں کے سر سزاہوں کی تعداد میں نہ مین نہ لڑھک رہے ہیں اور لاشے بھی بہت دور تک نظر آتے ہیں ان سب کے بیچ میں بہتر یا زیادہ سے زیادہ سو، سو سو لڑائی جھڑپے خاک و خون میں آلودہ اس عالم میں ہیں کہ کسی کا جسم تیروں سے چھلنی ہے کسی کا سر گرز سے شکافتہ ہے، کسی کا پہلو منجھ سے چاک اور کسی کا سینہ نیزہ سے فگار ہے۔

ان میں ساٹھ ستر اور اسی برس تک کے بڑھے، ۸۰ سے لیکر ۹۰ برس تک کے جوان اور گیارہ بارہ برس تک کے کمسن بچے بھی ہیں۔ ہاتھی خاندان کے جوانوں بلکہ بچوں تک کی بیچ دھج سبے الگ ہے۔ ان میں ایک چاند کا ٹکڑا تلوار کا پھل کھانے اس شان سے پڑا ہے کہ عمامہ کے بیچ خون سے رنگین ہو کر لٹک آئے ہیں اور اس حسین چہرے پر مہرے کی قزح چھا گئے ہیں۔

ہاتھوں میں خون کی مہندی اور سینہ پر زخموں کی بدھی ہے یہ سچے سچے ان کا بیٹم اور حسین کا عزیز بھتیجا قاسم، جسے رخصت کرتے وقت امام نے مرحوم بھائی کی وصیت کو پورا کرتے ہوئے اپنا داماد بھی بنا لیا تھا۔ کہ بلائے معلیٰ میں خیمہ گاہ کے اندر ان کی یادگار میں جھلکے عروسی بنا ہے اور ہندوستان میں ان کی یاد میں سالہا سال تاریخ مہندی اکھتی ہے۔

ان ہی کے پاس اٹھارہ برس کے گریل جوان کالا شہ ہے جس کے سہرے کے پھول کھلنے کی توفیق نہ آئی۔ یہ علی اکبر ہیں جنھیں حسین اس لئے بہت عزیز رکھتے ہیں کہ وہ پہلو رسول اللہ کی نقیہ تھے۔ ان کے رخصت ہونے وقت حضرت امام حسین نے اپنے خالق کو گواہ کر کے کہا تھا کہ جب ہم زیارت رسول کے مشتاق ہوتے تھے تو اس کے پیرہ کو دیکھ لیتے تھے۔ آج کے خوش عقیدہ مسلمان شہید نعلین رسول کی بھی بڑا کاغذ پر بنی ہو عورت کرتے ہیں مگر افسوس وہ کیسے مسلمان تھے جنھوں نے خود رسول کی بیٹی جاگتی ہوئی شہید کا خیال نہ کیا وہ حسین اور مقدس جسم تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

علی اکبر کو دیکھتے ہی دل میں علی الصغر کا خیال آتا ہے۔ وہ چھ مہینہ کا بچہ جسے حسین نے قربان گاہ شہادت میں سب سے آخر میں پیش کیا تھا۔ بچہ پیاس سے جال بلب تھا مگر پیاس اس کی پانی سے نہیں بلکہ پیکان تیر سے بجھائی گئی ان کی لاش تلاش کرنے پر کبھی شہیدوں میں نہیں ملتی۔ ہاں زمین پر ایک چھوٹی سی قبر ہی ہوئی ہے یہ اصغر کی تربت ہے۔ اس بچے کو خود امام حسین نے شہادت کے بعد ہی دفن کر دیا تھا۔ شاید اس لئے کہ اُمت رسول کا یہ بھرم اتنا سنگین تھا کہ فرزند رسول کی انسانی عقیدت کو خود اس منظر کے سامنے رہنے سے شرم دامنگیر ہوتی تھی۔

سب سے آخر میں نگاہ شہید کی طرف جاتی اور وہیں ٹھہر جاتی ہے۔ یہاں ایک تقدس کا ماہ پیکر لڑائی شعاہوں کا خزانہ نہیں عقیدت کے اندر چمکتا ہوا سورج، ایک ہم تن بیواہت لاش کی سیاہی اور ہے۔ اس کا سہیلے ہی چھرا ہو چکا ہے۔ اس لئے صورت سے تو پہچانا نہیں جاسکتا مگر زخموں کی کثرت بتلاتی

ہے کہ تمام حردوں کا اصلی مقصد اور عداوتوں کا آخری مرکز ہی تھا، نکستہ
 کمر ظاہر کرتی ہے کہ یہ وہ ہے جس کے برابر کا بھائی مار ڈالا گیا۔ باز و تیر سے
 پھندا ہوا خبر دیتا ہے کہ وہ ہے یہ جس کے ہاتھوں بہر چھ ہمیں کا بچہ نشانہ
 تیر سم ہوا۔ خون سے رنگین ہاتھ پتہ دیتے ہیں کہ وہ ہے یہ جس نے
 بے شیر کا خون چہرہ پر مل لیا تھا۔ سینے پر کٹا دہ گھاؤ اور لپشت کے
 پار اس کا نشان بتلا رہا ہے کہ یہ ہے وہ جس کے سینے بہر تیر پڑا تو سامنے
 سے نکل نہ سکا آخر لپشت کی جانب سے اسے کھینچا گیا تو سینے سے خون
 پرنلے کی طرح جاری ہوا۔ جسم کے پارہ ٹکڑے اس کی دیں ہیں کہ بچا ہے
 وہ جس کا جسم بعد شہادت گھوڑوں کے سموں سے پامال کیا گیا۔

ان خصوصیات سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہے شرافت کی جان،
 انسانیت کی روح، صداقت کا نکتہ، ماہیغیر اسلام کی نشانی، علیؑ کا فرزند
 حسینؑ جو کہ بلا کے مجاہدین کا سرگروہ اور اس ہمیشہ یاد رہنے والے کا رتامہ کی
 مرکز کی شخصیت! جس نے جان دے دی مگر حق و صداقت بہر تیخ نہ آنے دی۔
 جس نے عزت اسلام پر اپنی ہر چیز قربان کر دی اور بقول خواجہ معین الدین چشتی
 اجیری کلمہ لا الہ الا اللہ کی از سر نو بنا قائم کر دی۔

آج ہر سال دنیا کے تمام مشرق و مغرب میں محرم میں ان ہی کا
 سوگ منایا جاتا ہے اور ان ہی کی یاد ہے جو مختلف اندازوں اور طریقوں سے
 برابر تازہ کی جاتی ہے اور تیرہ صدیوں سے ہر سال کے بعد دوسرے سال
 اس میں اضافہ ہی ہوتا رہا ہے۔

● محمدوی حال کی مرتبہ دیگر کتابیں علیؑ حصہ اول و دوم۔ حسینؑ حسینؑ جسد اول
 و دوم۔ حضرت علیؑ کے فیصلے اور تہذیب اسلامی۔ فقہ حنفیہ۔ حفاظ قرآن۔ تاریخ اہل محمد
 ص ۲۰۰۔ اس کے علاوہ آپ کی ضروری مہجولات کا انمول خزانہ یعنی
 متیفہ ڈائری ایک نایاب تحفہ ہے ضرور حاصل کیجئے!



امام منتظرؑ

نام و نسب پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ کی نسل مبارک جو آپ کی بیٹی حضرت فاطمہ زہرا اور داماد حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام سے چلی اور ان کے چھوٹے فرزند حضرت امام حسین علیہ السلام کی اولاد میں سے جو مسلسل نوا امام ہوئے ان میں سے آٹھویں امام حضرت امام حسن عسکری تھے اور امام حسن عسکری کے فرزند ہمارے بارہویں امام حضرت حجت قاضی امام مجل اللہ فرجہ ہیں جو اپنے جد بزرگوار حضرت پیغمبرؐ کے بالکل ہمنام اور صورت و شکل میں ہو بہو ان کی تصویر ہیں۔ والدہ گرامی آپ کی نرنجس خاتون، نقیر بادشاہ کی پوتی اور شمعون رضی حضرت عیسیٰ کی اولاد سے تھیں۔ امام حسن عسکری کی ہدایت سے حضرت کی بزرگ حریت ہستہ "حلیہ خاتون نے انھیں مسائل دینیہ اور احکام شرعیہ کی تعلیم دی تھی۔

القاب و خطابات غالباً آئمہ معصومین میں حضرت علی بن ابی طالب کے بعد سب سے زیادہ القاب ہمارے امام عسکری کے ہیں جن میں زیادہ مشہور ذیل کے خطابات ہیں۔

۱۔ المہدی - یہ ایسا خطاب ہے جو نام کا قائم مقام بن گیا ہے اور پیشگوئیاں جو آپ کے وجود کے متعلق پیغمبر کریم اور دیگر آئمہ معصومین کے زبان پر تھیں وہ زیادہ تر اس لفظ کے ساتھ ہیں اور اسی لئے آنے والے "مہدی" کا اقرار تقریباً ضروریات اسلام میں داخل ہو گیا ہے جس میں اگر اختلاف ہو سکتا ہے تو اوصاف و حالات کی تعیین میں، لیکن "مہدی" کے ظہور کا عقیدہ مسلمانوں کے ہر شخص کو رکھنا لازم ہے۔ ان حضرات کا ذکر نہیں جو اپنے کو مسلمان صرف سوسائٹی کے اثر یا سیاسی مصلحتوں سے کہتے ہیں مگر ان کے دل میں حاضر و ناظر محدث یسند رب الارباب کا عقیدہ ہی موجود نہیں، تو اس کے رسول کی

کسی ایسی فریبی کی تقدیر جو ابھی وقوع میں نہیں آئی ان کے حاشیہ خیال میں کہاں جگہ پاسکتی ہے۔ سچی وہ لوگ ہیں جن کو معمول کے خلاف اس رسالہ میں پیش مخاطب بنانا نہیں چاہا ہے۔

"مہدی" کے لفظ کے معنی ہدایت پائے ہوئے کے ہیں۔ اسی لحاظ سے کہ "اصل ہادی" (راستہ بتانے والی) ذات خالق ہے جس کے لحاظ سے خود پیغمبرؐ سے خطاب کر کے قرآن کریم میں یہ آیت آئی ہے۔ اِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ اَجَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ۔ "تمہارے بس کی بات نہیں ہے کہ تم جس کو چاہو ہدایت کرو۔ بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے" اور اسی اعتبار سے سورہ الحج میں بارگاہ الہی میں دعا کی گئی ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ، "ہم کو سیدھے راستے پر قائم رکھ" اس فقرہ کو خود پیغمبرؐ اور آئمہ معصومین بھی اپنی زبان پر جاری کرتے تھے اس لئے خداوند عالم کی ہدایت کے لحاظ سے ان رہنمایان دین کو "مہدی"، کہنا صحیح تھا جو صفت کے لحاظ سے سب ہی بزرگوار تھے اور خطاب کے لحاظ سے حضرت "امام منتظر" کے ساتھ مخصوص ہو گیا۔

۲۔ القائم - یہ لقب ان احادیث سے ماخوذ ہے جس میں پیغمبرؐ خدا نے فرمایا ہے کہ "دنیا ختم نہیں ہو سکتی جب تک میری اولاد میں سے ایک شخص قائم (کھڑا) نہ ہو جو دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دے"

۳۔ صاحب الزماں - اس اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ آپ ہمارے زمانہ کے رہنمائے حقیقی ہیں۔

۴۔ حجت خلا - ہر نبی اور امام اپنے دور میں خالق کی حجت ہوتا ہے جس کے ذریعے سے ہدایت کی ذمہ داری جو اللہ پر ہے وہ پوری ہوتی ہے اور بندوں کے پاس اپنی کوتاہیوں کے جواذ کی کوئی سند نہیں رہتی۔ چونکہ ہمارے زمانے میں رہنمائی خلاق کی ذمہ داری حضرت کے ذریعے پوری ہوتی ہے

ہے اس لئے قیامت تک "حجت خدا" آپ ہیں۔

۵۔ منتظرؑ۔ چونکہ "امام مہدی" کے ظہور کی پیشنگوئی برابر پختہ نمایان دین دیتے رہے۔ یہاں تک کہ صرف مسلمانوں میں نہیں بلکہ دوسرے مذاہب میں بھی چاہے نام کوئی دوسرا ہو مگر ایک آنے والے کا آخر زمانہ میں انتظار ہے ولادت کے قبل سے پیدائش کا انتظار ہے اس لئے آپ خود حضرت حکم الہی کے منتظر ہوتے ہوئے تمام خلق کے لئے منتظر یعنی مرکز انتظار ہیں۔

ولادت۔ وہ وقت جس کا معصومین کو انتظار تھا آخر کو آئی گیا اور ۱۵ شعبان ۲۵۴ھ کی رات کو سامرے میں اس مبارک و مقدس بچے کی ولادت ہوئی۔ امام حسن عسکری نے اس موقع پر کافی مقدار میں روٹیاں اور گڑ گشت برہ خلاء میں صدقہ کیا اور حقیقت میں کئی بکریوں کی قربانی فرمائی۔

بارہویں اماں کو اپنے والد کی آغوش شفقت و تربیت سے بہت کم عمر میں جلا ہونا پڑا یعنی شعبان ۲۵۵ھ میں آپ کی ولادت ہوئی اور بیچ الاول ۲۶۰ھ میں آپ کے والد بزرگوار حضرت امام حسن عسکری کی وفات ہو گئی اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی عمر اس وقت ساڑھے چار برس کی تھی اور اسی کمسنی میں آپ کے سر پر خاق کی طرف سے امامت کا تاج رکھ دیا گیا۔

غیبت ۱۔ حضرت امام منتظرؑ کی امامت کا زمانہ اب تک دو غیبتوں پر تقسیم رہا ہے۔ ایک زمانہ غیبت صغریٰ اور ایک "غیبت کبریٰ"، اس کی خبر بھی معصومین کی زبان پر پہلے ہی آچکی تھی جیسے پیغمبر خدا کا ارشاد۔ اس کے لئے ایک غیبت ہوگی جس میں بہت سی جماعتیں گمراہ پھرتی رہیں گی اور اس غیبت کے زمانہ میں اس کے اعتقاد پر برقرار رہنے والے لوگ دوسرے "سے زیادہ نایاب ہوں گے حضرت علی بن ابی طالب کا ارشاد ہے "قائم آل محمد کے لئے ایک طولانی غیبت ہوگی میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے وہ منتظر کہ دوستان اہلبیت اس کی غیبت کے زمانے میں سرگرداں پھر رہے ہیں جس طرح کہ جانور جبہ آگاہ کی

تلاش میں سرگرداں پھرتے ہیں" دوسری حدیث میں "اس کا ظہور ایک ایسی غیبت اور حیرانی کے بعد ہوگا جس میں اپنے دین پر صرف باخلاص اصحاب یقین ہی قائم رکھ سکیں گے۔ امام حسن کا قول "اللہ اس کی عمر کو اس کی غیبت کی حالت میں طولانی کرے گا۔ امام حسین کا ارشاد "اس کی غیبت ہوگی جس میں بہت سی جماعتیں گمراہ ہو جائیں گی" امام محمد باقر کا ارشاد اس کی غیبت اتنی طولانی ہوگی کہ بہت سے گمراہ ہو جائیں گے" امام جعفر صادق نے فرمایا مہدی ساتویں امام کی اولاد میں سے پانچواں ہوگا۔ اس کی ہستی تمھاری نظروں سے غائب رہے گی" دوسری حدیث میں صاحب الامر کے لئے ایک غیبت ہوئی وہی ہے اس وقت ہر شخص کو لازم ہے کہ تقویٰ اختیار کرے اور اپنے دین پر مصیبتی سے قائم رہے" امام موسیٰ کاظم فرماتے ہیں "اس کی صورت لوگوں کی نگاہوں سے غائب ہوگی مگر اس کی یاد اہل ایمان کے دلوں سے غائب نہ ہوگی وہ ہمارے سلسلہ کا بارگشاہ ہوگا" امام رضا "اس کی غیبت کے زمانہ میں اس کا انتظار رہے گا" امام محمد تقی۔ مہدی وہ ہے جس کی غیبت کے زمانے میں اس کا انتظار اور ظہور کے وقت اس کی اطاعت لازم ہوگی" امام علی نقی "صاحب الامر وہ ہوگا جس کے متعلق بہت سے لوگ کہتے ہوں گے کہ وہ ابھی پیدا ہی نہیں ہوا" امام حسن عسکری کا ارشاد ہے "میرے فرزند کی غیبت ایسی ہوگی کہ سوائے ان لوگوں کے جنھیں اللہ محفوظ رکھے سب شک و شبہ میں مبتلا ہو جائیں گے" اسی کے ساتھ امام محمد باقر نے یہ بھی بتلایا تھا کہ "قائم آل محمد کے لئے دو غیبتیں ہیں۔ ایک بہت طولانی اور ایک اس کی بنسبت مختصر" امام جعفر صادق نے فرمایا کہ ایک دوسرے کا بنسبت بہت طولانی ہوگی" اپنی احادیث کے پہلے سے موجود ہونے کا نتیجہ تھا کہ امام حسن عسکری کے بعد ان کے اصحاب اور مومنین مخلصین کسی شک و شبہ میں مبتلا نہیں ہوئے اور انھوں نے کسی حاضر الوقت مدعی امامت کو تسلیم کرنے کے بجائے اس "امام غائب" کے تصور کے سامنے سر تقدیر خم کر دیا۔

غیبتِ صغریٰ کے پہلی غیبت کا دور ۲۶۰ھ سے ۳۲۹ھ تک
 انہتر سال قائم رہا۔ اس میں سفرِ خاص موجود تھے یعنی ایسے حضرات جن کو
 مخصوص طور پر یہ نام کے لغین کے ساتھ امام کی جانب سے نائب بنایا گیا تھا
 کہ وہ شیعوں کے مسائل امام تک پہنچائیں۔ ان کے جوابات حاصل کریں۔
 اموال زکوٰۃ و خمس کو جمع کر کے انھیں مصارفِ خاصہ میں صرف کر دیں اور جو
 قابل اعتماد اشخاص ہوں ان تک خود امام کی تحریرات کو بھی پہنچا دیں اور نہ خود
 حضرت سے دریافت کر کے ان کے مسائل کا جواب دے دیں۔ یہ حضرات علم و
 تقویٰ اور رازداری میں اپنے زمانہ کے سب سے زیادہ ممتاز اشخاص تھے اسی
 لئے ان کو امام کی جانب سے اس خدمت کا اہل سمجھا جاتا تھا۔ یہ حسب ذیل
 چار بزرگوار تھے۔

۱۔ ابو عمر و عثمان بن سعید بن محمد و عمری السدی۔ یہ پہلے امام علی نقیؑ کے
 بھی سفیر رہے تھے۔ پھر امام حسن عسکریؑ کے زمانہ میں بھی اس خدمت پر
 مامور رہے اور پھر حضرت امام منتظرؑ کی جانب سے بھی سب سے پہلے اس
 عہدے پر ہی قائم ہوئے۔ چند سال اس خدمت کو انجام دے کر بغداد میں
 انتقال کیا، وہیں دفن ہوئے۔

۲۔ ان کے فرزند ابو جعفر محمد بن عثمان بن سعید عمری۔ امام حسن عسکریؑ
 نے ان کے منصبِ سفارت پر برقرار ہونے کی خبر دی۔ پھر ان کے والد نے
 اپنی وفات کے وقت حکمِ امام ان کی نیابت کا اعلان کیا۔ جمادی الاول ۳۳۹ھ
 میں بغداد میں وفات پائی۔

۳۔ ابو القاسم حسین بن روح بن ابی بکر لؤججی، علم و حکمت کلام و نجوم
 میں خاص امتیاز رکھتے ہوئے مشہور خاندان لؤججی کی یادگار اور خود بڑے
 جلیل المرتبت پرہیزگار عالم تھے۔ ابو جعفر محمد بن عثمان نے اپنی وفات کے
 بعد امام کے حکم سے ان کو اپنا قائم مقام بنایا۔ پندرہ برس عہدہ سفارت

انجام دینے کے بعد شعبان ۳۲۰ھ میں ان کی وفات ہوئی۔

۴۔ ابو الحسن علی بن محمد عمریؑ۔ یہ آخری نائب تھے۔ حسین بن روح کے
 بعد حکمِ امام ان کے قائم مقام ہوئے اور صرف نو برس اس فریضہ کو انجام
 دینے کے بعد ۳۲۹ھ میں بغداد میں انتقال کیا۔ وقتِ آخر ان سے جب پوچھا
 گیا کہ اب آپ کے بعد نائب کون ہوگا تو انھوں نے کہہ دیا کہ اب اللہ کی مشیت
 ایک دوسری صورت کا ارادہ رکھتی ہے جسکی آخری حدت اسی کو معلوم ہے اب
 اس کے بعد کوئی نائب خاص باقی نہ رہا اسی ۳۲۹ھ کے اندوہ ناک سال
 میں کافی کے مصنف نقیۃ الاسلام محمد بن یعقوب کلینیؑ اور شیخ صدوقؑ کے
 والد بزرگوار علی بن بابویہ قمی نے بھی انتقال فرمایا تھا اور ان حوادث کے ساتھ
 غیر معمولی طور پر یہ منظر دیکھنے میں آیا کہ آسمان پر ستارے اس کثرت سے ٹوٹ
 رہے ہیں کہ ایک گھنٹہ معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے اس سال کا نام "عام تنازلہ نجوم"
 یعنی ستاروں کے انتشار کا سال، اس کے بعد اندھیرا چھا گیا۔ سخت اندھیرا۔
 اس لئے کہ کوئی ایسا شخص سامنے نہ رہا جو امام کی خدمت میں پہنچنے کا وسیلہ ہو۔
 غیبتِ کبریٰ ۳۲۹ھ کے بعد جو زمانہ ہے اسے غیبتِ کبریٰ
 کہتے ہیں۔ اس لئے کہ اب کوئی خاص نائب بھی باقی نہیں رہا ہے اس دور کے
 لئے خود حضرت امام نصر نے یہ ہدایت فرمادی تھی کہ "اس صورت میں دیکھنا جو ستارے
 احادیث پر مطلع ہوں اور ہمارے حلال و حرام یعنی مسائل سے واقف ہوں
 ان کی طرف رجوع کرنا۔ یہ ہماری جانب سے تمہارے اوپر حجت ہیں۔"
 اس حدیث کی بناء پر علماء شیعہ اور مجتہدین کو نائب امام کہا
 جاتا ہے مگر یہ نیابت باعتبار صفات عمومی حیثیت سے ہے خصوصی طور پر
 باعتبار زہد و تقویٰ نہیں ہے۔ یہی خاص فرق ہے، ان میں اور نائبین میں جو
 غیبتِ صغریٰ کے زمانے میں اس منصب پر فائز تھے۔ اس زمانہ غیبت میں بھی
 یقیناً امام علیہ السلام ہدایتِ خلق اور حفاظتِ حق کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور

اور ہماری کسی نہ کسی صورت میں رہنمائی فرماتے ہیں۔ خواہ وہ ہمارے سامنے نہ ہوں اور ہمیں محسوس و معلوم نہ ہو۔ یہ پردہ اس وقت تک رہے گا جب تک مصلحت الہی متقاضی ہو اور ایک وقت ایسا جلد آئے گا خواہ وہ جلد ہمیں کتنی ہی دور معلوم ہوتا ہو) کہ پردہ ہٹے گا اور امام علیہ السلام ظاہر ہوں گے۔ اور دنیا کو عدل و انصاف سے منور فرمائیں گے۔ اسی طرح جسے وہ اس کے پہلے ظلم و جور سے مملو ہو چکی ہوگی۔ اللهم عجل فرجنا و سقل فخر جبنا

سامرا - دُنیا میں ہر شہر کے نام کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے جس کو اصطلاحاً "وجہ تسمیہ" کہا جاتا ہے اس موضوع پر بالخصوصیت کوئی معتدبہ ذخیرہ بھی نہیں ہے البتہ اہل لغت اکثر الفاظ کی وجہ تسمیہ لکھ دیا کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں محم البلدان نے ایک حد تک کافی لکھا ہے۔ جب یہ بات مسلم ہے کہ وجہ تسمیہ شہروں کے لئے کچھ نہ کچھ ضرور ہوتی ہے تو موضوع بحث "سامرا" کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ تسمیہ ضرور ہونی چاہیئے۔

موجودہ "سامرا" جو ملک عراق کے دارالسلطنت بغداد کے شمالی حصہ میں تقریباً ۳۰ اکیلو میٹر کے فاصلہ پر ہنزدجلہ کے بائیں کنارے پر واقع ہے جس کی جدید بنیاد ۲۲۰ء مطابق ۸۳۶ء معتصم عباسی کے ہاتھوں پڑی اور معتصم کے بیٹے واثق باللہ نے جس میں کافی توسیع دیا اور جس کو متوکل عباسی نے اپنے دور حکومت میں بام ترقی پر پہنچا دیا۔ اس عکبہ سے مستثنیٰ نہیں ہے کہ اس نئی بھی اصولاً وجہ تسمیہ ہونی چاہیئے۔ اور ہے مگر فرق یہ ہے کہ علماء نے اس کی وجہ تسمیہ میں اپنی حسب عادت اختلاف کیا ہے۔

چنانچہ یاقوت حموی نے ابراہیم جنیدی سے روایت کی ہے کہ اس شہر کو جناب سام بن نوح نے آباد کیا اور وہی اس کے بانی ہیں اس لئے اس کو سامرا کہتے ہیں عصری تحقیقات نے سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ واقعی یہ شہر اقبل التاريخ

سے آباد تھا اور یہ تو بہت شہسور بات ہے کہ معتصم کے سامرا سے پہلے یہاں متعدد دیہات اور عیسائیوں کی عبادت گاہیں تھیں، انھیں معبد گاہوں میں سے ایک شہسور معبد کو معتصم نے خرید کر بیت المال بنوایا تھا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دولت ساسانیہ کے زمانہ میں یہاں ایک بیت عظیم الشان قلعہ بنام "سومیر" آباد کیا گیا تھا اسی قلعہ کی مناسبت کی وجہ سے اس شہر کو سامرا کہتے ہیں۔

یاقوت حموی نے اپنی معجم میں ایک اور روایت لکھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب یہ شہر باقاعدہ آباد ہو گیا تو اس کا نام "سورمن رای" رکھا گیا کچھ عرصت کے بعد اپنی تقلت کی وجہ سے "سورمن رای" کے نام سے مشہور ہوا اور جب یہ شہر بنے تو تہی کا شکار ہوا لازمی طور پر اس کو ویران ہونا چاہیئے تھا اور وہ ویران ہوا۔ ویرانی کے بعد لوگ اس کو "ساومن رای" کہنے لگے اور کثرت استعمال کی وجہ سے یہ لفظ "سامرا" باقی رہ گیا۔

یہ تین قول بہتیں نظر ہیں۔ ہر باقیم کہ فیصلہ کرنے میں زحمت نہیں ہے معمولی تجربے کے بعد ایک فیصلہ کر سکتے ہیں دوسرے اور تیسرے قول میں برہان کو چھوڑ کر ظن و تخمین سے زیادہ کام لیا گیا ہے البتہ پہلے قول کے لئے مؤیدات ملتے ہیں اس لئے اسی پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ پہلے زمانے کے لوگ دوروں کی محنت کی قدر کرتے تھے آج کی طرح نہیں ہے کہ ہندوستان میں جتنے اسلامی نام کے شہر تھے سب کو بند دیا گیا ہے۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو تحقیق کر لیجئے خود ہی معلوم ہو جائے گا خصوصاً وہ لوگ جو ریل گاڑی سے زیادہ سفر کرنے کے عادی ہیں ان کو معلوم ہے کہ اسی عرصہ میں اٹلیشنوں کے نام بدلے جا چکے ہیں۔ یہ آج ترقی کا دور ہے لیکن اس زمانے میں اس قسم کی خیانتیں نہیں ہوتی تھیں۔ خصوصاً مسلمان اس

اتہام سے بہ نسبت ہندوں کے ہمیں زیادہ پاک دامن ہیں۔ اس لیے اب اسے لکھنے کو لیتے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ یہ لٹیر وال کا "باغ" تھا جو کثرت استعمال سے بغداد ہو گیا ہے۔ عباسی حکومت کا کوئی معمولی شہر نہیں لیکن اس وقت کے مسلمان نے یہ نہیں سوچا کہ اس سے لٹیر وال کی یاد تازہ ہوتی رہے گی اس لئے نام بدل دو۔ یہ کام صرف آج کا ہندو ہی کر سکتا ہے۔ اسی طرح یہ شہر بھی چونکہ جناب سام بن لوزح کا بنا یا ہوا تھا اس لئے لفظ سام کو باقی رکھا گیا۔ اگرچہ یہ تازہ سمرامہ پہلے والا سام نہیں تھا، اس کی زمین، اس کا آسمان تک گویا بدل چکا تھا مگر پھر بھی اصل نام کو محفوظ رکھا گیا۔ مسعودی نے جو بات لکھی ہے وہ قرین قیاس ہے وہ لکھتا ہے اس کا اصلی نام "سارہ" تھا۔ یہاں بھی کثرت استعمال کی وجہ سے "ہ" گہ گیا سامر باقی رہا۔ یہ اور بات ہے کہ بغداد میں وسط سے گرا اور سامرا میں آج سے اس قسم کے معمولی تغیر ملحوظ ہوتے ہی نہیں ہیں کہ جن کے بارے میں فکر کی جائے۔

دوسرا مویداں خیال کا یہ بھی ہے کہ مورخین بنائے سامر کے سلسلے میں لکھتے ہیں اور یہ کافی مشہور بھی ہے کہ معتصم کے لشکر میں ترک زیادہ تھے ترکوں نے جب بادشاہ کے یہاں اثرات و رسوخ پوری طرح پیدا کر لئے تو بولوں سے ان کی ٹھن گئی ان میں بولوں کے خلاف شدت سے جذبہ نفرت پیدا ہو گیا۔ اب عرب بھی کسی ترک کو تنہا پاتے تو قتل کر ڈالتے تھے۔ طرفین کی اس باہمی کشیدگی سے معتصم کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ ہمیں عرب انقلاب نہ برپا کر دیں لہذا اس نے عاصمتہ ہی بدل دینے کی ترکیب سوچی اور کامیاب بھی ہوا جب اس مقصد کے لئے معتصم زمینوں کو دیکھتا ہوا ارض سامرا پر پہنچا اور دو ایک واقعات سے خود اس کو یقین ہو گیا کہ یہاں کی آب و ہوا بہت عمدہ ہے تو اگر جاگھر کے خام سے معلوم کیا کہ اس سرزمین کا نام کیا ہے تو اس نے سامرا بتایا۔ معتصم نے پوچھا کہ سامر کے کیا معنی ہیں تو اس نے بتایا کہ پُرانی کتابوں میں ملتا ہے

اس شہر کو جناب سام بن لوزح نے آباد کیا تھا۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ یہ لفظ معتصم کے زمانے سے ہمیں پہلے استعمال ہوتا تھا تو پھر "سور من رائی"، اور "سور من رائی اور" ساد من رائی" جیسی بے خود تاویلوں کی کہاں گنجائش ہے۔ یہ محض رجحان الغیب ہے۔ اور حموی نے اپنی کتاب میں بعض اس قسم کی کوتاہیوں کو روا رکھا ہے۔

چونکہ سامرا قدیم شہر ہے اس لئے آثار قدیمہ اس میں بہت طے ہیں جنکی مختصر فہرست اجمالاً یوں ہے۔ لوفتہ العسکرین علیہما السلام۔ امام دود سبحن الامام (فتیخانہ) جامع کبیر طوبیہ۔ جامع ابی دلف، منڈنتہ ابی دلف (طوبیہ آخری)، دار الخلیفہ۔ تل العلیج۔ قصر العاشق۔ قبۃ العلیدیہ، قصر بکرارہ، مسجد الامام المہدی۔ جس میں چند چیزیں شیعوں کے مذہبی مقدس مقامات میں شمار ہیں (سجود الہ پیام محل ۱۹۶۶ء ص ۶)

معذرت

آپ یقیناً واقف ہیں کہ ابھی حال میں ایک ایسا

آرڈیننس پاس ہوا ہے جسکی رو سے طبیعت اطہار، خلفائے راشدین، صحابہ کرام، ازواج مطہرات کی رت ان میں گستاخی کرنے والا کڑی سزا کا مستحق قرار پائے گا۔ اور اشارہ ٹاؤنٹا بھی گستاخی ناقابل معافی جرم تصور ہوگا۔ چنانچہ پیش نظر کتاب "عظمت حسین" سید العلماء کے چھٹیس

مقالات پر مشتمل ہے اور ہر مقالہ اپنی جگہ پر ہے مثال ہے۔ ان مقالات کو بھی آئینی طور پر دیکھا گیا ہے بعض مقالات میں سے کچھ سطور نکال دی گئیں اور بعض لفظ تبدیل کئے گئے مگر یہ بات بہر حال پیش نظر رکھی گئی کہ تسلسل عبارت قائم رہے پھر بھی ہم سید العلماء سید العلماء سرکار سید علی نقی مدظلہ العالی سے اپنی مذکورہ تجارت، کے سلسلے میں معذرت خواہ ہیں ہمیں یقین ہے کہ علامہ موصوف ہمارا تجویری، کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمیں متاثر نہ ہوگا ہم مذکورہ بالاتجارت، کے سلسلے میں سید العلماء کے لائق تہذیب بھی معذرت خواہ ہیں۔

پندرہویں صدی ہجری کے آغاز کے موقع پر
صدر مرکز کی تنظیم عزا کراچی
محمد وصی خاں خادم اعلیٰ

کی
مرتبہ لکھا

شہاب کا کتابوں کا مطالعہ آپ کیلئے ضروری ہو
کیونکہ آپ پندرہویں صدی ہجری کا آغاز تہمتاً کر لیتے تھے کہ وہ سچے ہیں

۱) کتاب "اولیائے کرام اور شعرائے عظام آستانہ مولا علی پر"۔
یہ کتاب مولائے کائنات حضرت علی علیہ السلام کی منقبت کا ایسا بے مثال
مجموعہ ہے جو اس سے پہلے آپ کی نظروں سے نہ گزرا ہوگا اس میں تمام قابل ذکر شعراء اور
مشہور صاحب کرامات اولیاء اور صوفیاء حضرات کے کلام حضرت علی کی شان میں موجود ہے
۲) وصی خاں کی مقبول عام کتاب علیؑ حصہ دوم کا مطالعہ آپ کے لئے بہت ضروری
ہے اس کے مطالعہ سے آپ کے دل میں محبت اعلیٰ کا سمندر ٹھاٹھیں مارے گا۔

۳) "شیعہ حافظ قرآن"، کتاب جواب ہے اس کا شیعہ حافظ قرآن ہیں
۴) "بین تسمکین" نرینب حصہ اول و دوم تاریخ و ادب مجلسوں کے لئے سوز،
سلام۔ رہبایات اور مرثیوں پر مشتمل شاندار بیاض جو آپ کی پسند مطابقت ہے۔
۵) "علامہ اقبال آستانہ بیچتیں پاک میں"، علامہ اقبال کے ان اشعار کا مجموعہ ہے جو بیچتیں
بیچتیں پاک کی شان میں فرما اور حقیقت یہی وہ اشعار ہیں جو ان کے اعتقادی جذبات
کے آئینہ دار بھی کہے جاسکتے ہیں اس علاوہ شیعہ ماٹرائز کی بھی پیش خدمت ہے

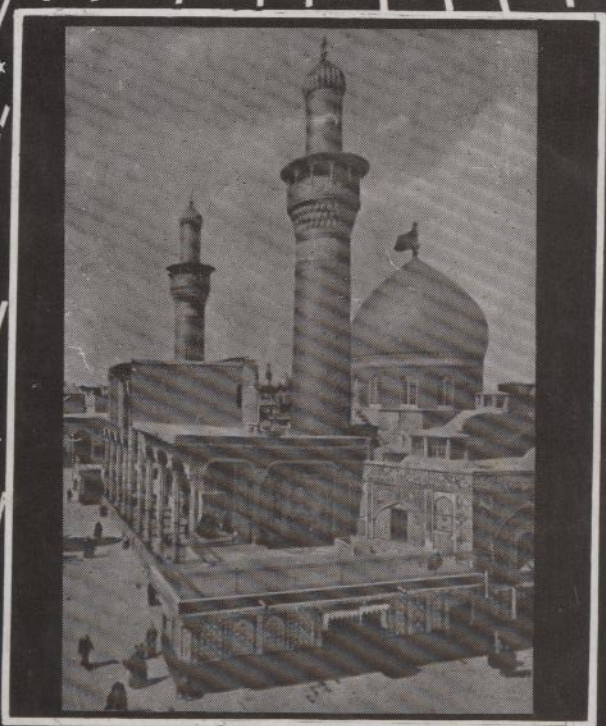
حَقِيقَةُ بِنَائِ الْأُمَّةِ
حَسْبُكَ حَسْبُكَ

عَلَيْهِ السَّلَامُ

حَسْبُكَ حَسْبُكَ

حَسْبُكَ
مَنْ فِي الْأَمِينِ
الْحَسْبُكَ

سَيِّدُ الشُّهَدَاءِ



مُرْتَبَةٌ: مُحَمَّدٌ وَصِيُّ خَانَ